

جس سال چمبا کیمبرج پہنچی طلعت اور نرملا وہاں سے جا چکی تھیں۔ (میں ہمیشہ مڈ ہرسٹ جانا چاہتی ہوں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ سرل اب کے ویک انڈ پر ضرور مڈ ہرسٹ چلیں گے، بے چاری نرملا کو دیکھئے) اب وہ اونچے طبقے کی برطانوی لڑکیوں کے لہجے میں گفتگو کرتی۔ کیمبرج کی بددماغی بھی اس نے پوری طرح اوڑھ لی۔ کچھ طور طریقے اس نے ادیبوں کے گروہ میں رہ کر اندن میں سیکھ لیے تھے۔ اس کے علاوہ رکھ رکھاؤ، سلیقہ، نفاست، بردباری، ایک خاص سطح کا دھیمادھیماء مزاج۔ رات کو آنینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ دفعتاً سوچی: چمپا احمد کہاں رہ گئی! چمپا احمد جو ایک دیو مالا، ایک حکایت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ بسنت کالج بنارس والی لڑکی کہاں گئی، یا وہ لڑکی

جس کو عامر رضا نے گلنشاں کے سائیڈ روم میں ترکاری بناتے دیکھا تھا۔ عامر رضا کا خیال اب اسے بہت مضحکہ خیز لگتا۔ وہ فلم اسٹاروں کے حلیے والا ڈپلو میٹ جس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ شام کو کون سا سوٹ پہن کر اور کون سی لڑکی کو لے کر تھیٹر دیکھنے جائے۔

پھر ایک روز کیمبرج میں فلسفی لڑکی روشن سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ

انہری کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے ایک پلپٹ پر بیٹھی مائیکل سے باتیں کر رہی تھی جو سائیکل پر سوار ایک پاؤ پلپٹ سے لگائے یہودیوں کی جلا وطنی کی نفسیات پر روشنی ڈالنے میں مصروف تھا۔ دفعتاً اس نے مزہ لگایا۔ \_\_\_\_\_ روش \_\_\_\_\_ مگر روشن سوچ میں ڈوبی سامنے سے نکل گئی۔ چمپا احمد نے کندھے اچکائے۔

ہاں ڈون اسپنوزا۔۔ مائیکل نے کہا۔ دوسرے روز روشن سیاہ فریم کی پڑھنے والی عینک لگائے بڑے غور و خوض میں ڈوب کر سگریٹ پیتی یکم کے کنارے بیٹھی نظر آئی۔ چمپا کو وہ بہت اچھی لگی۔ اب چمپا اپنی دانست میں اس اسٹیج پر پہنچ چکی تھی جب انسان خود غیر متعلق ہو کر دوسروں کا مطالعہ کرتا ہے اور فراخ دلی سے دوسروں کو معاف کرتا رہتا ہے۔

روشن نے چمپا کو بڑے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا۔ کسی لڑکی نے اسے بتایا کہ یہ چمپا احمد عامر کی اولڈ فیم ہے۔ چمپا اگر یہ لفظ سن لیتی تو سوچ کر ہی اسے بڑی دہشت ہوتی۔ وہ بے حد تو بہ تلا کرتی اور کہنے والے کو صلواتیں سناتی کیونکہ اس قدر جدید بن جانے کے باوجود جموڑا سا کھر چنے کے بعد وہ وہی خالص یو۔ پی کی باعزت ٹڈل کلاس لڑکی تھی جس کے تصورات اس قسم کی باتوں کے سلسلے میں بڑے قدامت پسندانہ ہوتے ہیں اور بہر حال وہ خود کو کسی کا اولڈ فیم کہا انا پسند نہ کر سکتی تھی۔

اس نے اس کے باوجود ایک گھنٹے تک روشن اسپنوزا کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔ روشن حکومت پاکستان کے کسی بہت اعلیٰ افسر کی لڑکی تھی اور اسے طرح طرح

کے وظائف ملے تھے اور یہاں بھی بہت قابل اور سنجیدہ مشہور تھی۔ قصہ مختصر وہ ان ہونہار طلباء میں سے تھی جو بیرونی ممالک میں وطن عزیز کے نام میں چار چاند لگاتے ہیں اور پبلٹی کے رسالوں میں اکثر جن کی تصویریں چھپتی رہتی ہیں۔

ایک چھٹی کے روز وہ دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ ایک دیہاتی چاء خانے کے باغ میں بیٹھی تھی۔ ایک اطالوی طالب علم انجیو سیب کے نیچے گٹار بجا رہا تھا۔ قریب کی آرام کرسی پر مائیکل نیم وراز بڑی اواسی سیب کی کلیاں سونگھنے میں مصروف تھا۔ اس روز اس نے اناؤنس کیا تھا کہ وہ ترک وطن کر کے اسرائیل جا رہا ہے۔ وہ کئی گھنٹے سے وطنیت کے مسئلے پر بحث کرتے کرتے تھک کر اب خاموش بیٹھے چاء کا انتظار کر رہے تھے۔ میں یہ پیارا ہرا بھرا خوبصورت انگلستان چھوڑ دوں گا اور اسرائیل کے ریگزاروں میں پتھر کوٹ کر سڑکیں بناؤں گا۔ اس نے کہا۔ سرل اسے دیکھا کیا۔ ہاں، مائیکل، تم ضرور ایسا کرو گے۔ مجھے معلوم ہے۔ اس نے کہا۔ یونیورسٹی کے کئی پروفیسر، سائنس دان، موسیقار اس وقت اسرائیل میں پتھر کوٹ کر سڑکیں بنا رہے تھے۔

”وژن میں بڑی طاقت ہے۔“ ڈینس نے کہا۔ ”ذرا شاعروں کی شاعری دیکھو۔“

”طاقت تباہ کن ہوتی ہے۔“ سرل نے منہ لٹکا کر کہا۔ سامنے چاء خانے کے پھاٹک پر ایک کارآن کرر کی۔ گوتم نیلمبر، سال اور طلعت اور چند اور لوگ اتر کر چاء خانے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے اور چرڈ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہیں دیکھا۔ گوتم نیلمبر بھی بڑی تباہ کن طاقت ہے کیونکہ اس کا وژن سب سے زبردست

ہے۔ نہرو کا ہندوستان۔ آنجلو نے کہا۔

”جدید تصورات ہیں شاوہنزم خطرناک ترین تصور ہے۔“ سرل نے مائیکل سے کہا۔ ”تمہاری جیہہونیت، پاکستانیوں کا اسام، ہندوستانیوں کی گیتا عہد کی تجدید“

”گوتم شاؤنسٹ نہیں ہے۔“ سر یکھا بولی۔ ”وہ صرف امن کا خواباں ہے جس میں ہندوستان کی اقتصادی ترقی ہو سکے۔ ہم مذہب ہو سکے۔ ہم مذہب کی انہز پر نہیں سوچتے۔ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اور وہ لوگ جن کے خیالات کی اہمیت ہے، پہلے پانچ سالہ منصوبے کی کامیابی کے درپے ہیں۔ ہند کا کسان اس وقت ہمارا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ زمینداری کے خاتمے کے بعد سے، آ کر دیکھو، اس کی حالات کتنی سدھرتی جا رہی ہے۔ ہمارا \_\_\_\_\_“

”تم تو انڈیا ہاؤس کے کسی پمفلٹ کی زبان میں گفتگو کر رہی ہو۔“ سرل نے مسکرا کر اس کی بات کاٹی۔

”اقتصادی ترقی سے مذہب کا کیا تعلق یہ بات پاکستانیوں کی سمجھ میں نہیں آتی“  
 ”گلشن نے کہا۔

”امریکہ اسلام کا سب سے بڑا خیر خواہ ہے۔ آج کل ترکی میں قرآن شریف کے نسخے چھاپ چھاپ کر تقسیم کر رہا ہے۔ جس طرح نیپولین اور مسولینی اسلام کے بڑے زبردست خیر خواہ تھے۔“ ڈینس نے کہا۔

”پاکستان کا اسلام \_\_\_\_\_“ مائیکل نے کہا۔

”تم تو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہو۔“ روشن نے مائیکل سے کہا۔



”نفرت کی نفسیات \_\_\_\_\_“ ڈینس نے کہنا شروع کیا، ”آج کی دنیا نفرت کے تانے بانے پر زندہ ہے۔ جیس نے بالکل غلط کہا تھا کہ دنیا محبت پر قائم ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ ہم سب درندوں کی طرح ایک دوسرے کو کھا رہے ہیں۔“

”میں درندہ ہوں؟“ مائیکل نے اداسی سے پوچھا۔ ”میں صرف حیفہ جا کر سرٹکیں کوٹنی چاہتا ہوں۔“

”تم سب کو کوا کرز سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ گاندھی کا مطالعہ کرو“ ڈینس نے کہا۔

”ذرا گوتم کو بلا کر پوچھو جو ہر وقت پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے۔“ روشن نے جذبے سے کہا۔

”اور پاکستان اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے۔“ سرٹیکھانے جواب دیا۔

”اگر صرف ایک روز کے لیے ساری دنیا میں پروپیگنڈے کی مشینری رک جائے تو کتنا سکون ملے۔“ چمپا نے آہستہ سے کہا۔

”یہ کس طرح ممکن ہے۔ ہم سب کو تو صبح شام گوبلو کی تصویر پر پھول چڑھانے چاہئیں۔ تم گاندھی کی بات کرتے ہو، ہمارے عہد کا سب سے بڑا پیغمبر گوبلو تھا۔ ڈاکٹر گوبلو زندہ باد“ گلشن نے کہا۔

”دراؤصل“ ڈینس نے بات شروع کیا، ”ہم سب غیر شعوری طور پر فاشٹ ہیں۔ ہم سب تباہی اور موت کے خواہاں ہیں۔ میں رومان پرستوں کی موت کی خواہش کے معنی خوب سمجھتا ہوں۔“

”میں تو نہیں چاہتی کہ یہ خوبصورت اور چمڑا تباہ کر دیا جائے۔“ چمپا نے

وہشت کے ساتھ کہا۔

”ہم سب چھپے ہوئے فاشٹ ہیں۔ ہم سب کے ہاتھ میں غیر مرئی مشینیں گنیں ہیں جن کا رخ ہم نے دوسروں کی سمت کر رکھا ہے۔ خیالات کی مشین گنیں۔ صرف بوڑھی عورتیں امن چاہتی ہیں لیکن دنیا کو بوڑھی عورتوں کی ضرورت نہیں۔“ اس نے چمپا کو دیکھا۔ وہ اسے ایک بوڑھی رنجیدہ ماں کی طرح نظر آئی۔

”مجھے ہمیشہ تباہ کیا گیا۔“ مائیکل نے سر اٹھا کر کہا۔ ”لیکن میں نے اپنے عزیزوں کی لاشوں کے انبار میں بیٹھ کر تمہارے لیے موسیقی کمپوز کی اور خیالات کی قذیلین روشن کیں۔ میں درندہ ہوں؟ میں صرف \_\_\_\_\_“

”سر، کس کو ٹنی چاہتے ہو \_\_\_\_\_“ ڈینس نے بات کاٹی۔ ”ہم تم کو اس کی اجازت دیتے ہیں مائیکل۔ تم اپنے وژن کے راستے پر چلو۔“

”دوسروں کے وژن میں نخل ہو کر اس کو بر باد کرنے کی خواہش سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس احکام میں اس گناہ کا کہیں ذکر نہ تھا۔“ سرل نے کہا۔ ”میں تم کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔“

”نجلو نے گناہ ایک طرف رکھ دیا۔ مائیکل تم یہودی ہو لیکن تم انگریزی بھی ہو۔ تم نے اپنے بمبار طیارے پر آکر میرے خوبصورت شہروں کو بر باد کیا تھا لیکن میں تم کو معاف کرتا ہوں۔“

”مائیکل“ سرل نے کہا، ”تم یہودی ہو لیکن تم انگریز بھی ہو لہذا خود کو ہم سے برتر سمجھتے رہے۔ اب تم بڑے ذوق و شوق سے ایشیائی بنے جا رہے ہو کیونکہ تمہارا خیال ہے کہ تمہاری جڑیں فلسطین میں ہیں۔ حالانکہ تمہاری جڑیں دراصل ہیمپسٹیڈ

میں ہیں۔ لیکن ہم تم کو معاف کرتے ہیں۔ روشن! مائیکل ایشیا کی بننے جا رہا ہے  
اسے خوش آمدید کہو۔“

”میں اسے خوش آمدید نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں مسلمان ہوں لہذا مجھے اسے  
قابل نفرت سمجھنا چاہیے۔ یہ سب زبردست گھپلا ہے۔“ اس نے میز پر پائاسر لگا دیا  
اور پیالیوں کے نقش و نگار کو دیکھنے لگی۔

”تمہیں سر یکھا سے نفرت کرنا چاہیے کیونکہ یہ ہندو ہے۔“  
”ہاں۔“

”لہذا روشن مجھ سے ہاتھ ملاؤ۔“ مائیکل نے سنجیدگی سے ہاتھ بڑھایا۔  
”ہندوؤں نے تم کو ہندوستان سے نکالا۔“

”میں نے نہیں نکالا یہ خود نکلی۔“ سر یکھا نے احتجاج کیا۔

مائیکل سنی ان سنی کر کے کہتا رہا: ”تمہاری طرح ہم نے بھی ایک نیشنل ہوم لینڈ  
بنالیا تو ہم کیوں قابل گردن زنی ہو گئے؟“

”تم \_\_\_\_\_ تم نے عربوں کو ان کے وطن سے نکالا جہاں وہ سینکڑوں  
سال سے رہتے آئے تھے۔“

”تم نے بھی ہندوؤں کو ان کے وطن سے نکالا جہاں وہ ہزاروں سال سے  
رہتے آئے تھے۔“

پھر بڑی غمگین خاموشی چھا گئی۔ درختوں کے جھنڈ میں تیتریاں اڑ رہی تھیں۔  
سامنے ندی پر سے ایک کشتی گزر گئی۔ انجیلو نے پھر گٹار کا بجانا شروع کر دیا۔

گوتم بیلبر اور اس کے ساتھی کار سے اتر کر چاء خانے کے اندر چلے گئے۔  
 لاؤنج میں بیٹھ کر انہوں نے لسز کی ورق گردانی کی اور چاء منگوائی اور گوتم نے چند  
 خط و پیس کو پوسٹ کرنے کے لیے دیے۔ وہ لندن سے آرہے تھے اور مڈ ہرسٹ  
 جارہے تھے۔ ان کے ساتھ بل تھا اور خوبصورت برنارڈ جو اسکول آف اکنامکس  
 میں استاد تھا اور شاننا، طلعت اور نرگیش۔ وہ لوگ بھی کوئی آفاقی مسئلہ حل کرنے  
 میں مصروف تھے۔ مال نے درتچے سے باہر جھانکا جہاں سے باغ کا منظر دکھائی  
 دے رہا تھا۔ ڈھان پرندی بہہ رہی تھی۔ بید مجنوں اور پریم روز کے پتوں میں سے  
 ایک سفید لانچ نظر آرہا تھا جس پر اس کا نام ”کلا راجین“ لکھا تھا۔ امن امن۔  
 کمال نے دہرایا۔ گوتم نے اسے دیکھا۔

”باہر چمپا باجی اور سرل وغیرہ بیٹھے ہیں۔“ طلعت نے درتچے میں آ کر کہا۔  
 نرملا کے لیے میں انگلس ولسن کی کتاب ولسن کی کتاب اانا بھول گیا“ بل نے  
 کہا۔ شاننا پیالیوں میں چاء انڈیل رہی تھی۔ اس نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی اور  
 بے حد حسین لگ رہی تھی۔ وہ لوگ نرملا کو دیکھنے جارہے تھے اسے اب سینی ٹوریم  
 میں تیسرا سال تھا۔ اس کے ایک بھتیجہ بھڑے کا آپریشن ہو چکا تھا اور اس کے معالج  
 سرورینڈ گروے کا خیال تھا کہ ممکن ہے اب وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے ہفتے  
 کے روز اس کے دوست لندن سے اسے دیکھنے کے لیے آتے گوتم بھی برابر جب  
 اسے فرصت ملتی، کمال اور طلعت کے ساتھ اسے دیکھنے کے لیے جاتا اور پابندی

سے اسے رسالے اور کتابیں بھیجتا۔ اس کے آپریشن کے موقع پر ہری شکر بھی واشنگٹن سے وہاں پہنچ گیا تھا۔ گوتم بڑی لگن سے نرملا کا خیال کرتا اکثر جب سال ہفتے کے روز منڈ ہر سٹ نہ پہنچ سکتا تو گوتم کو ناروے دیتا۔ گوتم سب کام چھوڑ کر وہاں چلا جاتا۔ وہ اور نرملا چپا کا ذکر کبھی نہ کرتے۔ زندگی اس قدر گنگناک، اتنی مصروف، اتنی بے رنج اور غیر منطقی تھی کہ انسان سارے شینا ساؤں اور جاننے والوں کے ساتھ نباہ نہ کر سکتا تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا۔

گوتم اب بہت مشہور ہو چکا تھا۔ اس نے ہندوستان کی فارن پالیسی، اس کے اقتصادی مسائل اور ملکی سیاست پر دو کتابیں لکھی تھیں جن کی دھوم مچ گئی تھی۔ وہ اب بہت بڑا سے لے بریٹی تھا۔ کامیاب اور ہر د عزیز۔ متوازن اور سلجھے ہوئے خیالات کا مالک۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لوگ جذباتی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ ”۴۷ء میں ہم نے کیا کیا۔ ہم بیمار لوگ تھے۔ اب ہم اپنے ذہنی عارضوں کا علاج کرنا چاہ رہے ہیں۔ ہم کو اتنی مہلت دے دو کہ ہم تندرست ہو جائیں۔ پھر ہم سے مذہب اور روحانیت اور گینتا کی گفتگو کرنا۔ مجھے بھی گینتا بہت پسند ہے لیکن مجھے فی الحال پانچ سالہ پلان زیادہ پسند ہے۔ اس کی رپورٹوں کی تلاوت سے مجھے نسبتاً زیادہ سکون حاصل ہوتا ہے۔“ وہ کہتا

ہے مارکیٹ کے رائٹرز کلب میں بیٹھے ہوئے اکثر کوئی برطانوی جرنلسٹ اس سے سوال کرتا! ”گوتم تمہاری کوئی ذاتی زندگی بھی ہے یا نہیں۔ تم تو بالکل کرشنا مین بنے جا رہے ہو۔“

”مجھے خطرہ ہے کہ گوتم ایڈر بن جائے گا۔“ سرل کہتا۔

”گوتم ایڈرنٹس بنے گا بہت بڑا اسٹیٹس مین بنے گا، وہ ایک بے حد صاحب نظر انسان ہے۔“ مال فخر سے کہتا۔

۱۹۴۷ء نے فینوں کی دنیا ہلا کر رکھ دی تھی۔ گوتم اور مال بدلے ہوئے عالمگیر حالات بین الاقوامی سیاسی جرائم اور ریا کاری اور بے ایمانی اور ضمیر فروشی کے اس عظیم الشان دور جدید سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔ گوتم کے سیکولر خیالات کی وجہ سے ہندو شاؤنسٹ اور مہاسبجانی نظریات کے لوگ اس سے خفا تھے۔ مال کی قوم پرستی اور صاف گوئی نے اسے کہیں کہ نہ رکھا تھا۔ اس کے بیشتر مسلمان دوست اور رشتے دار پاکستان جا چکے تھے مگر وہ مصر تھا کہ انگلستان سے ہندوستان ہی واپس جائے گا۔ لندن اور کیمبرج کے پاکستانی طلباء اسے انڈیا ہاؤس کے گوتم نیلمبر کا اسٹونج کہتے۔ یہ سب سن کر اس کے دل پر چھریاں چل کر رہ جاتیں۔

نرملہ کی بیماری نے جو اسے طلعت کی طرح عزیز بھی زندگی کے متعلق مال کا سارا رویہ بدل دیا تھا۔ اسے دفعتاً احساس ہوا تھا کہ زندگی اور موت میں بال سے زیادہ باریک حد فاضل قائم ہے۔ زندگی ایسی شے نہیں کہ اس سے مذاق کیا جائے۔ انسان بہت عظیم ہے۔ اس کا دل کائنات کی سب سے قابل قدر چیز ہے۔ پھر اسے خیال آتا کہ عیسائی یسوع مسیح کی تصاویر میں ان کے دل کو کیوں اس قدر نمایاں کرتے ہیں، دل کی تصویریں کیوں بناتے ہیں جس میں کانٹے چھپنے ہیں۔ ہاں، دوسروں کا دل دکھانا کیوں سب سے بڑا گناہ ہے!

نرملہ کی بیماری نے گوتم کی ساری کائنات میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ نجی جہنم جو انسان کی روح ہے، اس میں کیسی کیسی دنیا میں آباد تھیں،

ان میں کون لوگ بستے ہیں؟ آفاق کے اس کے اس کو نے میں، جہاں پر ”گوتم  
 نیلمبر“ کو بورڈ لگا ہے، کیسی کیسی آندھیاں چلتی ہیں، اس گھر میں (جس طرح کا گھر  
 ہر نو جوان کے دل میں ہوتا ہے) کون لڑکی بیٹھی ہے۔ ہر نو جوان جو صرف ایک بار  
 اس کے گھر کے دروازے واکر کے صرف ایک لڑکی کی مانگ میں سیندھور لگتا ہے۔  
 مگر اس نو جوان کا اسرار کون جانے جس کا نام گوتم نیلمبر ہے۔ اس کے دل میں  
 دراصل کون ہے، شاید اس کو بھی معلوم نہیں، یا شاید معلوم ہو۔ دوسرے جاننے والے  
 کون!

اور اس بال سے زیادہ باریک پل پر، جسے زندگی کہتے ہیں، نرمل کھڑی تھی۔  
 زندگی سے مذاق نہیں کیا جاسکتا۔ دل جو بہت عظیم شے ہے اس سے مذاق نہیں کیا  
 جاسکتا۔

گوئی کا دل جو ساری کائنات کا مرکز ہے۔

”چمپا باجی باغ میں بیٹھی ہیں۔“ طلعت نے درپے میں جا کر دہرایا۔  
 ”چلو ان سے ملتے چلیں۔ غر سے ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔“  
 گوتم نے گھڑی دیکھی۔ ”نہیں۔ اب سیدھے مڈ ہرسٹ چلو۔ ورنہ ہمیں  
 واپسی پر دیر ہو جائے گی۔“

وہ سب چاء خانے کی لاونج سے نکل کر کاریں جا بیٹھے اور مڈ ہرسٹ کی طرف  
 روانہ ہو گئے۔

چمپا نے دیکھا کہ کارزن سے چاء خانے کے پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ آنجلو درخت کے نیچے بیٹھا گٹار بجایا کیا۔ روشن، مائیکل، ڈینس، سریکھا اور گلشن میز سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے ندی کی طرف جا چکے تھے۔ چمپا نے آرام کرسی پر سے جھک کر گھاس کی ایک پتی توڑی۔

”کیا سوچ رہی ہو۔“ سرل نے پوچھا۔ وہ دھوپ سے بچنے کے لیے ایک رسالہ چہرے پر رکھے مقابل کی آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔  
”کچھ بھی تو نہیں۔“

”وہ تمہارے دوست لوگ جا رہے تھے، کاریں۔“  
”ہاں۔“

”میں نے دیکھا ہے کہ تم کراؤڈ سے خود کو مماثل بھی نہیں کرنا چاہتیں مگر کراؤڈ کی چاہت بھی بہت ہے۔ ایک عجیب قسم کی وفاداری۔ اس لیے کہ تمہارا اور ان کا ماضی مشترک رہا ہے۔ تم عجب مجموعہ تضاد \_\_\_\_\_“ سرل نے رنجیدہ آواز میں کہا۔ ”میں تم کو دیکھتا ہوں تو بہت ادا اس ہوتا ہوں۔“  
”اطالویوں کی طرح باتیں مت کرو۔“ چمپا نے کہا۔

”یہ بھی تمہارے ساتھ ایک اور مصیبت ہے۔ ذاتی سطح تک پہنچتے ہی تم زور سے دروازہ بند کر دیتی ہو۔ \_\_\_\_\_ بزدل۔ تمہیں اپنی بزدلی اور کمزوریوں کا علم ہے؟“ وہ کرسی اتر کر درخت کے تنے سے ٹک کر بیٹھ گیا۔ ”اکثر جھوٹ بولتی ہو۔ حاسد ہو۔ دوسروں کی مسرت کو رشک سے دیکھتی ہو۔ دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش میں ہر وقت مصروف رہتی ہو۔ دوسروں کو خود سے بہتر نہیں



دیکھنا چاہتیں۔‘ وہ کہتا رہا۔ ”مثال کے طور پر \_\_\_\_\_ تمہیں روشن پسند نہیں کیونکہ وہ یونیورسٹی میں تم سے زیادہ مشہور اور ہر معرزی ہے۔ تم لکھنؤ میں مشہور رہی ہوگی مگر وہ ۱۹۴۲ء تھا اور تم بھولتی ہو کہ اس بات کو دس سال گزر چکے ہیں اور روشن تم سے دس سال چھوٹی ہے چمپا۔ وقت کا سب سے بڑا کمینہ پن یہ ہے کہ ہم ابھی اس چیز کے لیے تیار نہیں ہو پاتے کہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا زمانہ نکل چکا۔ چمپا! خدا کرے تم شنیدا مکر جی کبھی نہ بنو۔“

”شنیدا مکر جی؟“

”ہاں۔ میں تم کو ایک انسٹی ٹیوشن میں تبدیل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ چمپا احمد جو آج سے دس سال بعد چیلسی کے ایک فلیٹ میں آرٹسٹوں اور ڈھن پرستوں کی سرپرست اور گرو ہوگی۔ خداوند \_\_\_\_\_ یہ بڑا وہشت ناک خیال ہے۔“

”میں اس قدر قابل رحم ہوں؟“

”نہیں۔ ہم سب قابل رحم ہیں۔ تم ان ساری باتوں کے باوجود بہت پیاری ہو۔ تم نیک دل ہو۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ اور شاید تم میں دوسروں کو معاف کرنے کی اہلیت بھی ہے۔ ہے نا؟“

”ہاں شاید“

وہ خاموش ہو گیا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر چاء خانے کے لاؤنج میں آگئے۔ روشن اور مائیکل اور ان کے ساتھ دور لانچ پر بیٹھے نظر آرہے تھے۔ لاؤنج کے ایک صوفے پر چند روی کاغذ اور اخبار رکھے ہوئے تھے جو گوتم نیلمبر وہاں بھول گیا تھا۔

”تم دوستی کر سکتی ہو۔“ سرل کہتا رہا۔ ”ورنہ باقی تم سارے میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھری ہوئی ہو۔ اس کاغذ کے ٹکڑے کی طرح۔“ اس نے بے دھیانی سے خالی لفافہ اٹھایا جس پر گوتم کا پتا لکھا ہوا تھا۔ اس نے لفافے کو توڑ موڑ کر آتشدان میں پھینک دیا۔

”سرل، میں اتنی تیز روشنی میں ہوں، جتنی تم نیا بھی ظاہر کی؟“  
”ہم سب اسی تیز روشنی میں موجود ہیں۔“ اس نے صوفے پر سے ایک رسالہ اٹھایا۔ اس پر بھی گوتم کا نام چھپا تھا۔

”تم اسے بہت زیادہ چاہتی ہونا؟“ اس نے رسالہ چپا کی طرح پھینک دیا۔  
ایک وقت تھا خود گوتم نے اس سے عامر رضا کے متعلق اسی قسم کے امتحانی سوالات کیے تھے۔

”لیکن وہ تم سے ملتا کیوں نہیں؟“ اس نے دوبارہ کہا۔

”پتا نہیں۔ مجھ اس سے ملنے کی فرصت کہاں ہے۔“

”تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔“

وہ ایک اونچی چوٹی پر کھڑی تھی اور ساری دنیا اس کے رتی رتی احوال سے واقف تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اس طرح کیوں بکھرنے دیا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ سارا زمانہ نکل چکا۔ سارا زمانہ۔

باہر بارش میں چند اور موٹریں آ کر رکیں۔ چند مشہور شیکسپیئرین اداکار لاؤنج میں داغ ہوئے وہ اپنی تمثیل لے کر کسی تہوار کے لیے برابر کے گاؤں میں آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایکٹر سرل کو جانتا تھا۔ وہ سب آتشدان کے قریب

جانیٹھے۔ دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

۷۳

مڈ ہرسٹ کا عظیم الشان اور پرفضا سینی ٹوریم سینکڑوں ایکٹر پر پھیلے ہوئے معطر جنگلوں اور باغوں میں گھرا، سکون سے بارش میں بھیگ رہا تھا۔ اس کے ہشاش اور خوبصورت ماحول میں ہر طرف پھول ہی پھول تھے اور مسکراتے ہوئے ہمدرد چہرے۔ شفاف، طویل گیلریاں۔ حسین ڈرائنگ رو۔ جھلملاتا ہوا اوڈی ٹوریم جہاں مشہور تھیٹر کمپنیاں اکرمریضوں کے لیے نمٹیلیں اسٹیج کرتیں۔ اس دل آویز جنت میں لوگ آرام سے ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے اپنے خاتمے کا انتظار کرتے یا کسی دوسری طرح کے خاتمے تک کے وقفے کے لیے پھر باہر کی دنیا میں واپس چلے جاتے۔ عمارات کے ایک ونگ میں سرے پر نرملا کا کمرہ تھا جس کے تین طرف باغ تھا۔ یہ میرا کمرہ آئی ٹی نشاط محل ہوٹل کے کسی کمرے کا ایما ہے۔ نرملا نے طلعت سے کہا تھا۔ یہ لوگ ہر شے ماضی سے منسلک کرتی جاتی تھیں۔ (سو ہیئر ریلینڈ مینی تال تھا۔ ایک ڈسٹرکٹ دہرہ دون کی طرح تھی لندن میں بمبئی کی جھلک تھی)۔ ماضی محفوظ تھا کیونکہ اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہ تھی، کسی حادثے کا امکان نہ تھا۔

نرملا تکیوں کے سہارے نیم دراز خوشی سے سب کچھ دیکھتی رہی۔ ”اب مجھے لندن کی تازہ خبریں سناؤ۔“

”اچھا۔“ طلعت اچک کر درپے میں بیٹھ گئی۔ اس نے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔

شانتا، کمال اور بل کے ساتھ، نرملہ کے پلنگ کے دوسری طرف بیٹھی تھی۔ گوتم پھولوں کے بڑے واز کے نزدیک کونے میں بیٹھا برنارڈ سے باتیں کر رہا تھا۔

”گوتم جی،“ نرملہ نے اسے مخاطب کیا، ”اب ہندی سماچار ہو جائیں۔“ وہ اٹھ کر اس کے سامنے درپے میں جا بیٹھا۔

”مجلس میلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔“ نرملہ نے طلعت سے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”بڑے زوروں میں۔“ طلعت نے کہا۔ پھر ایک لمحے کے لیے وہ سب خاموش ہو گئے۔ ہر سال نرملہ مجلس کے سالانہ میلے کی تیاریوں میں پیش پیش رہا کرتی تھی میلے میں اس کی غیر موجودگی کا یہ تیسرا سال تھا۔

”بس صرف اس اگست میں تم ہمارے ساتھ نہیں ہو۔“ کمال نے کہا، ”مگے سال انشاء اللہ تم پھر میلے کی لیڈری کر رہی ہوگی۔“

”انشاء اللہ“ نرملہ نے مسکرا کر کہا۔

”کل بھیا صاحب سے ملے تھے۔“ گوتم بولا۔ ”کہتے تھے کہ شاید آج تمہارے پاس آئیں۔“

”وہ تو مجھے کئی بار دیکھنے کے لیے آچکے ہیں بے چارے۔“ نرملہ نے کہا۔ ”ان کی لڑکیوں کی صورت حال کیسی چل رہی ہے۔“

”ٹھیک چل رہی ہے۔ روشن آرا \_\_\_\_\_“ طلعت نے کہا۔

”پھر اسکیٹل شروع ہوئے۔“ کمال نے ڈانٹا۔

”نہیں۔ میں تو اس کے بعد ابھی پروفیسر ٹوکن لی کا ذکر کرنے والی تھی۔“  
”طلعت نے ذرا سہم کر کہا۔“

”تم نے ان کو میلے میں بلایا ہے۔“ گوتم نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”یہ اچھا ریکٹ ہے۔ برطانیہ کے ان سب جغادری اٹھکچو لڑکواچی مخلوں میں  
بلا بیا کر وہی بڑے کھلاتی ہوا اور اس طرح ہندوستان کے لیے ان کی موافقت حاصل  
کرتی ہو۔ وہی بڑا ڈپلو میسی۔“ بل نے ہنس کر کہا۔

”وہی بڑا اور بھرت ٹاٹیم۔ انہی حرکتوں سے پاکستان ہاؤس والے جلتے  
ہیں۔“ گوتم نے کہا۔

”اب رام گوپال کے مقابلے میں انہوں نے بلبل چوہدری کو کھڑا کیا  
ہے۔“ برمار ڈبولا۔

”تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے کہ بہت بڑا اکھاڑہ ہے اور رام گوپال اور  
بلبل اس میں کشتی لڑنے کے لیے اتر رہے ہیں۔“ طلعت نے اداسی سے کہا۔  
”تمہاری یہ تشبیہ۔“ گوتم نے کہا ”بالکل صحیح ہے۔ سب سے بڑی ٹریجڈی وہ  
ہے جب فن کاروں کو غیر فنی اغراض کے لیے استعمال کیا جائے۔“

”ہم نے میلے میں اسپنڈر کو بھی بلایا ہے۔“ طلعت نے منہ لٹکا کر کہا۔

”یہ جگہ ہوئے اور خریدے ہوئے اٹھکچو رکا دور ہے۔“ گوتم نے کہا۔ ”اس  
عہد میں آرٹسٹ کی بڑی بھاری قیمت مقرر ہو چکی ہے۔ کون کہتا ہے کہ دنیا

آرٹسٹ کی قدر نہیں۔ دیکھو ایشیا کے فن کار لوگ کسی طرح فل برائٹ اور طرح طرح کے ڈیفیفوں پر دھڑا دھڑا امریکہ چلے جا رہے ہیں۔“

”ایشیا کے فن کار لوگ تو دھڑا دھڑا سوویٹ یونین اور چین بھی جا رہے ہیں“ بل نے کہا۔ وہ بڑا سخت غیر جانبدار تھا۔

باہر دیودار کے جنگل پر شفقت کی روشنی چھا گئی۔ عمارت کے مختلف کمروں سے موسیقی کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

”اب چلیں۔“ گوتم نے کہا۔ ”لندن واپس پہنچے پہنچے بہت رات ہو جائے گی“

”تم سب جا رہے ہو“ نرملا نے یک لخت دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”میں پھر اکیلی رہ جاؤں گی۔“

”تم اکیلی نہیں ہو نزل“ مال نے اس کے پلنگ پر جھک کر کہا۔ ”ہم سب ہر سے تمہارے ساتھ ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”اگلے ہفتے تک کے لیے خدا حافظ نرملا“ طلعت نے اس سے کہا۔

”نزل“ شاید میں اگلے ہفتے نہ آسکوں۔ پنڈت جی کسی کانفرنس کے لیے دہلی

سے آ رہے ہیں۔ بڑی سخت مصروفیت رہے گی۔“ گوتم نے نرمی سے کہا۔

”ہاں گوتم“ تم میرے کارن اپنے کام میں حرج نہ کیا کرو۔“ نرملا نے رمان

سے جواب دیا۔

وہ سب گیلریاں عبور کر کے باہر آ گئے۔ دور ونگ کے روشن درتچے میں سے

نرملہ ان کو دیواروں کے اندھیرے میں اوجھل ہوتا ہوا دیکھتی رہی۔

۷۴

طلعت کا فلیٹ سینٹ جانز ووڈ میں تھا۔ اس کے نزدیک ہی شاننا اور بل رہتے تھے۔ اس پاس اور بہت سے مشہور مصنفوں اور اداکاروں کے مکان تھے۔ بہار کا موسم آتا تو ان مکانوں کے پائیں باغ پھولوں سے بھر جاتے۔ شفاف سڑک پر سے سرخ رنگ کی ڈبل ڈیکر زسکون سے گزرتی رہتیں۔ چوراہے کی گرو سرائر تمباکو فروش کی دکانوں میں خریداروں اور دکانداروں کے درمیان پٹی تلی گفتگو جاری رہتی۔ آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا اطالوی ریستوران تھا۔ اس میں ایک واڑھی والا پولش یہودی آرٹسٹ اپنے کونے میں بیٹھا اسکیچ بناتا نظر آتا۔ وہ ہمیشہ متوقع رہتا کہ کوئی اس سے اس کے اسکیچ خرید لے گا۔ کوئی اس سے اس کی تصاویر نہ خریدتا۔

سینٹ جانز ووڈ کے ان خوبصورت مکانوں میں رہنے والوں کی ذہنی زندگیاں بڑی طوفانی تھیں۔ محبتوں، طلاقوں، نفسیاتی الجھنوں، کشمکشوں اور سیاہ قہوے پر یہ لوگ اپنی زندگیاں بتاتے تھے۔ ان کے نشست کے کمرے انتہائی آرتی انداز میں سجے تھے۔ لڑکیاں بالوں کی پونی ٹیل بناتی تھیں اور سیاہ رنگ کی تنگ موری والی چٹونیں پہنتی تھیں۔ اپنے والدین سے نفرت کرتی تھیں۔ اور اپنی سائیکو انالس کرواتی تھیں۔ اکثر مرد اداکار اور ادیب 'ہومو' تھے۔ یہ کامیاب اور دولت مند

فنکاروں کا محلہ تھا۔ یہ لوگ قدیم ایشیائی تہذیبوں، بازنطینی، رومن کیتھولک چرچ اور گپتا عہد کے آرٹ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ برطانیہ کی ڈسٹریکٹ آفس تھی۔

چند فرلانگ پر سریکھا کا مکان تھا۔ اس کا شو ہر گلشن آہوجا اسکول آف اکنامکس میں تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی لاہور کے شہر تھیں اور دلی سے یہاں تعلیم کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سریکھا رقصہ کی حیثیت سے بہتر شہرت حاصل کر چکی تھی اور رائل اکیڈمی آف آرٹ میں کریو گرافی سیکھ رہی تھی۔ اس کے قریب میاں بی بی چوپڑہ رہتے تھے۔ ایشیا سنگتراش تھی۔ سٹیش چوپڑہ بی بی سی کے ہندی سیکشن میں تھا۔ بدھ کے روزانہ کے یہاں ہندی کے حلقہ ارباب ذوق کا اجتماع ہوتا۔ چیلسی کی ایک عالی شان موڈرن بلاک میں کملا کا انٹرا ماڈرن فلیٹ تھا۔ کملا طلعت اور نرملہ کی بچپن کی ساتھی تھی۔ قیامت کی زمین اور بڑی زبردست انٹیکلچرل تھی اور بے حد خوش شکل لڑکی تھی کلاسیکل رقص کی ماہر وہ فارز سروس میں تھی۔ نرگیش بمبئی کے کسی کروڑ پتی کی لڑکی تھی۔ کیمبرج کی تعلیم یافتہ۔ دوسری پارسی لڑکیوں کی طرح مغربی لباس پہنتی۔ وہ بھی کہیں ملازم تھی اور کسی انگریز سے شادی کرنے والی تھی۔ کملا کی بڑی بہن شکنتا! کا مکان ٹائیٹس برج میں تھا۔ یہ بھی ایک غیر معمولی ذہانت کی مالک اور بہت اونچے پائے کی انٹیکلچرل تھی اور بے حد دلکش اور پیاری لڑکی تھی۔ اس کے شو ہر انڈیا ہاؤس میں پبلک ریشنز آفیسر تھے۔ فیروز جیس یونیورسٹی میں اردو میں ریسرچ کر رہی تھی اور ریجنٹ پارک میں رہتی تھی۔ زرینہ بھی یونیورسٹی میں تھی اور اوسترلی میں اپنی والدہ اور بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے والد دلی میں تھے۔ ان سب کی بڑے مصروف اندگیاں تھیں۔ یہ سب اپنے



اپنے مقاصد کی تکمیل میں جٹے تھے۔ صرف نرماسر پواسٹو اس ہنگامے سے الگ مدہر سٹ میں پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کا خیال کر کے طلعت کا دل ڈوب جاتا۔ اس کو سرت اب کس طرح حاصل ہوگی؟ نرملا، جس کو اور سب کی طرح زندگی سے بڑی بڑی توقعات تھیں۔ خوشی بے حد عظیم چیزیں ہے لیکن بے حد اضافی۔

طلعت دوسروں کی خوشی سے خوش ہوتی تھی۔ سریکھا کے ڈانس کے بعد کئی مرتبہ آنکھوں ہوتا یا گوتم کی کتاب کا نیا ایڈیشن نکلتا یا کملا کی کسی اخبار میں تعریف چھپتی تو اس روز طلعت کی عید ہو جاتی وہ دوسروں کے غم سے غمگین ہوتی تھی۔ وہ چپا کا خیال کر کے بھی کافی ملول ہوتی۔ اکثر وہ انگریزی میں ایک زبردست نالو لکھنے کا وقتا فوقتاً اعلان کرتی رہتی مگر کاہلی اور مختلف مصروفیات کی وجہ سے یہ ارادہ کبھی شرمندہ تکمیل نہ ہو پاتا۔ دن بھر اور اکثر رات گئے اخبار کی رپورٹنگ کے سلسلے میں دوڑنا دھوپنا پڑتا اور اس میں طرح طرح کے ایڈونچر ہوتے۔ اسے عموماً سے لے کر ٹیڑھ کے امروہو کے لیے بھیجا جاتا جو قریب سے دیکھنے کے بعد پتا چلتا کہ بے حد معمولی انسان تھے۔ غیر معمولی انسانوں سے بے حد معمولی حالات میں ملاقات ہوتی۔

طالب علموں نے طرح طرح کی مصروفیات بنا رکھی تھیں۔ ایک ایشین فلم سو سائٹی قائم کی گئی تھی جس میں ایک سے ایک بوگس ہندوستانی فلم دکھائے جاتے۔ انڈیا کلب میں نیو آرٹسٹوں کی نمائشیں ہوتیں۔ فیروز کے گھر کے پاس ہمراز بھائی رہتے تھے۔ ان کا مکان علی گڑھ کا ایکسٹنشن تھا۔ یہاں ہر وقت مشاعرے ہوا کرتے۔

بی بی سی والوں کی ساری زندگی باتیں کرتی گزرتی تھی۔ بعض اوقات یہ لوگ سارا سارا دن کنکین میں بجائیں کرتے بتا دیتے۔ ہر ایک اپنی اپنی ہانکتا۔ آل حسن اور اس کی بی بی کرشنا کا مکان بھی ایک اور گپ کا سنٹر تھا۔ کرشنا قانون پڑھ رہی تھی۔ آل بی بی سی کے ہندو سیکشن میں تھا۔ ترونا اور فیروز کے مکانوں پر لڑکوں اور لڑکیوں کا جھمگٹ رہتا۔ اس میں زیادہ تر بنگالی شامل تھے۔ یہی لوگ لندن مجلس کے روح ورواں تھے۔

طلعت مڈ ہرسٹ سے لوٹ کر اپنے فلیٹ پر پہنچی۔ اسی وقت اوجیت کا فون آیا: ”ہلو سنو۔“ وہ دباؤ رہا تھا۔ ”دیکھو یہ یگور یگور کا ہر وقت بنگالی شور مچاتے ہیں۔ اب اقبال ایونگ ہونا ضروری ہے۔“ (اوجیت خود بنگالی تھا۔ اسے ایک لفظ اردو کا نہ آتا تھا۔ پراگ میں اس نے انجینئرنگ پڑھی تھی۔) طلعت نے رالف رسل کو فون کیا۔ یہ علی گڑھ سے اردو پڑھ کر آئے تھے اور یونیورسٹی میں اردو کے استاد تھے۔ ”اقبال سنگھ سے کہہ دیا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔ ”ہاں“ طلعت نے جواب دیا۔ ”اور اوجیت نے تو انگریزوں کے جگر مراد آبادی کو بھی بلایا۔“

انگریزوں کے جگر صاحب انگریزی کے غزل گو شاعر تھے۔ جگر مراد آبادی ان پر کچھ ایسا چیک کیا تھا کہ ان کا اصل نام اب کسی کو یاد ہی نہ رہا تھا۔ یہ انگریزی کے اچھے خاصے دوسرے درجے کے شعراء میں شمار کیے جاتے تھے۔ روحانی طور پر سخت مسلمان تھے اور مشرق کے افلاس میں ان کو خدا کی قدرت اور روحانی برتری نظر آتی تھی۔

اب پھر ریہر ملیں شروع ہوئیں۔۔۔ ڈھاکے کا عطاء الرحمن، اقبال کے کلام

کے لیے موسیقی کمپوز کرنے میں مصروف ہو گیا۔ فیروز اسکرپٹ تیار کرنے میں جٹ گئی۔ ترونا، شیا، پرمودا، اوجیت اور سارے بنگالی اور کشمیری اور کجراتی لڑکوں اور لڑکیوں نے گانے کے لیے صحیح تلفظ کی پریکٹس شروع کی۔

طلعت اور رمیش سنگوی ٹڈل ٹڈل کی لائبریری میں اقبال کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے میں مصروف رہے۔

اقبال ایونگ منعقد ہو چکی تو میلے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

## ۷۵

لندن مجلس کا سالانہ میلہ شروع ہوا۔ ہال کے اوپر کے زینے پر آکر روشن نے نیچے کا منظر دیکھا۔ لڑکیوں نے دکانیں لگا رکھی تھیں۔ ایک کمرے میں دی بڑے اور کچوریاں بک رہی ہیں۔ بالکل امین الدولہ پارک کا نظارہ ہے۔ ”ہاکرز“ اپنے اخبار بیچ رہے ہیں۔ کمیونسٹ اپنا لٹریچر فروخت کرنے کے لیے آواز لگا رہے ہیں۔ سوشلسٹوں کا ایک گروہ اپنے پمفلٹ لیے کھڑا ہے۔

بل ایک ستون سے ٹکا چپ چاپ کھڑا تھا۔ ”ہلوروشن“ اس نے کہا۔ وہ شہلتے ہوئے دوسرے ہال میں چلے گئے جہاں مختلف ایشیائی ممالک کے اسٹال تھے۔ تصویروں کی نمائش۔ ایک طرف ڈوکومنٹری فلم دکھائے جا رہے تھے۔ دفعتاً خاموشی چھانی اور وہ سب گاتے ہوئے اسٹیج پر آئے۔ پرمودا حسب معمول آرکیسٹر اکنڈکٹ کر رہے تھے۔

ایسی سال چھے پیار بھرے ناواں۔۔۔۔۔

”کشمیر؟“ ایک انگریز تماشاخی نے پوچھا۔

”کشمیر۔ یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔“ روشن نے کہا۔

”یہ لوگ جو کار ہے ہیں کون سے کشمیر سے آئے ہیں؟ مقبوضہ یا

آزاد؟“ تماشاخی نے سوال کیا۔

پوش مالہ کرناواں چھس

شالیما رگوئن چھس دوراواں۔۔۔۔۔

”دونوں طرف کا کشمیر ایک دوسرے کے لیے آزاد اور مقبوضہ ہے۔“ گلشن

نے کہا۔

بل خاموشی سے پائپ پیتا رہا۔

روشہ روشہ یزاں وچھ پوش کارواں

پوش مالہ کر۔۔۔۔۔

پھر بنگالی گاتے ہوئے آئے۔

”یہ اتنے جوش و خروش سے کار ہے ہیں۔ کیا یہ دہشت پسندوں کا گروہ ہے؟“

”ایک ٹوری اخبار کے نمائندے نے پوچھا۔

”یہ؟ ہاں یہ دونوں بنگالوں کے رہنے والے ہیں۔“ طلعت نے قریب آ کر

بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

پون گھنٹہ گزر گیا۔ ٹوری اخبار نویس خفا بیٹھا تھا۔

”تم لوگ ہر وقت سیاسی گفتگو کیوں کرتے ہو؟“ ایک برطانوی ادیب نے

آہستہ سے کہا۔ اب تک وہ بڑی اداسی سے ان منظر کو دیکھتا رہا تھا۔

”ہم لوگ بے حد بد قسمت ہیں اس لیے۔“ طلعت نے ملول آواز میں جواب دیا اور پھر کسی کام سے اٹھ کر اسٹیج کے پیچھے چلی گئی۔  
اب ڈھولک بج رہی تھی۔

”پنجاب؟“ ایک اور اخبار نویس نے پوچھا۔

”ہاں۔ پنجاب بھی وہ ہیں۔“ قریب بیٹھے ہوئے سر یکھا کے میاں گلشن آہوجہ نے اسے تلخی سے جواب دیا۔ ”اور سوا کرو“ میں تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کروں گا۔“

\_\_\_\_\_ دھرتی جی آمی ہی لے کر بھاگوان \_\_\_\_\_ دھرتی۔

\_\_\_\_\_ شینا اور جاوہیا۔ سنگاتی گاؤیا \_\_\_\_\_ رانوپا کھر \_\_\_\_\_  
یہ مرہٹی گیت تھا۔

پھر کجراتی کورس شروع ہوا:

ہے کھترتی واڑی وتی \_\_\_\_\_ جنگل تی جھاڑی وتی  
ساگر تھی گرور تھی

سونی ساداؤیا \_\_\_\_\_ اوہمیں سونی ساداؤیا

فلیٹ اسٹریٹ کے نمائندے اسٹیج کے قریب فٹ لائٹس کے اندھیرے میں  
فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے سامنے کے جگمگاتے منظر کو دیکھا کیے  
اسٹیج پر وہ گارہے تھے۔

ہمیں جگ جگ کیرا نکال

بھاگتی نر کو نہ دوار

دیتا ڈگ ایک تال

دھرنی پر آویا \_\_\_\_\_ او ہمیں دھرنی پر آویا \_\_\_\_\_

دیکھ دیکھ اورے اندھ

کارمین آویا

کارمین آویا۔ \_\_\_\_\_

پھر ہال کے وسط میں وہ سب گھیرا ہٹا کر کھڑے ہوئے اور انہوں نے انٹرنیشنل  
شروع کیا۔

ہر جگہ جوانیاں ہیں گاری

ہنسی خوشی منارہی

اور اارہی و شو مترتا \_\_\_\_\_

دنیا بھر سے ایک ہوئے نو جوان ایک آدرش مہمان لیے

خطرہ ہو بلیڈان کا \_\_\_\_\_ پھر بھی ہم لائیں گے سکھ چین

سکھ چین \_\_\_\_\_ سکھ چین \_\_\_\_\_

ان کی آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ روشن باہر آگئی۔ یہ سب کیا بکواس ہے۔

جوم میں سے نکل کر تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے اس نے سوچا۔ یہ درست ہے

کہ اس طرح کے گیتوں سے خون میں ایک لمحے کے لیے جوش سا پیدا ہوتا ہے۔

یہ لوگ اس قدر بلڑکیوں مچارہے ہیں کیونکہ سب فنا ہے اور انسان ایک دوسرے

سے مختلف ہیں۔ انسان کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کا پیچھا

کر رہا ہے۔

”مس کاظمی“ کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ یہ تو ناتھی۔ پھر لڑکیوں کے ایک ریلے نے اسے آلیا جن سے بچ کر وہ اب باہر نکلی تھی۔

”روشن فیروز نے کہا“ ”نذرل داوا آگئے ہیں۔ اس وقت ہم لوگ وہیں جا رہے ہیں۔ کل صبح سے بچ ان کے لیے چندہ جمع کرنے نکلیں گے۔ تم کو لینے کے لیے آٹھ بجے پہنچ جائیں گے۔ سمجھیں، تیار رہنا؟“

طلعت اس کے نزدیک آئی۔ ”یہ کنجی لیتی جاؤ، میں شاید دیر سے آؤں۔ یا شاید سریکھا کے یہاں رہ جاؤں۔ صبح کو ضرور چلنا ساتھ۔ گڈ نائٹ۔“

وہ سب دوسری سڑک پر مڑ گئیں۔ وہ حسب معمول مصروف معلوم ہوتی تھیں۔ مصروفیت، تکمیل مقاصد کا ہنگامہ۔ ہجوم ندی کے پانی کی مانند چاروں طرف بہا گیا۔ کالج میں چھٹیاں تھیں اور وہ یورپ جاتے ہوئے چند روزس کے لیے طلعت کے یہاں ٹھہر گئی تھی۔ میڈ اویل کے اسٹیشن پر پہنچ کر وہ اوپر آرہی تھی کہ اچانک اسے عامر رضائل گئے۔ وہ کار میں اسی کی تلاش میں ادھر آرہے تھے۔

”تم کہاں تھیں؟ میں تمہارے سارے ٹھکانوں پر تمہیں ڈھونڈ آیا۔“

”میلے میں۔“

”میلہ؟ وہ ہاں۔ میلہ ٹھیک ہے۔ آؤ۔“

وہ نکلڑ کے اطالوی ریسٹوران میں داخل ہوئے۔ یہودی آرٹسٹ انہیں دیکھ کر فوراً اپنے کاغذ پر جھک گیا۔

”روشن“ عامر نے میز پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا، ”تم بڑی غلطی

کر رہی ہو۔ تمہارے ابا کو تمہاری رپورٹ پہنچ جائے گی۔

”اوہ“ \_\_\_\_\_ وہ ہنس پڑی۔ ”لیکن عامر ان لوگوں میں بہت سے میرے عزیز دوست ہیں۔ ان کے سیاسی خیالات یا ان کی قومیت دوستی کے راستے میں تو حائل نہیں ہو سکتی۔“

”یہ تمہارا نظریہ ہے۔“ عامر نے کہا ”لیکن زیادہ پریکٹیکل بنو اور اپنے نفع نقصان کا دھیان رکھو۔ تمہاری سرگرمیوں سے تمہارے والد کی ملازمت پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔“

”اور شاید میری اور تمہاری دوستی پر بھی۔“ روشن نے معادل میں کہا۔ ”لیکن عامر \_\_\_\_\_ میری کیا سرگرمیاں ہیں؟“ اس نے چڑ کر کہا۔ اس آدمی کو سمجھانا بیکار تھا۔ پہلی مرتبہ اسے محسوس ہوا کہ یہ انسان جسے وہ اتنے عرصے سے اپنا دیوتا تصور کر رہی تھی، ایک مختلف ہستی تھی ایک دوسرے جزیرے پر بیٹھا تھا، اسے نہیں سمجھ سکتا تھا۔ مگر وہ تیار ہو گئی کہ اس کے خیالات کی تابعداری کرے گی مرد کی تابعداری عورت کا فرض ہے۔ فلسفے یہاں بیکار تھے۔ مرد ہر حالت عورت کی مکمل اطاعت کا خواہاں ہے۔ یہ کامریڈ و امریڈ سب غلط بات ہے اور یہ عامر رضا بہر حال کامیڈ نہیں تھا۔ اب یک لخت اس کی سمجھ میں آ گیا کہ چمپا احمد سے اس کی کیوں نہ نہ سکی۔ چمپا اپنے خیالات میں خواہ وہ کتنے ہی گنجلک کیوں نہ رہے ہوں، خود مختار رہنا چاہتی تھی لیکن شاید چمپا بھی مکمل طور پر خود مختار نہ تھی۔ کاش وہ چمپا سے پوچھ سکتی کہ وہ اب کس کے خیالات کی اطاعت میں مسروف ہے۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ باہر ریٹوران کے دروازے پر چیتھڑوں میں ملبوس ایک



ہنگرین سازندے نے وائلکن پر ”ہسپانوی باغ میں ایک رات“ بجانا شروع کر دیا تھا۔

”اسپین چلو گی؟ عامر نے پوچھا۔

”ہاں“

”جرمنی؟“

”ہاں جہاں کہو گے چلوں گی۔ اس نے دل میں کہا۔ فلسفے اور آزادی افکار لغو بات ہے۔ اگر اس وقت طلعت یا مکلا کو اس کے ان خیالات کا پتا چل جائے تو وہ فوراً سے پھانسی پر لٹکا دیں۔ یہ سوچ کر وہ اداسی سے مسکرائی۔

عامر رضا نے اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھی۔

دوسرے دن وہ لڑکیوں کے ساتھ قاضی نذر اللہ اسلام کے لیے چندہ جمع کر کے طلعت کے فلیٹ واپس پہنچی تو اس نے ایک اجنبی کو موجود پایا جو اس کے انتظار میں نیچے باغ میں ٹہل رہا تھا۔

”آپ کے خلاف رپورٹ پہنچی ہے کہ آپ کمیونسٹوں کے جلسوں میں شریک ہوتی ہیں“ اجنبی نے کہا۔

”جی؟“ وہ ہکا بکارہ گئی۔

”یہ غلط ہے؟“

”بالکل۔ وہ لوگ کمیونسٹ قطعی نہیں ہیں۔“

”آپ کو برابر ایک خاص گروہ کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ

”

”مگر یہ تو محض طالب علمانہ ہنگامے ہیں۔ ہر جگہ ہوتے ہیں۔“  
”جی!“

”آپ کا مطلب ہے،‘وہ وہیں مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی‘“ کہ میں انسانی  
رشتوں کو سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دوں؟ ان لوگوں میں سے بہت سے میرے  
عزیز ترین دوست اور ساتھی ہیں۔“

”انسانی رشتے؟“ اجنبی نے حیرے سے پوچھا۔ ”وہ کیا چیز ہے؟ رشتے  
صرف سیاسی ہوتے ہیں۔ انسانی رشتے کس چڑیا کا نام ہے۔ اس بے تکلفی کو  
معاف فرمائیے گا مس کاظمی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فلسوفوں اور آئیڈیالز نے آپ کو  
کہیں کانہ رکھا اسی لیے میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ فلسفے اور ادب عالیہ کی تعلیم آج کی  
دنیا میں بالکل لغو اور بے معنی ہے۔ آپ نے بزنس ایڈمنسٹریشن کیوں نہ پڑھا؟“  
روشن غصے سے تلملارہی تھی لیکن ہنس پڑی۔

”تشریف رکھے“ اس نے دوسری سیڑھی کی طرف اشارہ کیا۔  
”میں نے آپ کا بہت ذکر سنا ہے۔“ اجنبی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی  
قلمی کیدھوم مچی ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کہ \_\_\_\_\_“  
”کہ میں غلط راستے پر پڑ گئی؟! میں آپ سے عرض کروں مسٹر \_\_\_\_\_“  
”\_\_\_\_\_ خان \_\_\_\_\_“

”مسٹر خان کہ میں کمیونسٹ نہیں ہوں؟“  
”نہیں ہیں؟ اس کا ثبوت آپ کے پاس کیا ہے؟“  
یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔ خیالات جیسی غیر مرئی چیز کے متعلق کس طرح کوئی

ثبوت پیش کیا جاسکتا تھا۔ وہ فلسفے اور خیالات کی طالب علم، اس بے بسی پر بے حد تلملانی۔

اب امریکہ جانا گول سمجھو۔ اس رات پلنگ پر لیٹے ہوئے اس نے سوچا۔ (اے آئندہ سال ہارورڈ جانے کے لیے فل برائنٹ وظیفہ مل چکا تھا) دیر تک کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد نیند آئی۔ صبح جب وہ سو کر اٹھی تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ عداوتیں، مزاحمتیں، جیل، بندوق، گولہ بارود، نعرے، رات بھر اس نے اس قسم کے خوفناک خواب دیکھے تھے۔

”آخر جن کو جیل بھیجا جاتا ہے وہ آسمان سے تو نہیں اترتے ہیں۔ ہماری تمہاری طرح ہی کے انسان ہوتے ہیں۔“ ناشتہ تیار کرتے ہوئے اس نے طلعت سے کہا۔

طلعت نے اس کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔

”تم مذاق سمجھ رہی ہو۔“ روشن نے جھنجھلا کر کہا۔

”بالکل نہیں۔“ طلعت نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”سوال یہ ہے،“ روشن انڈے پھینٹتے ہوئے آہستہ آہستہ بولی، ”کہ ایک طرف روپیہ اور عزت اور شان و شوکت ہے اور سکیورٹی اور دوسری طرف محض دھندلا کا ہے اور دھندلکے میں خواب نظر آتے ہیں۔“

”ہاں۔ ایک طرف سکیورٹی ہے دوسری طرف سکیورٹی ایکٹ، فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔“ طلعت نے کہا۔

سر یکھا نے جلدی جلدی چاء پینے کے بعد گھنگرو باندھ لیے۔ وہ سب نذرا لا  
سلام کے پروگرام کی ریہرسل کے لیے صبح طلعت کے یہاں جمع ہو چکے تھے۔  
”روشن“ گوتم نے اسے غیر معمولی طور پر خاموش دیکھ کر سوال کیا، تمہارا پروہلم  
کیا ہے؟ وہ حسب معمول پیغمبرانہ شان سے آکر دیوان پر بیٹھ گیا۔

”دینی کشمکش۔“ طلعت نے مختصر جواب دیا اور توس سینکے میں مصروف رہی۔  
”تو کیا ہوا؟ اپنے وطن واپس جاؤ۔ چند سال بعد وہاں ریوولوشن آئے گا۔  
اس میں تمہاری بڑی ضرورت ہوگی۔“ گوتم نے اس قدر یقین اور اعتماد کے ساتھ  
کہا کہ روشن کو ہنسی آ گئی۔

”لیکن میں ریوولوشن نہیں چاہتی“ اس نے کہا۔  
”وہ تو میں جانتا ہوں۔“ گوتم نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں نے صرف  
یہ کہا تھا کہ جب ریوولوشن آئے گا تب تم کام کرو گی۔“  
”اسے غلط راستے پر مت لگاؤ۔“ طلعت نے کہا۔ ”پہلے ہی اس کی رپورٹ ہو  
چکی ہے۔ اسی طرح تم نے چمپا باجی کو ایجوکیٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ فیل ہو گئے  
اور دیکھو ان کا کیا ہوا؟“

”کچھ بھی تو نہیں ہوا، یہی افسوس ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا کچھ  
نہیں ہوتا۔ معلق رہتے ہیں، کہیں نہیں پہنچ پاتے، بہتے رہتے ہیں،“ گوتم نے آہستہ  
آہستہ کہا۔

کیا اس وقت یہ چمپا کو یاد کر رہا ہے۔ طلعت نے سوچا۔  
”لیکن روشن تم اس سفارت خانے جا کر کہہ دو کہ تم کو ہم لوگوں سے کوئی

مطلب نہیں۔ ”گوتم“ روشن کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

”میں غلط بیانی نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنی ضمری پرستی پر اب تک بہت ماز رہا ہے مجھے تم لوگوں سے بہت بڑا مطلب ہے۔ تم لوگ میرے دوست ہو۔ میں دوستی کا مطلب سمجھتی ہوں، اس کی قدر و قیمت۔“

”مطالب سمجھنے کی کوشش نہ کرنا۔ بہت دکھی ہوگی۔“ گوتم نے دفعتاً بڑی رنجیدہ آواز میں کہا۔ طغٹل نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ یہ اس وقت چمپا کو یاد کر رہا ہے اس نے دل میں دہرایا۔

”اجی انکار کرنے میں کیا رکھا ہے۔“ اس نے گوتم کا دھیان بنانے کے لیے شگفتگی سے بات شروع کی۔ ”ایک سے ایک لوگ ایک زمانے میں ترقی پسند تھے۔ اعلان کر دیا کہ اب ترقی پسند نہیں ہیں اور دیکھو کیا مزے کر رہے ہیں۔“ اس نے روشن کی طرف مڑ کر کہا۔ ”اور تم تو کبھی بھی ترقی پسند نہیں تھیں۔ نہ کل نہ آج۔“

”بھیا صاحب نے بھی تو مضامین لکھے تھے؟ فیروز نے سوچ کر کہا۔“

”مگر اب تو وہ ہانگ دہل کہتے ہیں کہ تائب ہو چکے ہیں۔“ طلعت نے جواب دیا۔

”بھیا صاحب کلٹر پچر میں بھی دخل تھا؟“ گوتم نے پوچھا۔

”جی ہاں، ایام جہالت میں۔ اب انہیں گیان حاصل ہو چکا ہے۔ ورنہ فارن سروس میں یونہی لے لیے جاتے۔“ طلعت نے کہا۔

”یہ ایام جہالب کب تھے؟“ گوتم نے سوال کیا۔

۳۹ء وغیرہ میں۔ طلعت نے جواب دیا۔ ”ارے تم کو کیا معلوم۔ بہت بڑے انقلابی تھے ایک زمانے میں لکھنؤ کے اندر۔ چمپا باجی بھی سب کے ساتھ ساتھ لگی رہتی تھیں۔ رشیدہ آپا کے یہاں بیٹھ کر یہ سب آزاد نظمیں لکھتے تھے۔“

”چمپا باجی اتنی پرانی ہیں؟“ روشن نے چونک کر پوچھا۔

”معلوم نہیں ہوتیں“ ترونا نے کہا۔

”سدا بہار ہیں“ فیروز نے جواب دیا۔

”دوستی محبت سے بلند تر شے ہے۔“ گوتم نے آہستہ سے کہا۔ ”بہت سے لوگ

یہ بات نہیں سمجھ پاتے۔“

”تم بھی اعلان کر دو جی“ طلعت نے پھر جھکادی سے گفتگو کر رخ اصل

موضوع کی طرف موڑا، ”کہ مجھے ان موئے سرخوں سے کوئی مطلب نہیں۔“

”تم کہہ دو کہ تم سرخا سرخ فرخ آبادی کبھی نہ تھیں نہ ہو نہ ہوگی۔“ فیروز نے

کہا۔

”دست صبا لایئے؟“ کورس ہوا۔

”جی ہاں۔“ انہوں نے کہا۔

سب آگ کے پاس جا بیٹھے اور ”دست صبا“ عقیدت سے ہاتھوں ہاتھ لی

جانے لگی۔

”سمجھیں تم؟“ گوتم نے کتاب کے صفحے پلٹے ہوئے بے دھیانی سے کہا۔

”بس تم جا کر کہہ دو آئندہ ہم سب سے قطع تعلق کر لوگی۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ قطع

تعلق کرنا دراصل بے حد آسان ہوتا ہے۔“

”تم سٹیون اسپنڈر کی طرح“ طلعت نے کہنا شروع کیا۔  
”یہ بے بات انگریزی ادیبوں کا ذکر کیے بغیر تمہارا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔“  
”غیر وزبونی۔“

”کیا کیا جائے۔ اپنی اپنی کمزوری ہے۔“ طلعت نے کہا اور بات جاری رکھی۔ ”تم ایک کتاب لکھنا کہ کس طرح تم کو ڈوپ بنانے کی کوشش کی گئی مگر تم صاف بچ گئیں۔“

”تم نے فریڈم کا انتخاب کیا۔“ غیروز نے لقمہ دیا۔  
”وغیرہ وغیرہ۔۔“ سر یکھانے کہا۔ اب تک وہ کمرے کے سرے پر کھڑی تھانا کی پریکٹس کر رہی تھی۔

”کیا بیوقوفی کی باتیں کر رہی ہو تم لوگ۔“ ترومانے پیا نوپر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”روشن تم جرمنی جا رہی ہو کل؟“  
”ہاں۔“

”تو ہمارے ساتھ ہی چلو۔ ہم لوگ بھی یوتھ فیسٹوں کے لیے کل جا رہے ہیں مشرقی برلین۔“

”مشرقی برلین میں کیسے جاسکتی ہوں؟“ روشن نے کہا۔  
”کیوں؟“ تم میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے۔ ساری دنیا کے لوگ جاسکتے ہیں، تم نہیں جاسکتیں۔

”سمال یہ بھی“ غیروز نے سر ہلا کر کہا۔ ”ساری رامائن ہو گئی، آہ پوچھتی ہیں سینا کون تھی؟ ارے یہی تو قصہ ہو رہا ہے۔“

”بکواس‘ سر یکھانے کہا۔ چلو روشن‘ یہ ایسا تجربہ ہے جو زندگی بھر کبھی حاصل نہ ہوگا۔“

”نہیں“

”ارے‘ کیا رکھا ہے؟ واپس آ کر سویت یونین اور مشرقی یورپ کے خلاف تین چار مضمون لکھ دینا۔ سب یہی کرتے ہیں۔“

”یہاں اتنی بے ایمانی ہے‘ اتنی ضمیر فروشی ہے۔ روشن بیگم جس کا تم کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔“ گوتم نے کہا۔ ”آج کی دنیا میں تم اپنے ضمیر کو بچائے نہیں رکھ سکتیں۔“

وہ کوٹ پہن کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئی۔

”ہم تم سے برلین میں ملیں گے۔“ روشن نے مسکرا کر کہا۔

”مغربی برلین میں۔“ روشن مسکرا کر کہا۔

”نہیں ہم تم سے مشرقی برلین میں ملیں گے۔“

”یہ تقسیم شدہ دنیا ہے۔ ملک

’انسان‘ نظریے‘ روحیں‘ ایمان‘ ضمیر\_\_\_\_\_ ہر شے تلواروں کو سے کاٹ کاٹ کر تقسیم کر دی گئی ہے۔ یہاں ہر طرف سرحدیں ہیں۔ اس تقسیم شدہ دنیا میں ہم ایک دوسرے سے سرحدوں ہی پر مل سکتے ہیں۔ روشن‘ گوتم نے کہا‘ ”ہم تم سے مشرقی اور مغربی برلین کی سرحد پر ملیں گے۔“

”اگر اس وقت تم کو جیل نہ بھیج دیا گیا۔“ طلعت نے ہنس کر کہا۔





ایک پھریری سی آئی۔ وہ اس کا نہیں کسی اور لڑکی کا شوہر تھا۔ اس لڑکی کو چپا نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ منظر پر سائے پھر پھیل گئے۔ کشتیاں کنارے سے بندھی کھڑی تھیں اور موسم کی ساری خوشبوئیں اکٹھی ہو کر گلابوں کی چھاؤں میں پانی پر تیر رہی تھیں۔ آسمان پر سے مرغابیاں گزریں۔ گائیوں نے آکر پانی میں اپنا عکس دیکھا اور مطمئن ہو گئیں۔ بوٹ ہاؤس کی بالکنی پر ایک لڑکی آکھڑی ہوئی۔ بہت سے لوگ پر م روز کی بیلوں کے کنارے کنارے بنیاں اٹھائے پانی کی اور جا رہے تھے۔

”چپا۔۔۔“ سرل نے ایک الٹی ڈونگی پر بیٹھ کر کہا، ”مجھے اپنے پس منظر کے متعلق بتاؤ۔“ اس نے دیکھا کہ دور دیس سے آئی ہوئی یہ لڑکی اس کے سہارے وہاں بیٹھی تھی۔ وہ بے حد غیر محفوظ تھی۔ اپنے پس منظر میں شاید وہ محفوظ رہ سکے لیکن اس کی اپنی دنیا جانے کون سی تھی۔ دنیا میں برابر بدلتی رہتی ہیں۔ یہ لڑکی اسے بے انتہا مانوس نظر آئی۔ روز ماری اس کے لیے اجنبی تھی۔ وہ یکنخت بہت گھبرا گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ اس لڑکی چپا احمد سے ایک غیر مرنی بندھن میں بندھا ہوا ہے۔ اسے اپنے آپ پر اور اس لڑکی پر بڑا ترس آیا۔

”کیا تم بھی میرے متعلق ناول لکھو گے؟“ چپا نے پوچھا۔

”نہیں اور کون لکھنے والا تھا؟“

”بل۔۔۔ ولیم کریگ“

”نہیں۔ میں ناول نہیں لکھنا چاہتا۔“

”کیا میں تم کو بہت عجیب معلوم ہوتی ہوں؟“

”تم عجوبہ روزگار نہیں ہو۔ تمہاری طرح کی بے شمار لڑکیاں موجود ہیں۔ ذہین،  
حساس اور دلکش۔“

چنانچہ ان تین الفاظ سے میری وضاحت ہو جاتی ہے۔ چمپا نے دل میں کہا۔  
اس نے آنکھ بند کر کے اپنا پس منظر یاد کیا۔ بنارس کا محلہ، گھر۔ آنگن میں کھری  
چارپائیاں پڑی ہیں۔ بابا بیچوان پٹی رہے ہیں اور مقدموں کی مسلیں دیکھتے جاتے  
ہیں۔ سرل کو یہ منظر دکھانا اسے اچھا نہ لگا۔ وہ اسے پھلانگ کر آگے بڑھ گئی۔ لکھنؤ۔  
آئی ٹی کانج۔ کیلاش۔ گلشنشاں۔ لیکن گلشنشاں اس کا گھر نہ تھا (ہو سکتا  
تھا)۔

”یہ دیکھو کون آرہا ہے تمہارے پس منظر سے نکل کر۔“ سرل نے کہا۔  
چمپا نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ کنارے پر دور دور تک بکھرے ہوئے تعطیل  
منانے والوں کے مجمعے سے نکل کر مال بوٹ ہاؤس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گھاس پر  
اس کا سایہ آگے آگے چلتا رہا۔

”ہلو چمپا باجی۔ ہلو سرل۔“ اس نے قریب آ کر کہا۔  
”ہلو“

”کل صبح ہم نے آپ کو ایک روڈ ہاؤس میں دیکھا تھا۔“  
”ہاں۔“

”مگر ہم لوگ ذرا \_\_\_\_\_ جلدی میں تھے۔“

”ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ بیٹھو۔“

وہ بھی ایک انٹی ہوئی ڈونگی پر بیٹھ گیا۔

”میں سرل کو لکھنؤ کے متعلق بتا رہی تھی۔“ چمپا نے کہا۔

”واقعی۔“ کمال نے اخلاقی دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ یہ ابھی تک وہیں بیٹھی ہیں، دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی۔ کمال نے تاسف سے سوچا۔

چمپا نے کمال کے لہجے کے رنج کا اندازہ لگالیا۔ تم مجھے کبھی نہیں سمجھ سکو گے کمال۔ اس نے کہا۔ تم نے مجھ پر ہمیشہ چیزوں کی پرستش کا الزام لگایا ہے لیکن گرمی کی دوپہروں میں بھوسے کے ڈھیر کی مہک اور گھوڑوں کے ہنہانے کی آواز اور خاموش سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی بیل گاڑ۔۔۔۔۔ مجھ میں شاید زیادہ عقل نہیں۔۔۔۔۔ لیکن میں ان سب چیزوں کو محسوس کرنا اور اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں، اگر میں بہت زیادہ غفلت مند ہوتی تو تمہارا فلسفہ پڑھتی اور مطمئن ہو جاتی۔

اوجیت ندی میں سے نکل کر آیا اور کمال کے نزدیک بیٹھ گیا۔

”سرل کاش تم نے بارش کے بعد چاند باغ کے کنجوں پر جو رنگ بکھر جاتے تھے وہ دیکھے ہوتے۔ یارام نگر کی وہ گرد آلود سڑک جس میں گرمیوں کی بھری دوپہر کے سنائے میں ایک چھوٹا سا اداس ہندو بچہ لمبی سی چوٹی رکھائے ایک منڈیر پر تنہا بیٹھا سوائیوں کا پیارہ یاد کر رہا تھا۔۔۔۔۔ نہیں سرل۔۔۔۔۔ میں تم کو اپنا پس منظر نہیں بتا سکتی۔ بہت مشکل ہے اور تم سمجھ نہیں سکو گے۔“

”میں تم کو بتاؤں گا۔“ کمال نے آگے جھک کر کہنا شروع کیا، وہ معاں دنیا میں داغ ہو گیا جو یہاں سے بہت دور تھی، جس پر وہ عاشق تھا۔ ان مناظر کی روح کو کمال سے بہتر کون جان سکتا تھا، وہ اس کا پیارا ہندوستان تھا۔

”لو سنو: گیان وقتی کندھوں پر بال چھٹکا کر ایمن کا خیال گاتی تھی

\_\_\_\_\_ آل نبیؐ اولاد علیؑ پر واری واری جاؤں \_\_\_\_\_ زہرا کے فرزند حسنؑ  
 حسینؑ \_\_\_\_\_ اب میں اس کا ترجمہ کیسے کر سکتا ہوں \_\_\_\_\_ اور ماتی گاتی  
 تھی \_\_\_\_\_ کانہامو ہے آساوری راگ سناؤ \_\_\_\_\_ اور شادیوں کے مقعوں پر  
 کلیان پور میں دالان کے پردے گرا دیے جاتے تھے اروتختوں کے چوکے پر بیٹھ  
 رک میرا شتیں الاپتی تھیں۔ اس بنے پر سایہ علی کا۔ مورا شیا م سندر بنا۔  
 \_\_\_\_\_ کون مغربی سوشیو لو جسٹ اس منظر کے حسن کو سمجھ سکتا ہے \_\_\_\_\_ مورا  
 شیا م سندر بنا \_\_\_\_\_“

”اور \_\_\_\_\_“ چپا نے کہا ”میرے گھر کی میرا بہنیں گاتی تھیں  
 \_\_\_\_\_ منگل گاؤں \_\_\_\_\_ چوک سجاؤں \_\_\_\_\_ کجرا چنبیلی کا لاؤری  
 \_\_\_\_\_ چنبیلی کا کجرا تم نے دیکھا ہے سرل؟“

”اور گھاگھرا کے کنارے کنارے میرے گاؤں کے کسان کھیتوں کی منڈیر  
 پر بیٹھ کر چاندنی رات میں آہا اول کی تانیں اڑاتے تھے \_\_\_\_\_ علی علی کر  
 کے سید دوڑیں \_\_\_\_\_ آہا کھینچ لیں تلوار \_\_\_\_\_ اور قدیر کا بھانجا ٹونکی میں  
 چہرے پر سفیدہ پوت کر گایا کرتا تھا:

خدا کا سکر ہے لیلی ترے دربار میں آیا  
 کہ جس سرکار کا تھا میں اسی سرکار میں آیا  
 ”چپا باجی \_\_\_\_\_ وہ ٹونکی تم کو یاد ہے \_\_\_\_\_ ہم تمہیں کرمس کے  
 زمانے میں اپنے گاؤں لے گئے تھے اور رات بھر کملوں میں پٹ کر ہم نے لیلی  
 مجنوں ملاحظہ کیا تھا اور گاؤں کے اکار ہم کو خوش کرنے کے لیے اپنا سارا آرٹ

صرف کیے ڈال رہے تھے۔“

”ہاں۔“ چپا نے جو اس وقت لکھنؤ سے پچیس میل کے فاصلے پر کلیان پور میں موجود تھی وہیں سے جواب دیا: ”ہاں۔ اس نے ہوائیں ہاتھ پھرا کر کہا تھا:

تیرا چہرہ مرا قبلہ تری جلفیں میرا ایماں

طواف کعبہ کرنے کو ترے دربار میں آیا۔“

”ہاں۔“ کمال نے کہا، وہ بھی کلیان پور میں موجود تھا، وہ سب نوٹنکی میں منڈپ کے نیچے شمال اور کبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ شکستہ حال اسٹیج پر صرف مدھم سا گیس کا ہنڈ روشن تھا۔ پردے پر ایک فوارہ بنا ہوا تھا اور چار پریاں جو کہنیوں کے سہارے بیٹھی تھیں۔ قدیر کا بھانجا ماسٹر پھرید، جو اپنی تیز پاٹ دار آواز کی وجہ سے جھنگر واکھاٹا تھا، لیلیٰ کے سامنے کھڑا ہاڑ رہا تھا۔ گاؤں کا آرکسٹرا زور شور سے ہار مو نیم اور طلبہ بجانے میں مصروف تھا۔ ماسٹر پھرید نے گایا:

زیلٹا کی طرح جب ترا ناسک ہوا لیلیٰ

تو یوسف کی طرح بکنے ترے بازار میں آیا

براہر کے موڈھے پر گوتم نیلمر بیٹھا تھا۔ اس کے برابر ہی ہری شنکر موجود تھا اور ساتھ کی ساری لڑکیاں اور گوتم آگے جھک کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ چپا کے سامنے نوک کلچر کے مسئلے پر روشنی ڈال رہا تھا، وہ سب صبح چار بجے تک نوٹنکی کے منڈپ میں بیٹھے رہے تھے اور انہوں نے مٹی کے کورے کلہڑوں میں اورک والی چاء پی تھی اور گنے کا رس \_\_\_\_\_ یہ کمال کے والد نواب تقی رضا بہادر کا موروثی گاؤں تھا۔ یہاں کمال کی موجودگی میں اس کی رحمت میں صرف سید اور

برہمن پلنگ پر بیٹھ سکتے تھے۔ باقی لوگوں کے لیے حکم تھا کہ کھڑے ہو کر باتیں کریں۔ اب اسٹیج پر ماسٹر مراری لال، جو کلمتہ تک تھیٹر کمپنیوں کے ساتھ گھوم آیا تھا، سوئی میں گارہا تھا:

یاس کا عالم نہ تھا، یوں بے کسی چھاتی نہ تھی  
اب تو لیلیٰ تھی تماشا، خود تماشائی نہ تھی

وہ سب موڈھوں پر بیٹھے نوٹنکی دیکھتے رہے۔ باہر آم کے جھرمٹ میں پوس کی ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی گرم اور محفوظ، وہ منڈپ میں بیٹھے طبلے پر کھواسنتے رہے۔ دفعتاً ایک موٹر لانچ ایک انگریزی ریکارڈ بجاتی ہوئی تیزی سے یکم کی لہروں پر سے گزر گئی۔ چپا اور مال واپس آگئے۔

”ہمارے گاؤں کی نوٹنکی میں نل دینتی اور اندر سجا بھی بہت فرسٹ کلاس ہوتا تھا۔“ مال کی ملوں آواز سنائی دی وہ جھک کر سرل کا سگریٹ جلا رہا تھا۔  
”اور تم کو جو تھیرکارائے یاد ہے مال۔“ چپا نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”اورونتی کا وہ گیت: جو گن کھوجن نکلی ہے۔“

”ہاں“ مال نے اس کے ساتھ تعاون جاری رکھا۔

”اور جاڑوں کی دھوپ میں بیٹھ کر بری شکر گاتا \_\_\_\_\_ اگر دینی تھی ہم کو حورو جنت تو یہاں دیتے \_\_\_\_\_ اور پیالمن کو جات تھی میں، حج حج سیس گند صائے \_\_\_\_\_ لوگ کہت میں باوری \_\_\_\_\_ سب جگ ہنسی اڑائے \_\_\_\_\_ تم کو کیا پتا“ اس نے غصے سے سرل کو مخاطب کیا، ”کہ پنکشن ملک کون ہے، پہاڑی سانپال اور آرزو لکھنوی اور نرائن راؤ دیاس اور کانن دیوی \_\_\_\_\_ ان لوگوں کا

ہماری زندگیوں میں کیا مقام ہے۔“

”تمہیں کیا پتا۔“ چپا نے اس کی خفگی کا کیولے کر کہنا شروع کیا۔ ”تم جو مجھ سے میرا پس منظر دریافت کرتے ہو۔۔۔ کہ پیار و قوال کی کیا ہستی ہے اور فیاض خاں اور دیپالی تعلق دار۔۔۔ اور۔۔۔“

”اور تم کو کیا معلوم کہ نکھنوا اور علی گڑھ کے مشاعرے کیا ہوتے تھے اور جگر صاحب کی ہمارے لیے کیا اہمیت ہے اور فراق صاحب کی اور آنند نرائن ملا کی۔“ کمال نے کہا۔

”اور تم کو کیا پتا“ اب چپا کی آواز میں غصے کی جگہ اتھاہ رنج نے لے لی۔ ”کہ کالی داس کے اس شعر کے کیا معنی ہیں۔۔۔ یہ شعر۔۔۔“

نروندھیا اور سندھو پر سے گزرتا بگلوں اور بٹخوں کی معیت میں بادل پیغام لے کر چلا۔۔۔“

”اور تم کو کیا معلوم کہ ہالڈر کی بنائی ہوئی تصویر: اشوک کے جھنڈ میں بیٹا، ہمیں کیوں اتنی خوبصورت لگتی ہے۔“ کمال نے کہا۔ ”نہیں سر! یہ بڑا مشکل کام ہے۔“

”اور یاد ہے کمال“ چپا واپس جانے پر مصر رہی۔ ”ہم سنگھاڑے والی کوٹھی کے لان پر بیٹھ کر پندرہ پندرہ سال پرانے ریکارڈ بجایا کرتے تھے۔ کملا جھریا اور جاکلی بانی اور ہری متی۔۔۔“

”ہاں۔“ کمال نے کہا۔ ”اور محمد حسین ساکن گلینہ کار ریکارڈ دھوکس کی گاڑی اڑائے لیے جا۔۔۔“



”ہاں۔“ چمپا خوش ہوئی کہ مال کو واپس لے جانے میں کامیاب رہی، مگر اب مال حال میں آکر ماضی سے پیچھا چھڑا کر نکل بھگنا چاہتا تھا لیکن چمپا اس کے سامنے وقت کے ضمیر کی طرح بیٹھی تھی۔

دفعتاً مال کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ وقت کی آندھی میں پتے کی طرح ادھرا دھیر ڈول رہی ہے، اڑی جا رہی ہے اور وہ اس کو اپنی گرفت میں نہیں لاسکتا، وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”مال۔“ سرل نے سحر زدہ آواز میں اس سے کہا، ”مجھے کچھ اور بتاؤ۔“

”اور کیا بتاؤں؟“ اس نے رنج کے ساتھ جواب دیا اور بوٹ ہاؤس کی میڑھیوں پر جا کر کھڑا ہو گیا اور ندی کو دیکھتا رہا۔ ندی گومتی میں تبدیل ہو گئی۔

”مال۔۔۔ سنو۔۔۔“ چمپا نے کچھ یاد کر کے کہنا شروع کیا۔ ”رات کا سماں ہے۔ کتے بھونک رہے ہیں۔ سناٹا بازار بھر میں پڑا ہے۔ چڑیاں چنگن تک سوتی ہیں۔ چوکیدار خربوزوں کے کھیت بچارہے ہیں۔ باغبان گوندنی کے کھٹکھٹکے کو کھٹکھٹاتے ہیں۔ اب کوئی دم مین چکیاں چلیں گی۔“

”سرشار؟“

”ہاں۔“ وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

”ہم لوگ عموماً ہری شکر کے کمرے میں جمع ہوا کرتے تھے جو دراصل ایک برجی تھی۔“ مال نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ”اس کے نیچے دریا بہتا تھا۔ اس کمرے کی دیواروں پر ان گنت پرانے فوٹو گراف تھے اور دو ٹوٹے ہوئے صوفے۔ اس کمرے میں بیٹھ کر ہم نے لاتعداد کتابوں کے موضوع سوچے۔ دنیا

کے مسائل حل کیے۔ یہ کمرہ اور یہ گروہ ساری دنیا میں موجود ہے۔ زندگی ابھی بہت غیر واضح تھی۔ بہت سے پردے اٹھتے تھے اور گرتے تھے۔ (کبھی تیز روشنی اندر داخل ہوتی کبھی دھندلکے کا سایہ سامنے آ جاتا۔ اس ڈبئی دھوپ چھاؤں میں وقت نکلتا گیا)۔ کبھی تیز روشنی اندر داخل ہوتی کبھی دھندلکے کا سایہ سامنے آ جاتا۔ اس ڈبئی دھوپ چھاؤں میں وقت نکلتا گیا۔ اب پسندنا پسند کے بجائے عجز ہمارا رویہ بنتا جا رہا تھا۔ یہ رویہ احساس برتری نے پیدا نہیں کیا تھا۔ ہمیں یہ لگتا جیسے ساری انسانیت کے خون سے ہمارے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں، ہمیں اس خون کو دھونا ہے اور دیکھو کیا ہوا!“ اس نے ہاتھ آگے پھیلائے۔ ”ایک روز صبح کو ہم اٹھے اور ہم نے دیکھا کہ ہمارے ہاتھ واقعی خون سے رنگے ہوئے ہیں اور ہمارے وہ سارے کردار جن کا ذکر تم نے چمپا باجی سے سنا ہوگا، نوکل کارڈ کے کریکٹرز کی مانند ڈہین اور پراطف گفتگو کرنے والے نوجوان مارگ کا مطالعہ کرنے والی منی پوری ناچنے والی لڑکیاں، ہندوستان کی قدیم کلاسیکل تہذیب کا راگ الاپنے والے پوزیٹر۔۔۔۔۔ ان سب کو ہم نے دیکھا کہ خون میں رنگے ہوئے ہیں، مگر ہم میں سے بہت سے ایسے تھے جو اس خون کا کنارہ دینے کے لیے تیار نہ تھے، وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور مذہب کی بلندی اور خدا کی بزرگی کا چرچا کرتے ادھر ادھر بھاگ گئے۔ ان کرداروں کے علاوہ اور لوگ بھی تھے۔۔۔۔۔ حقیقی، اصل انسان۔“ اس نے چمپا کو دیکھا۔

”قدیر۔۔۔۔۔ اور قمرن؟“ چمپا نے کہا۔

کمال نے خاموشی سے اجازت چاہی کہ ان کا ذکر کرے، وہ اسے بے حد

مقدس ہستیاں معلوم ہوئیں۔

”ہاں۔ قدیر اور قمرن اور رام اوتار اور رام دیا اور ہمارے گاؤں کے کاشتکار اور ہمارے اکیلے والے اور پنواڑی۔ اور ہمارے زردوز جو چکن کاڑھتے کاڑھتے اندھے ہو جاتے تھے اور ہمارے باغوں کے کنجڑے اور پالکیوں کے کہار۔ یہ سب ہمارا پس منظر ہے جسے تم کبھی نہ جانو گے۔“ اس نے بات ختم کی۔

چمپا ابھی واپس نہ آئی تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا: ”وہاں اور ہمارے دریا۔ دریا بھی ایک مستقل کردار تھا اور ان کے نام۔ ذرا ان کے نام سنو: سر جو۔ شماردا۔ درگاوتی۔ مندکینی۔ مدھوتی۔ گومتی۔“

”گندھرو مالائیں جو ہماوت سے اتر کر بنوں میں بسنت رت منانے نکل آئی تھیں۔ طغیان صاحب نے کہا۔

کمال نے چونک کر انہیں دیکھا۔ اب تک وہ ان کے وجود سے بے خبر بیٹھا تھا۔ وہ چند لمحوں قبل آکر چوتھی ایسی ہوئی ڈونگی پر بیٹھ گئے تھے۔“

”ٹھیک ہے یار۔“ کمال نے آزرزدگی سے کہا۔ میں نے بھی ایک زمانے میں بڑی کوتاہی تھی۔ یہ اسٹیج سب پر آتی ہے۔

”تو دریا میرے گھر کے نزدیک تھا۔ گنگا میرے گھر کے پاس بہتی تھی۔ گومتی، ہری شکر کے گھر کے نیچے بہتی تھی۔ گومتی نے بتایا ہو گا کہ ہم لوگ ذرا سوچو، دریاؤں کے وجود سے کتنے بے نیاز رہتے ہیں۔ ارے پل دیکھو۔ کشتیاں۔ گھاٹ۔ سنگھاڑے۔ کنول کے پھول اور پھر ندی پر برستی

ہوئی بارش۔ یہ سب کتنی اہم چیزیں ہیں۔ مجھے سمندر سے وحشت ہوتی ہے۔ اس سے ڈر لگتا ہے۔ سمندر بیکراں ہے۔ ندی کو اپنا راستہ معلوم ہے۔“

اب دفعتاً چمپا کی آواز سے سال بھر ہونا شروع ہوا۔ لڑکیوں میں یہ کیا مصیبت ہے، اس نے سوچا، کہ ایک تو ہوتی ہی کبی ہیں، اگر ان پر یہ وحی آجائے کہ کلا کار بھی ہیں تو پڑا ہو گیا۔ چمپا باجی کلا کار نہیں تھیں لیکن ان کے شاعرانہ مزاج کا کون منکر ہو سکتا تھا!

وہ اس ندی کا ذکر کر رہی تھی اور مال بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ندی کا کردار؟ مجھے سے زیادہ اور کون یہ بات جان سکتا ہے، اس نے لرز کر سوچا۔ مجھے وہ مکان یاد ہیں، وہ ندی، وہ درخت۔ چمپا باجی تم خود \_\_\_\_\_

”اور باغ میں املتاس کے درخت تھے۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”اور ایک بیل کا درخت بھی۔ بیل تم نے کھایا ہے کبھی؟“ اس نے اوجہیت سے پوچھا۔ ”پورب کی خاص چیز ہے۔ مال، گوتم سے پوچھنا، اسے وہ ٹپ ٹپ کرتے بیل یاد ہیں؟“ اس نے بے اختیار ہو کر پہلی بار گوتم کا نام لیا۔

کمال سوچتا رہا۔ میں انہیں کیسے بتاؤں کہ گوتم ان کو تقریباً بھول چکا ہے، مگر بھولنا کیا معنی! ضرور یاد ہوں گی، جیسے اسے ندی یاد ہے اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور المٹاس کا درخت۔ اب بھی وہ اکثر بڑے جذبات میں ڈوب کر ان چیزوں کا ذکر کرتا۔ کیا مصیبت ہے۔ اس نے جھنجھلا کر چمپا کو دیکھا۔ یہ لڑکیاں مری کیوں جاتی ہیں؟ اصل میں \_\_\_\_\_ اس نے اطمینان سے ناگ پر ناگ رکھ کر سوچنا شروع کیا۔ \_\_\_\_\_ ان کو ہزار ہا برس سے اس کمپلکس میں بتاتا کر دیا گیا ہے۔ ایک سنا

ہے وہ سنی تھیں، پھر سیٹا، پھر گویوں کا فراڈ چلا۔ ان کو دنیا میں کوئی کام نہیں بس کسی بھلے مانس کو پکڑ کر دے اس کی پوجا۔ دے اس کی پوجاری نیک بختو، اللہ رسول سے دل لگاؤ، اگر محبت ہی کرنا ہے۔ رابع بصری سے سبق لو۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی پہنچی ہوئی پیپیاں گزری ہیں، لیکن یہ ساری سینٹ وینٹ خواتین بھی یہی سوچتی ہوں گی کہ اگر یسوع مل جائیں تو لے کر ان کے موزے رفو کر دیں۔ ”میں گوتم سے ضرور پوچھوں گا۔“ اس نے باوا زباند کہا۔ ”اور مجھے اپنے موزے بھی رفو کروانے ہیں۔“ اس نے اپنے پیروں پر نظر ڈال کر اسی رویں کہا۔ کل یوتھ فیسٹیول کے لیے جرمنی جا رہا ہوں۔ راتوں رات لندن پہنچ جاؤں تو طلعت میرا سماں سفر تھیک کر دے گی۔

”بہنوں کے ہونے کا یہ بڑا فائدہ ہے۔“ طغیان صاحب نے بات کی۔

”جی؟ جی۔۔۔“ مال نے جواب دیا۔ ”اُس لیے چمپا باجی اب اجازت

دیتے تھے۔ خدا حافظ مہر ل۔ اوچیت۔“

”پلو ہم تمہارے ساتھ ہی چلتے ہیں۔“ کمرل نے اٹھتے ہوئے کہا، وہ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ مال انٹیشن چلا گیا۔ چمپا نے اپنے ہوٹل کے کمرے میں آکر درپچہ کھولا۔ نیچے سنسان سڑک لیمپ کی نیلگوں روشنی میں خاموشی سے بہہ رہی تھی۔ سینٹ جان کے گھڑیاں نے گیارہ بجائے۔ دور جہیز لین میں کوئی شخص ٹرمپٹ پر اپنا غمگین نغمہ چھیڑا کیا۔

گھنٹی بجی تو طلعت نے دروازہ کھولا وہ مشرقی برلین کے ایک جدید وضع فلیٹ میں اپنی ایک سنگتراش دوست کے یہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ باقی کے سب لوگ ابھی ادھر ادھر سڑکوں پر گاتے بجاتے پھر رہے تھے۔ اس نے بالکنی پر سے جھانک کر دیکھا۔ پھولوں کی بیل کے نیچے نیم تاریک پورٹیکو میں دو سائے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے جلدی جلدی دوسرے سے کچھ کہا اور اسے اندر دھکیل دیا۔

نوارو اسٹوڈیو میں داغ ہوا تو طلعت نے اسے پہچانا یہ وہی نوجوان تھا جو چند روز قبل سینٹ جانز ووڈ میں روشن سے ملنے آیا تھا۔

”میں نے سنا تھا کہ مشہور سنگتراش فراؤلین کریمر یہاں رہتی ہیں۔“  
 ”آپ نے بالکل صحیح سنا تھا، لیکن ان کے بجائے میں موجود ہوں فرمائیے آپ کی کیا خدمت کی جاسکتی ہے۔ آپ کو سر چاہئے؟ تانا یا پلاسٹر آف پیرس؟“ طلعت نے بڑے پروفیشنل انداز میں جھاڑن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”جی۔ میں سر نہیں چاہتا۔“ اس نے سٹ پٹا کر جواب دیا۔ ”میری ایک دوست ہیں ان کو چاہئے۔“ پھر دفعتاً اس نے چونک کر غور سے طلعت کو دیکھا۔ جو اطمینان سے مجسمہ سازی کے لوازمات میں گھری کچھ کھڑپڑ کر رہی تھی فیسٹول کی وجہ سے کامریڈ کریمر کا کام خوب چمک گیا تھا۔ بھانت بھانت کے لڑکے اور لڑکیاں ہر قوم اور ہر ملک کے اس کے پاس آ رہے تھے وہ بے حد جذباتی ہو کر نیگرو اور ایشیائی لڑکوں اور لڑکیوں کے سر بناتی اور ان کو تحفہ دے دیتی۔ سخت مصروفیت کا زمانہ تھا۔ اسٹوڈیو میں برابر رت جگا رہتا۔ طلعت جسے آرٹ میں بھی دخل تھا اس

کی اسسٹنٹ بنی ہوئی تھی۔

نو وارو جب یہاں آ رہا تھا تو دوستوں نے اس سے کہا تھا کہ فراؤ لین کریئر بورڈوا آرٹسٹ نہیں ہے۔ اس سے فلرٹ کرنے کی کوشش نہ کرنا، وہ لیکچر پلائے گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے یا سارے مجسمے توڑ کر بھاگ کھڑی ہوگی اور تم کو دام بھرنے پڑیں گے۔

”اپنی دوست کو بلا لائیے۔ تاکہ میں ان کا مولڈ بنالوں۔ میں فراؤ لین کریئر کی پارٹنر ہوں۔“ طلعت نے جھک کر بڑے اخلاق سے کہا۔ اس نے ہنگرین لڑکیوں کا رنگ برنگی کڑھت والا قومی لباس پہن رکھا تھا جو اسے اسی روز تحفے میں ملا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اجنبی اس کو پیچانے کی بے انتہا کوشش کر رہا ہے لیکن اب تک پہچان نہیں پایا۔ اسے اس طرح اکیٹنگ کرنے میں بہت لطف آیا۔ ”اس الماری میں چاء کی پتی رکھی ہے۔ ادھر اسٹوو ہے۔“ آپ کافی بنائیے میں ابھی آتی ہوں۔“ اس نے بوہیمین انداز کی بے تکلفی کی نقل کرتے ہوئے کہا اور پلاسٹیسین نکالنے کے لیے اسکرین کی دوسری طرف چلی گئی۔ دروازہ کھلا اور ساجدہ بیگم اندر داخل ہوئیں۔

”ہلی؟“ انہوں نے اجنبی سے پوچھا۔

”نہیں، یہاں بھی نہیں ہے، مگر آہستہ بولو، شاید یہ لڑکی اردو سمجھتی ہو۔“

”کون لڑکی۔“

”وہ اسکلپٹر اس وقت نہیں ہے۔ اس کی اسسٹنٹ ہے۔ ہنگرین سی دکھائی

ہرتی ہے۔ مگر مجھے تو کچھ گھپا نظر آتا ہے۔ اس میں بھی۔“

اسکرین کی دوسری طرف سے طلعت کے اسکرٹ کی جھلک دکھائی دی تو اس نے ذرا گھبرا کر اونچی آواز میں کہا: ”اس بدتمیزی کو معاف کیجئے گا مادموزیل کہ ہم اپنی زبان میں باتیں کرنے لگے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ طلعت نے اسکرین کے پیچھے سے جواب دیا۔ ”مجھے اس کی ساؤنڈ بہت اچھی لگتی ہے، جیسے مکھیاں جھنجھناتی ہوں۔“

”مکھیاں؟“

”جی ہاں۔ یہ میں نے تھیہ استعمال کی۔ شہد کی مکھیاں۔ میں بہت عرصے ٹیونس میں رہی ہوں، وہاں عربی سنا کرتی تھی۔“

”ٹیونس میں؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ حبیب بورغیہ کے ساتھ۔“

”وہاں کیا کر رہی تھیں آپ؟“

”جاسوسی۔ طلعت نے اطمینان سے جواب دیا اور پلاٹیشن کا گولہ بنانے میں مصروف رہی۔“

ساحرہ بیگم کا رنگ سفید پڑ گیا۔ میں نے کہا تھا کہ مشرقی برلین نہ آنا۔ جانے کس مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ اب دیکھوں کہاں پھنس گئے انہوں نے اب تک ہالی ووڈ کی فلموں میں جو کچھ سنٹرل یورپ کے بارے میں دیکھا تھا وہ سب پل کی پل میں تصور میں کوند گیا۔ آرٹسٹوں کے بھیس میں خطرناک جاسوس۔ بین الاقوامی سازشیں۔ انگو اورینٹ ایکسپریس۔ وکی بام کا ”گریڈ ہوٹل“۔ کمیونسٹوں اور غیر کمیونسٹوں میں آمد کا مطلب سمجھتی ہے۔ اس نے بے چینی سے کرسی پر پہلو



بدلا۔

طلعت اسکرین کے باہر آئی۔

”ارے یہ تو طلعت بہن ہیں۔“ ساجدہ بیگم چلائیں۔ ”تو بہ ہے۔ تم نے یہ کیا روپ بھرا ہے۔ اچھا یہ قوف بنایا۔“

”ہلو، ساجدہ آپا۔“ طلعت نے شنگی سے کہا۔ ”بیٹھے۔ ابھی آپ فرسٹ کلاس مولڈ بناتی ہوں۔ آپ نے کافی تیاری کر لی؟“ اس نے ساجدہ بیگم کے ساتھی سے دریافت کیا۔

”معاف کیجیے گا میں نے بھی آپ کو بالکل نہیں پہچانا تھا اس لباس میں۔ لندن میں بھی آپ سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ صرف آپ کا ذکر بہت سنا ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔ آپ کی یہاں تشریف آوری کیسے ہوئی؟ میں نے دیکھا تھا آج آپ پولش لڑکیوں سے بہت برادرانہ سلوک کر رہے تھے۔“

”وہ۔۔۔۔۔ تو میں ذرا ان لوگوں کا جھوٹ سچ معلوم کرنے آیا ہوں۔ میں ایک انگریزی اور دو اردو اخباروں کے لیے لندن لیٹر لکھتا ہوں۔ یہاں سے جا کر ان لوگوں کی قلمی کھولوں گا۔“

”تم ان سے پہلے کبھی نہیں ملیں۔“ ساجدہ نے کہا۔ ”بڑے مشہور جرنلسٹ ہیں۔“

”جی اور ساجدہ آپا آپ یہاں کیسے۔“

”میں۔۔۔۔۔ میں ذرا ان لوگ کا۔۔۔۔۔“

”جھوٹ سچ معلوم کرنے آئی تھیں!“

”بالکل انہوں نے جواب دیا۔“

”مگر ساجدہ آپا — اور آپ“

”خان۔“

”مسٹر خان — مجھے واقعی بڑا افسوس ہے کہ آپ روشن کاتعاقب کرتے  
یہاں تک آئے مگر وہ نہ ملی، وہ یہاں کبھی نہیں آئی، اگر آ جاتی تو اس کے لیے اچھا ہی  
تھا۔ اتنی شدت سے الجھی ہوئی نہ رہتی، مگر وہ عین اس لمحے سائز برگ میں  
موزارٹ کی موسیقی سن کر اپنی روح کو فائدہ پہنچا رہی ہے۔ جہاں تک میرا خیال  
ہے۔“

”کیسا تعاقب بھی — کیا اڑ رہی ہو۔“ ساجدہ نے خفگی سے کہا۔

”نہیں تو — اچھا ہے ساجدہ آپا یہاں ایک سے ایک تختے آپ کو ملیں گے۔  
پندرہ دن تک وہ وہ خاطر مدارات ہوگی جس کا ٹھکانہ نہیں۔ مفت کی تفریح — کیا  
خرج ہے۔ آپ لوگ نے ان ممالک کو نہ جانے کیوں ہوا بنا رکھا ہے۔“ وہ سرعہ  
سے ان کی ناک بتاتے ہوئے بولی۔

”یہ مشغلہ آپ نے کب شروع کر دیا۔“ مسٹر خان نے کہا۔ ”مجسمہ سازی۔“

”جی۔ مشغلوں مشغلوں کی بات ہے۔ بعضوں کا مشغلہ بخیری ہوتا ہے۔“

ساجدہ نے گھڑی دیکھی: ”اب چل دوں — جہاں ہم ٹھہرے ہیں وہاں

کھانے پر انتظار ہو رہا ہوگا۔“

”بہت خوب دوسری سٹنگ کب دیجیے گا؟“

”میں فون کر دوں گی۔“

”بہت اچھا۔“

وہ بالکنی میں سے ان دونوں کا جاتے دیکھتی رہی۔ پھولوں کی بیل پھر جھک آئی جس کے سائے میں ”مسٹر خان“ ایک لمحے کے لیے گم سم کھڑا رہا، پھر ساجدہ بیگم کے پیچھے پیچھے بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔

واپسی پر وہ لوگ فرانس کی سرحد عبور کر رہے تھے جب ٹرین میں کسی نے بتایا کہ روشن پکڑ لی گئی۔

”کیا چنڈو خانے کی اڑاتے ہو۔“ طلعت نے آرزو ہو کر کہا۔ ”وہ سیاسی کبھی نہیں تھی۔ آخر اس کے پکڑے جانے کی کیا تک ہے۔ یہ ایک یار لوگوں نے اس کے لیے افواہیں پھیلا رکھی ہیں خواہ مخواہ اور پکڑے جانے کا مطلب؟ وہ اسمگلنگ کرتی تھی؟ بم بناتے تھی؟ امریکہ کے اہم رازروں کو اور پاکستان کے اہم راز ہندوستان کو بتاتی تھی؟ آخر کیا کر رہی تھی بھائی؟ اس غریب کو اپنے فلسفے ہی سے فرصت نہیں۔ اس کو یہ تک معلوم نہیں کہ نور تھو امر نیشنل۔“

”اصل خیالات سے کیا ہوتا ہے۔ اصل خیالات کی تصویر تو نہیں لی جاسکتی۔“ گوتم نے اس کی بات کاٹی، وہ مغربی جرمنی کے سفارتخانے میں کسی کام سے آیا ہوا تھا اور راستے میں ان کے ساتھ ہو گیا تھا۔ ”تم افواہوں کی نفسیات کو نہیں جانتیں اور اسٹیر یوٹائپ کی طاقت، اگر میں مستقل تمہارے لیے پروپیگنڈہ کروں کہ تم طلعت رضا نہیں ہو دراصل دلائی لامہ کی جانشین ہو تو واقعی تمہیں دلائی لامہ کی جانشین سمجھا جائے گا۔ ہماری زندگیوں کا جھوٹے مفروضوں اور غلط پروپیگنڈے پر انحصار ہے۔ روشن تو بہت غیر اہم ہستی ہے۔ پوری قوموں، سموچے

ملکوں کے خلاف اسٹیر یونائپ کا حکم چلتا ہے۔ یہ آج کی دنیا ہے۔ طلعت آرا بیگم جس میں فن کاروں کے علاوہ طالب علموں کی تو سب سے بڑی قیمت مقرر ہے۔“

”اب میں نے دیکھا کہ پروپیگنڈہ کسے کہتے ہیں۔ مال ہے بھی۔ روشن غریب، جس کے کوئی سیاسی خیالات کسی قسم کے ایک سرے سے ہیں ہی نہیں، اس کو اتنی اہمیت دی جا رہی ہے کہ دو بھلے آدمی اس کے پیچھے پیچھے برلین تک آئے گو وہ ان کو تپ بھی نہ ملی۔“

”مگر اس بہانے ان دونوں نے تفریح تو کرنی۔“

”سنا ہے روشن کے والد بہت بیمار ہیں۔ مجھے یون میں کوئی بتا رہا تھا۔ ممکن ہے ان افواہوں سے اس کی اسکا لرشپ پر بھی اثر پڑے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کراچی کی سیاست کا اس میں کافی دخل ہے۔“ ایک لڑنے نے کہا۔

”وہ کس طرح؟“ طلعت نے پوچھا۔

”سنا ہے کوئی مرکزی وزیر ہیں جو روشن کے والد کے خلاف ہیں۔ یا شاید روشن کے والد مرکزی وزیر کے خلاف تھے۔ ایسا کچھ سلسلہ ہے۔ بہر حال تو وہ سول سروس کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کو ویسے ہی کسی پچھلے وزیراعظم نے کوئی بہت بڑا عہدہ دے دیا تھا۔ اب ان وزیراعظم کے جانے کے بعد روشن کے والد کے خلاف بڑا محاذ قائم ہو رہا ہے۔ ممکن ہے روشن بے چاری کے خلاف جو مضحکہ خیز کارروائی کی جا رہی ہے اس کا اس محاذ سے کچھ تعلق ہو۔“

”یا اللہ۔“ مال نے گڑبڑا کر کہا۔ ”اس قسم کے حالات ہیں؟“

”ہیں تو سہی۔“ حمید نے جواب دیا، وہ سب کھڑکی سے باہر بھاگتے ہوئے

سبزہ زاروں کو دیکھتے رہے۔

۷۸

شیو پرشاد بھٹ ناگر رنجو بارہ بنکوی ان لوگوں میں سے تھے جو لندن میں برسوں سے برس سے خود اختیاری جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ رنجو صاحب دوسری جنگ عظیم سے پہلے بارہ بنکی سے اوکسفرڈ آئے تھے۔ تعلیم ختم نہ کر پائے تھے کہ جنگ چھڑ گئی اور یہ یہیں رہ پڑے۔ ایک عدد لیٹوین یا لیتھونیائی لڑکی سے شادی کر لی۔ سخت موڈی اور کاہل آدمی تھے۔ بی بی بڑی نیک بخت ثابت ہوئی وہ اب یورڈنگ ہاؤس چلاتی تھی۔ جس ہندوستانی یا پاکستان کو کہیں ٹھکانہ نہ ملتا وہ سیدھا یہیں آ جاتا۔ رنجو صاحب بہت ہی شریف آدمی تھے۔ سب کی بہت خاطرین کرتے۔ اکثر مہمان ان کا بل ادا کیے بغیر ہی بھاگ جاتے مگر رنجو صاحب ان کی شکایت نہ کرتے۔ اتر پردیش سے اگر کوئی چوہا بھی آ نکلتا تو اس کے لیے بچھ بچھ جاتے۔

ہمراذ فیض آبادی ان کے مکان کی اوپر کی منزل میں ان کے کرائے دار تھے۔ رنجو بارہ بنکوری ہندو تھے اور ہندوستانی ہمراذ فیض آبادی مسلمان تھے اور بڑے کٹر پاکستانی۔ تھے دونوں شاعر۔ ایک دوسرے سے مستقل بحث کرتے۔ رنجو صاحب کہتے: تم لوگوں نے ہندو شعراء کی کبھی اتنی قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے۔ تم علی گڑھ والوں نے فرقہ پرستی کا زہر پھیلا یا وغیرہ یا رامائن فرحت لے کر

بیٹھ جاتے اور بیسز کے چند گلاسوں کے بعد روہانے ہو کر کہتے تم پیچھے مسلمسے ہو، تم نے بھارت ماتا کے کلڑے کر ڈالے۔ اس پر ہماز بھائی بھارت ماتا شان میں کچھ گوہرافشانی کرتے۔ شیو پر شاد عروتے روتے کہتے: یہ شعر سنو۔ کل رات ہوا ہے۔ شعر سن کر ہماز بھائی کہتے: ہاں یا راجھا ہے مگر ذرا بوئے کچوری و پینک می آید۔ اس پر دوبارہ فساد شروع ہو جاتا۔ روز رات کو کھانے کے بعد یہ سلسلہ رہتا۔ ایک بات میں رنجور اور ہماز دونوں اپنے سارے اختلاف چھوڑ کر متفق تھے وہ تھی پنجابیوں کے لیے ان کی ناپسندیدگی۔ اس موضوع پر دونوں گھنٹوں باتیں کرتے نہ تھکتے۔ گوہماز بھائی بڑے شعلہ بد اماں پاکستانی تھے مگر بہر حال آبائی وطن اتر پر دلش تھا کہتے: ارے، یہ پنجابی گھڑ سوار، رسالدار اردو کیا جانیں! شیو پر شاد بڑے زور شور سے ہاں میں ہاں ملاتے۔ ان کی پہلی ہندو بیوی سے جو لڑکی ہندوستان میں تھی اس نے کسی پنجابی سے شادی کر لی تھی اور چندی گڑھ میں رہتی تھی۔ جس روز اس کی شادی کی اطلاع آئی شیو پر شاد صاحب نے خاص طور پر آ کر ہماز بھائی کو اس سانحے کی اطلاع دی۔

”لومیاں ہمارے خاندان کی زبان بھی بگڑ گئی۔ آخر ہم پنجاب گردی سے کہاں تک بچے رہتے۔“ ہماز بھائی اس صدمہ میں ان کے دلی شریک رہے کیونکہ خدا نخواستہ کل کو ان کی بہن کی شادی بھی کسی پنجابی سے ہو سکتی تھی۔ رنجور صاحب کی ان محفلوں میں ان کے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے اتر پر دلش والے ہندو مسلمان ہندوستانی اور پاکستانی بیٹھ کر اپنے وطن کی بزرگی بیان کرتے، اس عظیم کلچر پر روشنی ڈالتے اور شعر پڑھتے ایک روز مال اس محفل میں گیا تو اس کو

بڑی حیرت ہوئی۔ ”کس قدر غیر منطقی ہیں آپ۔“ اس نے ہمراز بھائی سے کہا۔  
 ”آپ کا وطن پاکستان ہے۔ آپ کو اب یو۔ پی سے مطلب؟“  
 ”اجی وہ تو ٹھیک یہ۔۔۔ مگر۔۔۔“ ہمراز بھائی نے گڑبڑا کر کہنا شروع کیا۔

”ٹھیک کیا ہے؟“ کمال نے ان کی بات کاٹی۔ ”اسی لیے تو پاکستان میں یو۔ پی والوں کی وفاداری پر شبہ کیا جاتا ہے۔ دل انکا ہوا ہے فیض آباد میں ملازمت کرتے ہیں کوئٹے میں اور پاسپورٹ ہوا کراہاں بیگم سے ملنے فیض آباد جاتے ہیں تو وہاں خفیہ پولیس پیچھے لگ جاتی ہے۔ ادھر پاکستان میں کہا جاتا ہے کہ یہ مہاجر لوگ سارے کے سارے ملک سے فائدہ اٹھانے کے لیے آگئے ہیں ورنہ ان کا اصل وطن تو بھارت ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ بھائی نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ کس قدر دیوانی قوم ہے مسلمانوں کی۔ حد ہے واللہ!“

”میاں صاحبزادے، زیادہ بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔“ ہمراز بھائی نے جواب دیا تھا۔ ”بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ تم ہندوستانی مسلمان ہو یا د رکھو جب وہاں ملازمت نہیں ملے گی اور بھوکے مرنے لگو گے تو دھکے کھا کر پاکستان ہی کا رخ کرو گے۔“

غالباً ہمراز بھائی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اس نے لرز کر ان کی صورت دیکھی۔ اس وقت رنجور صاحب پان کی گلیوں میں بنا بنا کر خاصداں میں رکھتے جا رہے تھے۔ پان ایک بڑی مقدس شے تھی جو کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز ہر پچھتے ہمراز بھائی کے لیے لندن آتی تھی اور بطور تبرک رنجور صاحب کو صبح شام اس کے دو بیڑے

کھلائے جاتے تھے۔ پان بنانے کے مقدس فریضے کو بڑے اہتمام سے تکمیل تک پہنچانے کے بعد رنجور بارہ بنکوری مال کی طرف مڑے اور ملول آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے۔

”مصیبت یہ ہے مال میاں“ انہوں نے اپنے خوبصورت لہجے میں اواسی سے کہا، کہ تم شاعر ہو۔ ہر نو جوان شاعر ہوتا ہے۔ اصول پرست۔ راست باز۔ تصورات پر مر مٹنے والا، وہ حقیقت کو نہیں دیکھنا چاہتا۔ مگر بد قسمتی سے دنیا کا نظام شاعر نہیں سیاست دان چلا رہے ہیں جن کو تمہارے وژن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ تم حقیقت سے کس حد تک سمجھوتہ کرنے پر تیار ہوتے ہو۔ تمہاری اصل بڑائی یا گھٹیا پن اس وقت ظاہر ہوگا کہ تم نے حقیقت سے، یعنی بے ایمانی سے، جھوٹ سے، ریا کاری اور اخلاقی جرم سے کس حد تک سمجھوتہ کیا۔“

طلعت اور مال وغیرہ کی سرگرمیوں کو رنجور صاحب بہت سراہتے تھے۔ اقبال یونگ میں جا کر انہوں نے اقبال کے فلسفے پر تھیری کی۔ لندن مجلس کو ہمیشہ مختلف قسم کے عطیے اپنی بساط سے بڑھ کر دیتے رہتے حالانکہ رنجور صاحب کی مالی حالت اتنی خستہ تھی کہ اپنے مکان کی مرمت تک نہ کروا سکتے تھے۔ اس غربت کی زیادہ وجہ یہ تھی کہ جیسا کہ پہلے لکھا گیا، ان کے اکثر کرائے دار ان کو کرایہ دیے بغیر ہی غائب ہو جاتے اور یہ اپنے مہمانوں سے بے حد واجبی پیسے لے کر انتہائی بڑھیا کھانے انہیں کھلاتے۔ سویت کس قدر کریک ہیں رنجور صاحب۔ طلعت نے ایک روز کہا تھا۔ ایسے لوگوں کی دنیا میں جگہ کہاں ہے؟ ان کی بی بی مایا (ان کا اصل نام یہی تھا اور رنجور صاحب نے اس نام کی بنا پر اپنے ایک مضمون میں، جو ۱۹۳۹ء میں زمانہ کا



رنجور میں چھپا تھا، یہ ثابت کیا تھا کہ لیٹوین لوگ دراصل ہندو تھے۔ بعد میں جب  
 جدید تحقیقوں سے یہ ظاہر ہونے لگا کہ غالباً آریوں کا اور ریتھنل وطن بالٹک کی  
 طرف تھا اور سنسکرت اپنی اصل حالت میں انہی علاقوں میں بولی گئی تھی تو رنجور  
 صاحب نے طے کر لیا۔ وہ خود بہت بڑے محقق ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اب  
 وہ تاریخ پر ایک کتاب لکھنے والے ہیں۔ پچھلے پندرہ برس سے وہ اس کتاب کی  
 تصنیف میں مصروف تھے مگر وہ ابھی پہلے چند ابواب سے آگے نہ بڑھی تھی۔ اس  
 تحقیق کے لیے ان کو آئرلینڈ کا سفر درکار تھا جہاں اشومیدھ عبدعزیز میں منایا جاتا  
 تھا اور بالٹک کے ممالک کا جہاں اندر کی پوجا ہوتی تھی، مگر اس سفر کے لیے جو  
 روپیہ چاہیے وہ رنجور کبھی فراہم نہ کر پاتے لہذا وہ کتاب ابھی نامکمل تھی (بڑی  
 خاموش طبع اور گھریلو خاتون تھیں اور چند سال قبل بے حد خوبصورت رہی ہوں گی۔  
 (انجور صاحب خود کافی خوش شکل تھے) ان کا سارا وقت میاں اور بچوں کی خدمت  
 اور کھانا پکانے میں گزرتا۔ دن بھر وہ مشین کی طرح کام کرتیں۔ طلعت وغیرہ کے  
 گروہ کو ان سے بہت ہمدردی تھی۔ رنجور صاحب کو اپنی تاریخ کی کتابوں اور  
 شاعری ہی سے چھٹی نہ ملتی تھی جو وہ مایا کی طرف توجہ کرتے، وہ ٹھیٹھ ہندوستانی پتی  
 ورتا عورتوں کی طرح چپ چاپ باورچی خانے میں گھسی رہتی یا کپڑے دھوتیں۔  
 زندگی یونہی گزرتی جا رہی تھی کہ شیو پر شاد بھٹ ماگر رنجور بارہ بنکوی کے  
 بورڈنگ ہاؤس میں ایک نوجوان پارسی طالب علم آن کر نکا۔ لڑکیاں جرمنی سے  
 لوٹ کر آچکی تھیں اور اب قاضی نذرا الاسلام کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع  
 ہو رہی تھی۔ ان کے علاج کے لیے روپیہ فراہم کرنے کے سلسلے میں ایک ورائٹی

پروگرام ترتیب دیا جا رہا تھا جس کی تیاری کئی مہینے قبل سے شروع ہو چکی تھی۔ ہار  
 لے اسٹریٹ کے ڈاکٹروں کی فیسیں بہت زیادہ تھیں، شاید ان کو وہی آنا بھی لے  
 جایا جائے۔ لڑکوں اور لڑکیوں نے طے کر لیا تھا کہ ان کا علاج پوری طرح سے  
 کرا کر رہیں گے۔ ان کے ہمراہ کی بی بی کے علاوہ ایک طے کر لیا تھا کہ ان کا علاج  
 پوری طرح کرا کر رہیں گے۔ ان کے ہمراہ ان کی بی بی کے علاوہ ایک بہت بڑی  
 پارٹی تھی۔ ٹوئینگ میں ان کو ٹھہرایا گیا تھا جہاں وہ گم سم بیٹھے بچوں کی طرح حیرت  
 زدہ سب کو دیکھتے رہے۔ ان کا دماغ ماؤف تھا۔ ان کی بی بی کے اعضاء مغلوج  
 تھے، وہ نزدیک ایک پلنگ پر لیٹی رہتیں۔ ان کا گھر رنگانی طلباء کے لیے زیارت گاہ بنا  
 ہوا تھا۔ یگور کے لیے ہمارے دلوں میں بے پناہ ہوا تھا۔ یگور کے لیے ہمارے  
 دلوں میں بے پناہ عزت ہے اور نذرل کے لیے ٹپ پر نکل کر لڑکے اور لڑکیاں  
 مختلف ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔ طلعت اور فیروز نے پہلے سوئس کا میج کا رخ کیا  
 جہاں رنجور بارہ بنکوری رہتے تھے۔

مکان کے زینے پر ان کو ہمراز بھائی مل گئے۔ ”ہمراز بھائی! لایئے  
 پیسے۔“ طلعت نے دست سوال دراز کیا۔  
 ”یہ طالب علم کیوں نذر الاسلام کے لیے اتنے بے حال ہوئے جا رہے ہیں۔  
 ہمراز بھائی نے کہا۔

”یا اللہ۔۔۔ ہمراز بھائی۔“ طلعت نے کہنا شروع کیا۔ اوہریہ لوگ ہمراز  
 بھائی سے بحث میں الجھ رہی تھیں عین اسی وقت علامہ رنجور بارہ بنکوی کی زندگی  
 میں ایک قیامت پھا ہو گئی۔

دریچوں کے شیشے ڈوبتے سورج کی روشنی میں قرمزی نظر آرہے تھے۔ رنجور صاحب فکر و شرع میں مبتلا مکان کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ نیچے تہ خانے میں تیز روشنی ہو رہی تھی جہاں مایا عموماً اس وقت روزانہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف دکھائی دیتی تھیں۔ ٹھیک اس سے رنجور صاحب کو جانے کیا نظر آیا کہ سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور وہ تیر کی طرح تہ خانے میں پہنچے۔

ہال کے زینے پر کھڑے ہو کر طلعت اور فیروز تہ خانے میں ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی وہ دونوں دوڑی ہوئی نیچے گئیں۔ مایا خون میں لت پت فرش پر پڑی تھیں۔ ان کے سر میں سخت چوٹ آئی تھی اور ان کی بڑی لڑکی قریب کھڑی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ رنجور صاحب دروازے میں صدم کلم کھڑے تھے۔

”کیا ہوا؟“ طلعت نے دہل کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ انہوں نے سکون سے جواب دیا۔ ”زینے پر سے ان کا پاؤں رہٹ گیا۔ فکر مت رکو۔“ پھر وہ خاموشی سے اوپر چلے گئے۔

دوسرے لمحے اوپر کی منزل سے اتنے ہی زوردار دھماکے کی آواز آئی۔

لڑکیاں بوکھلاہٹ میں دوڑی ہوئی اوپر پہنچیں۔ جتنی دیر میں طلعت نے ۹۹۹ کو فون کر کے ایمبولینس منگائی اتنی دیر میں رنجور صاحب ہوشنگ ماچس والا کی ٹھکانی بھی اچھی طرح کر کے فراغت پا چکے تھے۔ ہماز بھائی اور دوسرے لوگ ہاں ہاں کرتے اپنے اپنے کمروں سے بچ بچاؤ کے لیے دوڑے مگر رنجور صاحب نے ہڑبڑاہٹ میں ایک ایک جھانپڑ ان سب کو بھی رسید کیا اور اسی سلسلے میں ہماز

بھائی سے باقاعدہ ان کے دو دو ہاتھ ہو گئے۔ لینڈنگ پر جہاں یہ ہنگامہ ہو رہا تھا اندھیرا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمراز بھائی اور رنجور صاحب دونوں ایک دوسرے کو ہوشنگ ماچس والا سمجھے۔

اب رنجور صاحب سے کہا گیا کہ وہ قریب کے پب سے اپنی بے چاری بی بی کے لیے تھوڑی سی برانڈی لے آئیں۔ یہاں برانڈی کا انتظار ہوتا رہا لیکن معلوم ہوا کہ وہ خود ہی پب میں شغل کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ طلعت مایا دیوی کو ہسپتال لے گئی۔ فیروز کے بچوں کو پچکارنے میں مصروف ہوئی۔ ہوشنگ ماچس والا نے اسباب باندھ کر ٹیکسی منگوائی اور وہاں سے کان دبا کر بھاگا۔

اس ہڑبونگ میں نسیم بانو سے ملنے کا وقت نکل گیا۔ مایا بھٹ ناگر کی مرہم پٹی کروانے کے بعد طلعت اور فیروز مائٹس برج کے ایک بہت بڑھیا فلیٹ میں پہنچیں جہاں نسیم بانو کی والدہ سیٹ تک شادی کیوں نہیں کی؟ کب تک پڑھتی رہو گی؟ اب شادی کر ڈالو اور نسیم بانو نے پکوڑے تل کر کھائے مگر چندے کے نام کا ایک پیسہ بھی نہ دیا۔

دونوں غصے میں بڑبڑاتی نیچے اتریں۔ اب کون سے فلم اسٹار کے پاس جائیں۔ سڑک پر کھڑے ہو کر انہوں نے سوچا۔

یہ فلم والوں کا سلسلہ طلعت کو ہمیشہ بور کرتا تھا کیونکہ جب سے انڈین فلم انڈسٹری کی ترقی ہوئی تھی آئے دن کوئی نہ کوئی بڑا فلم اسٹار لندن آ پہنچتا۔ ایشین فلم سوسائٹی میں اسے بلایا جاتا۔ ان کی پبلٹی سے ہندوستان کی پبلٹی ہوتی تھی۔ اس پبلٹ کے ریکٹ نے دماغ چکرا دیا ہے۔ طلعت کہتی۔

”چلو چل کر مایا دیوی کی خیریت معلوم کر لیں۔“ وہ اٹے پاؤں سوکس کانچ گئیں۔ فیروز پر اس وقت ڈیپریشن کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

”حد ہے یار۔“ اس نے کہا۔

”ہاں یار حد ہے۔“ طلعت نے جواب دیا۔

ہمراز بھائی کے فلیٹ میں بہت چہل پھل تھی۔ ساری عمارت کے مکین، یعنی رنجور صاحب کے مہمان، ہاں جمع زور شور سے اس غیر متوقع اور عجیب و غریب واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کمال بھی موجود تھا، وہ طلعت کو دھونڈتا ہوا ادھر آ نکالتا تھا۔

”ہیڈ کوارٹر میں تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ تم لوگ کہاں رہ گئی تھیں بھئی۔“ اس نے کہا۔

”مسز بھٹ ناگرا ب کیسی ہیں بھابھی؟“ طلعت نے ہمراز بھائی کی بی بی سے پوچھا۔

”مگر صاحب۔۔۔ رنجور جیسا مرنجا مرنج اور بھگت آ دی، جو کبھی اونچی آواز میں بول کر نہ دے، اور کیا پہلوانی داؤ دکھائے ہیں میرے شیر نے۔ مجھے تو ایسا جھانپڑ دیا ہے کہ اب تک دماغ جھنارہا ہے واللہ!“ ہمراز بھائی نے خوش ہو کر داد دی۔

”مگر یہ ہوا کیا؟“ ایسی پتی ورتا عورت۔۔۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

”اور وہ خود کیسا تھا۔ مرگلا بالکل۔ پیلی چھکلی ایسا۔ لا حول والا۔۔۔ وہی ماچس والا۔۔۔“ ان ڈاکٹر صاحب کی بیگم نے کہا۔

”مطب یہ کہ انسان کے اندر جو طوفان چھپے ہیں ان کا اندازہ کیسے ہو سکتا

ہے۔“ کمال نے آہستہ سے کہا۔ ”رنجور صاحب کا طوفان۔ مایا دیوی کا طوفان۔ ہم سب کتنے بڑے جوالا مکھی پہاڑ پر زندہ رہتے ہیں۔ حد ہے بھی۔“

اسی وقت دروازہ کھلا اور رنجور صاحب دہلیز میں کھڑے، نظر آئے۔

”آئیے آئیے۔“ ہر ایک نے کہا، مگر سب اپنی اپنی جگہ بہت نادم محسوس کر رہے تھے۔

انہوں نے اندر جھانک کر چاروں برف دیکھا۔ ”نہیں۔ میں آپ لوگوں کے تبادلہ خیالات میں تخل نہیں ہونا چاہتا۔ ایسے ہی اوھر آگیا تھا۔ خدا حافظ۔“ دوسرے لہجے وہ غائب ہو گئے۔

شیو پر شاد بھٹ ناگر کئی دن تک گھر نہ لوٹے ان کی بی بی اسی طرح سر پر پی باندھے خاموشی سے کپڑے دھونے اور کھانا بنانے میں مصروف ہو گئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

چند روز بعد شیو پر شاد بھٹ ناگر رنجور بارہ بنکوی ٹیمز کے کنارے سردی میں ٹھٹھہرے ہوئے پائے گئے۔

بہل چودھری بھی پہنچ چکے تھے اور نذ الاسلام کے پروگرام میں تعاون کر رہے تھے۔ ان کا نور بری طرح فیل ہوا تھا، پھر وہ بیمار پڑے۔ ان کو بے حد خراب پریس ملا۔ ہر نقاد نے ’پاکستانی‘ اور ’ہندوستانی‘ رقص کا موازنہ کر کے سوال اٹھایا کہ ان

میں کیا فرق ہے حالانکہ فنون لطیفہ اور جمالیات کے سرکاری ماہرین ان کے متعلق اپنے عجیب و غریب نظریوں سے پریس کی تواضع کرتے رہے تھے۔

کئی مہینے ڈرامے اور میلے کی تیاری میں گزر چکے تھے۔ نذرالاسلام کے لیے اتنا پیسہ اب تک اکٹھا نہ ہو سکا تھا کہ ان کا باقاعدہ علاج کروایا جاتا۔ ”نذرل ایڈ کمیٹی“ میں سر پھرے طالب علموں نے کھیر اور اصفہانی کو اکٹھا کر دیا۔ (کم از کم ان کے نام سر پرستوں کی حیثیت سے پروگرام کی کتاب پر برابر برابر چھپ گئے) کمیٹی کے صدر ہندوستان ہائمنر کی شریعتی ایڈاسین تھیں۔ نائب صدروی۔ کے۔ کرشنا مینن۔ ان کے علاوہ اس کمیٹی میں امرت بازار پتریکا کے سندر کباڈی بھی تھے اور ڈان کے نسیم احمد بھی۔ (یہ اجتماع ضدین\_\_\_\_\_ نذرل دادا تمہارا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ کمال نے کہا)۔ اس مرتبہ پی ایس ایف اور لندن مجلس نے مل جل کر کام کیا۔ پچھلے سال دونوں جماعتوں نے مل کر بڑی دھوم دھام سے ایشین اسٹوڈنٹس کانفرنس منعقد کی تھی جس میں عرب اور اسرائیل طلباء کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ (عالمگیر امن اور بھائی چارہ سب فراڈ ہے۔ ان لوگوں کے بھرے میں مت آنا۔ عامر رضا نے ایک کاک ٹیل پارٹی کے دوران روشن سے کہا تھا)۔

اب ان لوگوں کے ذہنوں میں صرف ایک خیال تھا۔ ہم نذرل دادا کو اس بے کسی کے عالم میں مرنے نہ دیں گے۔

پروگرام میں پدما کے سیلاب کی داستان موسیقی اور تمثیل میں پیش کی جارہی تھی۔ گھنٹوں رقص، گیتوں اور مکالموں کی ریہرسل کی جاتی۔ ایک ایک نکتے پر

بحث ہوتی۔ کاسٹ بے انتہا لمبی چوڑی تھی۔ دھان پھٹکنے والی لڑکیاں۔ بھٹیالی گانے والے ملاح۔ سیلاب کی زد میں خزاں کے پتوں کی طرح بہتے اور ڈوبتے ہوئے کسان۔ سرکاری لنگر خانے کے سامنے کھڑے ہوئے بھوکے پناہ گزینوں کی قطاریں۔

”افوہ۔ کس قدر خوفناک.....“ رو میں نک بل نے نیم تاریک آڈیٹوریم میں ایک کرسی پر نیم دراز ہو کر سامنے روشن اسٹیج پر ریسرسل دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ ٹریجڈی سے محفوظ ہوتے ہو۔“

”موت سے تو ہماری بڑی دوستی ہے بل کریگ۔“ طلعت نے اسکرپٹ کے کاغذات ایک طرف ڈال کر فرش پر اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ہماری پوری نسل تو صریحاً عاشق ہے موت پر۔ تم باہر کے دشمنوں سے لڑتے تھے پر ابھی چند سال ہمارے گھر کے آنگن میں ایک خونریز جنگ ہوئی تھی اور وہ جنگ بہت سارے محاذوں پر اب تک جاری ہے اور روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے۔ یہ سامنے والی ٹریجڈی ہمارے لیے گویا روزمرہ کے معمولی واقعات میں شامل ہے۔ بہت سوں کو تو اس ٹریجڈی کا احساس تک نہیں۔“ طلعت نے ترشی سے بات جاری رکھی۔ ”اور بہت ممکن ہے ابھی جس وقت میں تم سے یہ باتیں کر رہی ہوں، یہ سیلاب کا منظر مشرقی بنگال میں جج جج لوگوں کو نظر آ رہا ہو۔“

چھن چھن کرتے ہبل کے ٹروپ کے افراد ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔

”سیلاب کے منظر میں سریلزم چلاؤ جھوڑی سی۔“ اسٹیج کی پروپس کے انبار میں سے سر نکال کر زرینہ چلائی۔



سر بلزم چلائی گئی۔ ڈراما پروڈکشن کی جدید ترین تکنیک نہایت زوروں میں ہر طرف استعمال کی جا رہی تھی۔ پیچھے گیلری میں فریدہ لڑکیوں کو دھان پھٹکنے والے ایک گیت کی شق کر رہی تھیں:

”\_\_\_\_\_ بیٹا مائی رے جولدی جولدی \_\_\_\_\_ بیٹا مائی \_\_\_\_\_“

بالآخر فرسٹ ٹائمٹ، آن پنچی گرین روم کی گہما گہمی۔ آخری منٹ کی گھبراہٹ۔ کاسٹ کے افراد کی طرف سے فکر۔ جانے کون کہاں پر کوئی ہاؤ لروے۔ ویسٹ انڈ کی پروفیشنل اسٹیج کے اہم افراد کو مدعو کیا گیا تھا۔ پریس والے سامنے کی قطاروں میں بڑی انتہاک سے بیٹھے اسٹیج کو دیکھ رہے تھے۔ ڈرامہ کرنے والے اس شہر کے پریس اور تماشاخیوں کے رد عمل کے عادی تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کل صبح مانچسٹر گارجین اور ڈیلی اسکیچ میں کس طرح نوٹس نکلیں گے۔

اترول کے دوران میں بہت سے لوگ گرین روم میں آگئے۔ دھان پھٹکنے والی لڑکیوں کا گروہ بالوں میں پھول اڑے، سنبھال طرز کے جوڑے بنائے سامنے سے گزرا۔

”یہ سب بنگالی لڑکیاں ہیں؟“ ایک لبرل اخبار کے نمائندے نے کیمرہ سنبھالتے طلعت سے دریافت کیا۔

”یہ؟ نہیں۔۔۔ وہ سنبھال لڑکی فیروز جہیں ہے۔ اتر پردیش کی رہنے والی۔ یہ دوسری خوبصورت کسان لڑکی عذرا وحید ہیں۔ یہ ادھر والی پنجابی خاتون ہیں۔“

”ہاؤ نے سی ٹنک \_\_\_\_\_“ نمائندے نے بڑے صدق دل سے کہا اور اپنی

نوٹ بک پر جھک گیا۔ ”دیکھو ایک بات مجھے اور پریشان کر رہی ہے۔“ اس نے پیشانی پر ہل ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تم ہو تو ان ہی لوگوں میں سے پر آج کل میری برادری سے تعلق رکھتی ہو انہذا مجھے کسی اینگل سے کوئی اسٹوری نہ دینا۔ میں میں تم لوگوں کو اس برج یکجا دیکھ کر بے حد پریشان ہوں۔ صبح سے شام تک میری ساری زندگی تمہارے آپس کے سیاسی جھگڑوں اور تنازعوں اور خونریزیوں کی خبریں چھاپتے گزری جا رہی ہے اور اب یہ کیا سلسلہ ہے۔ تم ہمیں بے وقوف تو نہیں بنارہی ہو۔ تم ایک سال لباس پہنے ایک موسیقی کی آہنگ پر ایک سے گیت گارہے ہو۔ یہ کون سا نیا اسٹنٹ ہے۔ ایس؟“

”راہٹ صاحب“ طلعت نے منہ لٹکا کر کہا ”اے تو بس اسٹنٹ ہی سمجھو۔“

”اچھا اب تم باہر جاؤ۔ دیکھو اگلا ایکٹ شروع ہونے والا ہے۔“

”پتا نہیں اگلا ایکٹ کیا ہوتا ہے؟“ اس نے غیر یقینی لہجے کے ساتھ رنجیدہ

آواز میں کہا۔

”مجھے تو خود پتا نہیں۔“ طلعت نے گرین روم کے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے

جواب دیا۔ ”مجھے اگلے ایکٹ کے متعلق ہمیشہ ڈراگاہ رہتا ہے۔“

دروازے میں پہنچ کر اخبار نویس پھر ٹھٹھکا: ”ایک بات اور۔۔۔ سرف ایک

آخری سوال۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ طلعت نے جھجھکا کر جواب دیا۔ ”خدا

را۔۔۔“ طلعت نے گرین روم کا دروازہ بند کیا اور ونگ میں جا کر اپنے کیو کے

انتظار میں مصروف ہو گئی۔

دھان کے پھٹکنے اور ساون کی بارش کی صداؤں کے ساتھ ساتھ فریدہ کی  
حسین بنگالی آواز رفتہ رفتہ اونچی ہوتی گئی:

بیلا مانی رے جلدی جلدی \_\_\_\_\_

(وقت نہیں ہے جلدی کرو)

او بیلا شو مار کونرا ونچل دھوئی را \_\_\_\_\_

(سنہری کنیا کا آنچل پکڑ کر دن ڈوب رہا ہے)

جادو رکا ٹھی ہاتھ لوئی یا آئی لورایت بوجھی

بیلا مانی رے جلدی جلدی \_\_\_\_\_

بیلا مانی \_\_\_\_\_

۸۰

وقت نہیں ہے۔ جلدی کرو۔ جلدی کرو۔ \_\_\_\_\_

وقت نہیں ہے۔ \_\_\_\_\_

لوگوں کو دیکھو ان کے چہرے کتنے کریہہ ہیں۔ یہ کتنے بد صورت ہیں۔ ان  
سے بھاگو۔ بھاگو۔ اب میں کس اور جاؤں۔ میرے دشمن میرے  
دوست۔ میں نے انہیں راستے کے کس موڑ پر چھوڑ دیا۔

جھیل کے پار ندی کے پار سمندر کے پار وہاں کیا ہے۔ ہم نے ٹکٹ تو جنوبی  
ممالک کا لیا تھا پر کیا تمہیں یقین ہے کہ جہاز والوں نے گائیڈز نے جو بتایا وہی

ٹھیک ہے، یہ میں ہوں۔ یہ تم ہو۔ باقی سب میرا پروجیکشن ہے۔ یہ مستقل ”میں“۔  
 ”سامنے صرخ چھت کا چلیل ہے اور اس میں گھنڈیاں بچ رہی ہیں یہاں کس کی  
 شادی ہے؟ بہار آگئی ہے۔ پگڈنڈیوں پر پھول جھک آئے ہیں۔ ابھی وہ دونوں  
 نہیں پہنچے جن کا بیاہ ہوگا۔

چلتے چلتے میرے پاؤں بھی جل گئے۔ اس نے رنج سے اپنے پیروں کو  
 دیکھا۔ ایک سوترا ہوا چاند برخس گاؤں کے اوپر ڈول رہا تھا وہ سرحد عبور کر کے  
 ہنستے ہوئے سائزنگ میں داغ ہوئے۔ یونہی خوشی سے ادھر ادھر گھومتے ہوئے  
 ایک چھوٹے سے سینما ہاؤس میں پہنچے جہاں ایک بیس سال پرانا فلم چل رہا تھا۔  
 بیس سال پرانا فلم دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ باہر آ کر وہ ایک اور سرائے میں جا  
 بیٹھے، وہ اپنی ٹانگیں کرسی پر رکھ کر درتپے سے باہر دیکھنے لگی۔ ایمرن سے ہاتھ  
 پونچھتا ہوا خوش مزاج دھندلی آنکھوں والا بوڑھا ان کے سامنے آیا۔

”یہ شاہان اودھ کا خاندان ہے۔“ وہ خوب ہنسا۔ ”تم جانتے ہو شاہان اودھ  
 کون تھے؟“ انہوں نے کاغذ کے نیپکن پر اپنے نام اکٹھے لکھے۔

وقت نہیں ہے۔۔۔۔۔ وقت نہیں ہے۔۔۔۔۔

”ہلو بھائی جان۔۔۔“ دروازہ کھلا اور زرد رنگ موری والی پتلون پہنچے ایک  
 بے حد حسین لڑکی ان کی میز کی سمت بڑھی۔ ”بھائی جان آپ کا تار مجھے آج ملا۔“  
 ”آپ کون ہیں؟“ روشن نے پوچھا۔

”یہ میری کزن ہیں۔۔۔۔۔ شارخ سلطان پیرس میں ریڈیا لوجی پڑھتی

ہیں۔“

”بھائی جان یہ کون تھیں؟“ روشن کے باہر جانے کے بعد نووارو لڑکی نے دریافت کیا۔

”یہ \_\_\_\_\_ ان کو بھی میری کزن ہی سمجھو“

”ہائے اللہ \_\_\_\_\_ آپ کتنے مزاحیہ ہیں \_\_\_\_\_ پر یہ کافی مغروری معلوم ہوتی ہیں \_\_\_\_\_ ایک دم اٹھ کر باہر کیوں چلی گئیں؟“

”مغرور تو نہیں ہائی برو ضرورت سے زیادہ ہیں۔ گرشن کالج انٹرنیشنل سٹ سے ملاقات وغیرہ جانتی ہو تم یہناپ؟“

”ہائے اللہ کس قدر دلچسپ۔“ اشارہ خ سلطان نے مسرت سے کہا۔

اس نے ایک گہری، تھکی ہوئی انگڑائی لی۔ یہ سائز برگ ہے اور منی کامہینہ۔ میں تمہیں ایک روز اپنی کہانی سناؤں گا۔

وقت اکا جا رہا ہے \_\_\_\_\_ جلدی کرو۔

بھاگو۔ بھاگو۔ بھاگو۔

باہر ایک امریکن مشنری آکر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ درختوں کے نیچے کر سیاں پڑی تھیں ارگلی کی محراب کے نیچے کوئی اکارڈین بجا رہا تھا۔ سڑک کی دیوار پر بیٹھے بیٹھے اس نے بڑے اخلاق سے مشنری کی طرف ہاتھ بڑھایا: ”ہاؤ ڈو یو ڈو۔“ اس نے کہا۔

”کیا تمہیں اپنی روح بچانی ہے؟“ مشنری نے بے اندازہ اہمیت اور رازداری کے لہجے میں کہا۔ گویا اگر آپ کو مضبوط جوتے بنوانے ہوں تو ہماری فرم میں تشریف لائیے۔

”امریکن؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں مجھے پیٹر کہتے ہیں۔“

”بیٹھ جاؤ پیٹر۔ کہو اچھے تو ہو۔“

”جی تھینکس۔۔۔ میں یہاں سے چھتیس گڑھ جا رہا ہوں۔ ہم نے وہاں

ایک نیا مشن قائم کیا ہے۔“ پیٹر نے آسانی خوشی سے بے حال ہو کر بتایا۔ ”میں

پرنسپل میں پڑھتا تھا۔“

”ہاؤنڈ رفل۔“

”میں پروفیشنل بیس بال کا کھلاڑی بننے کی ٹریننگ لے رہا تھا جب میں نے

”فٹن کال سن لی۔“

”کیا سن لی؟“

”کال۔“

”تمہیں ایک بات بتاؤں پیٹر۔۔۔ میں نے بھی کال سن لی ہے۔“ اس نے

سوچتے ہوئے کہا۔

”یہ تو خداوند خدا کی بڑی مہربانی ہے۔ کب سنی؟“ پیٹر نے دلی مسرت سے

پوچھا۔

”ابھی ابھی۔ چند لمحے پہلے تقریباً نو بج کر پندرہ منٹ پر۔“ اس نے گھڑی

دیکھی۔ ”یا شاید نو بج کر بارہ منٹ تھے۔“ اس نے سڑک کی دوسری طرف سرائے

کے جگمگاتے درتے کی اور نظر اٹھائی، پھر اس نے ہنس کر مشنری کو دیکھا، وہ بے

وقتوں کی طرح منہ کھولے اسے تکتا رہا۔

سوتا ہوا چاند تیرتا تیرتا درتپے کے عین سامنے آ کر ٹھہر گیا اور اس کی روشنی سے خاموش کمرہ دفعتاً جگمگا اٹھا۔ برابر کے اسٹوڈیو میں رنگا ناٹھن مردِ نگم بجا رہے تھے۔ براؤن بالوں، ترچھی آنکھوں اور پہلی رنگت والے ڈچ اندونیزین لڑکے، جو سر یکھا کے ٹروپ میں شامل تھے، ناچنے کے بعد لکڑی کے فرش پر کانپلی سے آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ طلعت درتپے میں اس طرح بیٹھی تھی جیسے کسی نے چوہے کو سیسہ پلا دیا ہو۔

ہاؤ اللہ آپ کتنا عمدہ گاتے ہیں۔

ہائے اللہ اسکینگ کا لباس آپ پر کتنا بختا ہے۔

ہائے اللہ \_\_\_\_\_

فیروز دوسرے درتپے میں بیٹھی جانے کا ہے کی نقل کر رہی تھی۔ طلعت نے انہیچوں کی طرح ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔

برج باسیوں میں شیا م

برج باسیوں میں شیا م ہنسی بجائے جا۔۔۔ بجائے جا۔۔۔

طلعت نے یکلفت اپنا شروع کیا۔

”پھر بے وقت کی راگنی۔“ گیروز نے غصے سے طلعت کو دیکھا۔

”روشن آگئی۔“ تزگیش نے درتپے میں سے جھانک کر اطلاع دی۔

”ہوا میں پھولوں کی مہک اڑ رہی ہے اور یہ منی کا مہینہ ہے۔ ہم اس





نہیں بجاتے؟“

”تم روتی کیوں نہیں؟“ کملا نے روشن کے قریب آ کر اسے غور سے دیکھا۔  
”کیا ایسا نہیں ہوتا کہ جب لوگ انہیں چھوڑ کر آگے چلے جاتے ہیں تو لڑکیاں  
روتی ہیں۔“ اس نے اواسی سے سوال کیا۔

”دیکھو،“ روشن نے کملا کو مخاطب کیا، ”اتنے برسوں تک میں ایک گھر بنانے  
میں جٹی رہی لیکن ٹھیک نو بج کر پندرہ منٹ پر وہ گھر ٹوٹ کر زمین پر آ گیا۔“  
”کا ہے؟ کیسے؟“ طلعت نے پوچھا۔

”میں نے اسے خود توڑ دیا۔ میں نے بڑے زور سے اسے ایک ٹھوکر لگائی اور  
اڑا اڑا دھم، وہ ایک دم نیچے آن گرا۔ اب میں بڑی بے فکر ہوں۔ اب میں آرام  
سے سویا کروں گی اور کوئی گھر تعمیر نہ کروں گی۔ اللہ حافظ۔“ وہ دم روازے کی  
طرف بڑھی۔ ”اب میں تمہارے بد صورت، اواس اجاڑ مکانوں میں رہا کروں  
گی۔“

ڈیج انڈونیزین لڑکے ایک جمائی لے کر درتپے میں جا کھڑے ہوئے۔  
”میں نے اس گھر کے ٹیلی فون کے تار بھی کاٹ دیے ہیں۔“ چلتے چلتے اس  
نے دروازے میں سے سر نکال کر کہا اور زینے کی اور مڑ گئی۔

طلعت بھی درتپے میں آ گئی۔ اس نے دیکھا کہ باہر بے پایاں اندھیرا ہے اور  
اندھیر مہربان ہے اور اندھیرا ہمارے ہر دکھ، ہر غم، ہر شکست کو اپنے میں سمیٹ لیتا  
ہے کیونکہ آخر میں ہم خود اس بے پایاں اندھیرے میں داغ ہو جاتے ہیں۔  
گو ہمیں کبھی اس طرح نہ مرنا چاہئے۔

”ہلو۔۔۔۔۔“ اچانک فیروز نے گلی میں آکر درتکے میں سے اندر جھانکا۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں؟“

”میں دھوبن کے یہاں گئی تھی۔“

”بہت اچھا کیا تھا۔“ طلعت نے بے دلی سے کہا۔

”اب ان کا۔ تمہارے بھیا صاحب کا کیا کیا جائے؟“ اس نے فکر مندی سے

پوچھا۔

”ڈرائنگ۔۔۔۔۔ کافی میں تم نے پھر کتنا گھول دیا۔“ اسٹور کے پاس

سے مکلا چلائی۔

”تم سے سک نے کہا ہے کہ بکری کی طرح ہر وقت پان چبایا کرو۔“ طلعت

نے گرج کر جواب دیا۔ ”سارے میں مار پان کے لوازمات بکھرے ہوئے

ہیں۔“

”ڈرائنگ۔“ سر یکھا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خبر سنائی۔ ”ساجدہ

آپا۔“

”۔۔۔ نیچے گیلری میں کھڑی پوچھ رہی ہیں کہ اپنا افسانہ کب تک لکھ کر

لائیں۔ یہ کون سا نیا رکٹ تم نے چلایا ہے۔۔۔۔۔“ مکلا نے غصے سے مطالبہ

کیا۔

”دراصل۔۔۔۔۔ دراصل مکلا۔۔۔۔۔ برلین کے واقعے کے بعد سے میں

ساجدہ آپا کی رائے گوپال بنی ہوئی ہوں۔ ایک روز انہوں نے کہا کہ وہ اپنے

مختلف تجربات اور تاثرات پر ایک افسانہ لکھنے جارہی ہیں تو میں نے

\_\_\_\_\_ میں نے \_\_\_\_\_ ان سے کہا کہ میں اسے کسی اردو رسالے میں چھپنے کے لیے بھجوا دوں گی۔“ طلعت نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”از برائے خدا ان سے کہہ دو کہ مجھ پر اپنڈی سائینس کا حملہ ہوا ہے اور مجھ ہسپتال لے گئے ہیں۔“

”ادھر آؤ تم سب۔“ نزگیش نے گیلری میں سے آواز دی۔

ریرسل روم میں ساجدہ بہن ایک سیٹی پر بیٹھی تھیں۔

”السلام علیکم \_\_\_\_\_ پیاری بہن“ انہوں نے گرم جوشی سے کہا۔

”وعلیکم السلام پیاری بہن \_\_\_\_\_ بیٹا قیس کس حال میں ہے۔ اور شیر لوہے کے جال میں ہے \_\_\_\_\_“ طلعت نے نعرہ لگایا۔

”ہائے بس تم ہر وقت مذاخ کرتی ہو۔“ انہوں نے کہا۔

”اب اپنا افسانہ پڑھ کر بھی سناؤ گی، ساجدہ بہن؟“ طلعت نے لرز کر سوال کیا۔

”آہ \_\_\_\_\_ یہ کچھ یادیں ہیں میرے انگلستان کے زمانہ قیام کی۔“ انہوں نے بیگ میں سے کاغذات نکالتے ہوئے کہا۔ ”تم تو مجھے سمجھتی ہونا۔“

”ا ساجدہ بہن \_\_\_\_\_ کافی پیو \_\_\_\_\_“ نمبروز نے مہمان نوازی شروع کی۔

”ہرگز نہ پیجئے گا۔ اس میں کتھا گھلا ہے۔“ کملانے آگاہ کیا۔

”اجی کتھا ہو یا نہ ہو، کیا فرق پڑتا ہے، دنیا کی ہر چیز فیراڈ ہے فیراڈ۔“ نمبروز نے سخت فلسفیانہ انداز سے کہا۔

طلعت کو غصہ آ گیا، وہ آتش دان کے پاس جا کھڑی ہوئی اور ہوا میں ہاتھ ہلا

کر اس نے کہنا شروع کیا:

میز ہل جائے گی اور کافی چھلک جائے گی، مجھے معلوم ہے دوست

میز میں پیرا لگا۔ میز کو جھٹکا سا محسوس ہوا۔

ہل گئی میز تو کافی چھلکی، کافی چھلکی تو مگر گر نہ سکی

میز کا فعل عبث

دونوں میں کوئی نہیں، کچھ بھی نہیں

گھور کر دیکھ نہ یوں دوست مجھے

بد تمیزی سے بہت دور رہا کرتا ہوں

اتفاقات کے یہ گہرے نکات

میز تو میز ہے گردوں کو ہلا دیتے ہیں

اور سیارے چھلک جاتے ہیں

ایسے ہی جیسے کہ کافی چھلکے

ساجدہ بہت خوش ہوئیں۔ ”اس کا عنوان کیا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”فیراڈ\_\_\_\_ ہی سمجھ لو\_\_\_\_ تال حسن کی تازہ ترین تصنیف ہے۔“

”اچھا، سر یکھا دیوی سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ انہوں نے فون پر مجھے اسی

وقت کا اپوائنٹ منٹ دیا تھا۔“

سر یکھا دوسرے کمرے میں ڈیجیٹل انڈونیزین رقاصوں کو ریہرسل کر رہی تھی۔

”تم اپنے حواس میں ہو۔“ طلعت نے اس کے پاس جا کر غصے سے کہا۔ ”یہ تم

لوگوں کو ملاقات کا وقت کب سے دیے لگئیں؟“

”روشن کو تم نے کہاں غائب کر دیا؟“ وہ گرجی۔

”مجھے کیا معلوم۔ میں ہر سے اس کے پیچھے پیچھے تو نہیں پھر سکتی۔“ طلعت نے

جواب دیا۔

”ہائے کس قدر دلچسپ۔“ ساجدہ بہن نے دروازے میں پہنچتے ہوئے کہا۔

میری ہمیشہ تمنا تھی کہ بیک اسٹیج زندگی دیکھوں۔“

”کیا ذلیل تمنا تھی۔“ طلعت نے غصے سے دانت پیستے ہوئے دل میں کہا۔

”نہستے جی۔“ سر یکھا نے بے حد سنجیدگی سے ساجدہ آپا کے قریب آ کر کہا۔

”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔“ اس نے فوراً انٹرویو لینے والا انداز اختیار

کیا۔

”تمہاری رائے نے سب کا پٹرا کر دیا۔“ ساجدہ آپا کے جانے کے بعد کملا

نے طلعت سے کہا۔

”ایس؟“

”ہاں۔ مثلاً اگر تم نے ساجدہ بہن کو رائے نہ دی ہوتی کہ وہ فری ورلڈ کی

ایڈری چھوڑ کر افسانہ نگاری پر اترا آئیں تو کیا ہوتا؟“

”تو وہ فری ورلڈ کی سب سے بڑی ایڈر ہوتیں۔“ طلعت نے اطمینان سے

جواب دیا۔

”لیکن اب وہ انسپریشن کی تلاش میں رومینک جنگلوں میں گھومتی

ہیں۔“ میروز نے کہا۔

”جنگلوں میں؟“ کملا نے پوچھا۔

”ہاں جنگل یعنی ووڈ لینڈ۔“

”سینٹ جانز ووڈ لینڈ؟“ طلعت نے سوال کیا۔

”کینے پن پر مت اترو۔“ میروز نے کہا۔

”در اصل سینٹ جانز ووڈ کے اسٹوڈیو فلیٹس میں تبدیل شدہ اصطبلوں اور ان

میں رہنے والے کلاکاروں کی صحبت نے ان کی نفسیات پر بہت پریشان کن اثر ڈالا

ہے اور دوسری بات یہ۔۔۔“ کملا نے خفگی سے کہا، ”کہ اگر تم نے روشن کو کوئی

سیدھا راستہ دکھایا ہوتا تو وہ کب گھر واپس جا کر کسی ٹھکانے کے آدمی سے بیاہ کر

لیتی۔“

”وہ لامحالہ گھر واپس جا کر کسی ٹھکانے کے آدمی سے بیاہ کر لے گی، وہ فلسفی

ضرور ہے مگر یہ نہ بھولنا کہ بورژوا فلسفی ہے۔“ طلعت نے کہا۔ ”ارے جب میاں

بزرے باگوں میں آئے۔۔۔ مانی بھنے اگوانی۔۔۔“ اس نے ڈھول اٹھا کر

الاپنا شروع کر دیا۔

”اور میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ یہ سارا اسرار ہے کیا

آخر؟“ سر یکھانے اندر آتے ہوئے سوال کیا۔

”اتفاقات کے یہ گہرے نکات۔“ سر یکھانے سیٹی بجائی۔

”میں دھوبن کے یہاں جا رہی ہوں۔“ میروز نے درتپے میں سے باہر گلی

میں کودتے ہوئے کہا۔

جاڑے آئے اور برف سے سارے راستے سفید ہو گئے۔ اسٹیٹ گاڑٹ،  
 ترویز، ویزرن۔ ساری جگہوں کو برف نے ڈھانپ کیا۔ کرمس کے پنومائٹ شروع  
 ہوئے۔ لوگوں نے جنوب کی طرف روانہ ہونا شروع کیا۔ اسٹرن برگ میں چار  
 خانے دارموزے پہنے غریب جرمن لڑکیاں کرمس کی خریداری کر رہی تھیں اور  
 امریکن سپاہی انہیں اسگریٹ کے ڈبے تحفے میں دے رہے تھے۔ نو تروام کی  
 راہبات سین کے کنارے کنارے اپنی بھگیاں ہانک رہی تھیں۔ وٹرسپورٹس کا  
 زمانہ آیا۔ برف کے خطرناک حصوں کو جالیاں لگا کر علیحدہ کر دیا گیا۔ وکی بام نے  
 شاید کوئی نیانا ول لکھ لیا تھا اور برف بڑی مہربان تھی۔

پھر برف پگھلی۔ درختوں میں نئی کونپلیس نکلیں۔ ساری کائنات پر شدید، خالص  
 رنگ بکھر گئے۔

خزاں آئی۔ جنگلوں میں سرخ آگ ایسی لگ گئی۔ تیز سرخ پتوں کے انباروں  
 نے پگڈنڈیوں اور سڑکوں کو اپنے میں چھپا لیا۔ ہوا کی نیلاہٹ میں زردی شامل ہو  
 گئی۔

چلتے چلتے تھک کر روشن راستے میں ایک جگہ ٹھہر گئی۔ سامنے ایک پرانا چرچ تھا،  
 وہ غیر ارادی طور پر قبروں کے کتبے پڑھنے لگی، پھر وہ اندر گئی۔ چپل خالی پڑا تھا۔  
 گھسے ہوئے اوک کی پچیں۔ ہستمد دینے کا سرد حوض۔ دیواروں پر ان کرنلوں اور  
 کپتانوں کی تاریخ وفات کی پینٹل کی تختیاں لگی تھیں جو اس قصبے میں پیدا ہوئے اور  
 سلطنت کی حفاظت کرتے ہوئے جھانسی اور کانپور اور رزمک میں کھیت رہے۔ اس  
 نے بے دھیانی سے ادھر ادھر گھومتے ہوئے چند سکے فنڈ کے ڈبے میں ڈال

دیے۔

”ہلو۔ میری بچی۔۔۔“ بہت بوڑھے پادری نے محبت سے کہا، وہ پیچھے درختوں سے نکل کر آیا تھا اور لنگڑا تھا۔

”ہلو۔۔۔ گڈ ایونگ۔۔۔“ اسے بے حد ڈر لگا۔ اس نے مسکرا کر چند اور سکے بکس میں ڈالے اور باہر آ گئی۔ کیا فضول بات ہے۔ چرچ بنارکھے ہیں۔ اس نے جھنجھلا کر کہا، پھر اس کا جی چاہا کہ واپس جائے اور ایک اوک کی بیخ پر سر رکھ کر پڑ سوتی رہے۔

اس کے ساتھ وہ گھنے جنگلوں اور ہرے جزیروں میں سے گزری تھی۔ طویل مرمریں گیلریوں میں چلی تھی۔ اونچی سفید سیڑھیوں پر چڑھی تھی جن کے اختتام پر رومن ستونوں میں سے تیرتا ہوا چاند لیکھت سامنے آ جاتا تھا اور چاروں اور سائپرس کے درخت تھے۔ آسٹریا۔ یونان۔ اٹلی۔ اب وہ پھر مانوس پرانے انگلستان میں موجود تھی۔

لندن میں وہ سر یکھا کے مکان کی بالکنی پر جھکی رہی۔

”وہ سب ایکٹنگ تھی۔“ اس نے بڑے باوثوق طریقے سے عامر رضا سے کہا۔

”پتا ہے۔“ عامر رضا نے اطمینان سے جواب دیا۔ ان کو ہمیشہ سے ہر بات کا پتا تھا۔ خود ان کو نروان ملنے والا تھا نروان کی مختلف کیفیات ہوتی ہیں۔

”مجھ میں بہت مال کا اسٹیج سنس ہے۔“

”معلوم ہے۔۔۔ تم نے بھی کالج میں ایلوکیشن سیکھا ہے اور اسکا انٹیمیٹر



”میں تم۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ اس نے خوشی کے لہجے میں بات کاٹی۔۔۔۔۔ ”اور اسی لیے اب میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ مجھے مسرت ہے کہ تم نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ تم بہت سمجھ دار ہو۔۔۔۔۔ دراصل غلطی سراسر میری ہی تھی۔ میں صدق دل سے تم سے معافی مانگتی ہوں۔“

”میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔“ اس نے بہت فراخ دلی سے جواب دیا۔  
پھر وہ دونوں بالکنی پر جھکے سیٹی بجاتے رہے۔

۸۳

سوتا ہوا چاند کاہنی سے چاروں اور تیرا کیا۔ بالکنی کے نیچے سر یکھا بیٹھی تھی۔ وہ اور زرینہ نے اسٹیج ڈیزائن بنانے میں مصروف تھیں۔  
”وہ دیکھو۔ چاند مر رہا ہے۔“ اس نے اچانک انگلی اٹھا کر روشن کو مخاطب کیا۔  
”ہاں۔“ روشن نے پہلی بار دیکھا۔ چاند مر چکا تھا اور اس کی زرد لاش رات کی ہوا کے رحم و کرم پر ادھر ادھر ڈول رہی تھی۔

”تم نے دیکھا۔“ سر یکھا نے آہستہ آہستہ کہا۔۔۔۔۔ ”یہ سب اسٹیج کی سینری تھی۔ ڈیزائن۔ ڈیکور۔ کیٹس کے رنگین پردے۔ پردیس۔“

گیلری میں لفٹ آن کر رہا۔ طلعت اور زنگیش اندر آئیں، وہ نرملا کو دیکھنے ٹڈہر سٹ گئی تھیں اور واپسی میں انہوں نے دیکھا کہ ہیزل میز کا جنگل وہاں نہیں

تھا۔ تب طلعت کو معلوم ہوا کہ موسموں کے ساتھ ساتھ اس جنگل کی جائے وقوع بدلتی رہتی ہے۔ میز ل میسر کا جنگل کبھی ایک جگہ پر نہیں ٹھہرتا۔

کمرے میں وہ سب چپ چاپ بیٹھے رہے۔ کملا نے روشن کو غور سے دیکھا، گویا اسے پہچاننے کی کوشش کرتی ہو، پھر وہ اپنی اور سر دیکھا کی بھرت ماسیم کی ملبوسات کو اٹنے پلٹنے لگی۔

”کملا \_\_\_\_\_“ طلعت نے دفعتاً کہا۔ ”لوئی مک ٹیس کی وہ نظم سناؤ۔“  
”کون نظم؟“

”وہی \_\_\_ جو خزاں نامے میں شامل ہے۔“

کملا آتش دان کے مصنوعی انگاروں کو دیکھتی رہی، پھر اس نے آہستہ آہستہ کہا:

"I loved my, with a platform Ticket"

A handbag, a pair of stockings of paris and

I love her long

I loved her between the lines and against

the clock,

Not until death

But life did us part

I loved her with paacocks eyes

and the wares of carthage.

With blasphemy, camaraderie,

and bravado and lots of other stuff.

I loved her with my office hours, with  
flowers and

Sirens,

With my budget, my latchkey  
and my daily bread;

And so to London and down the  
ever-moving Stairs."

سب خاموش بیٹھے رہے۔

”کملا \_\_\_\_\_“ طلعت چلائی۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ قریب آکر  
ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔

”تمہیں یاد ہے۔“ کملا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”جولائی یا اگست کی ایک شام،  
جب بارش ہو کر تھمی تھی، گل فشاں بالکل سنسان تھی۔ سب لوگ جانے کہاں چلے  
گئے تھے۔ میں اور نرملا اور تم اکیلے برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے اور شام کی نیلی  
روشنی سارے میں پھیل گئی تھی اور اس سے دونیا سنیں منتر پڑھتی پھاٹک کے اندر  
آگئی تھیں اور مصر تھیں اور مصر تھیں کہ ان کو دکھشنا دی جائے اور بچوں کی طرح ہمیں  
ایکا ایک یہ خیال آیا تھا کہ یہ چڑیلیں ہیں، ہم اتنے بڑے گھر میں تنہا ہیں، ابھی یہ  
ہمیں شراب دیں گی، ابھی کچھ ہوگا، اس سناٹے میں کوئی خوفناک انجان بات ہو  
گی۔“

”پھر وہ جاپ کرتی اور راجستھانی میں بڑبڑاتی واپس چلی گئی تھیں۔ ہم نے خوفزدہ ہو کر انہیں زور سے ڈانٹا تھا۔“ طلعت نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”اور پھر ہمیں مہوے کے سائے سے بھی ڈر لگا تھا۔ ہم سہے ہوئے میڑھیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کوشش کر کے آہستہ الکرسی پڑھی تھی اور تم نے اپنا وہ اکلوتا اشلوک دہرانا چاہا تھا جو تمہیں کبھی یاد نہ ہو سکا۔“

”وہ بڑی سنسان شام تھی۔“ کملا نے یاد کیا۔ ”تم نے کبھی سوچا ہے، ساری شائیں بہت سنسان ہوتی ہیں۔ ان میں ایسی بے پایاں اداسی ہوتی ہے۔ شام \_\_\_\_\_ جب دونوں وقت ملتے ہیں۔ جب ہم جگمگاتے کمروں میں ہستے ہیں۔ اس وقت بھی دفعتاً بڑے رنج، بڑی پشیمانی کا احساس ہوتا ہے۔“

”پھر ہم تینوں خاموش سڑک پر سے گزر کر سنگھاڑے والی کوچی چلے گئے تھے اور وہاں اناج کے ساتھ مل کر اپنے اس طرح خوفزدہ ہو جانے پر بہت ہنسے تھے۔“ طلعت بولی۔

”وہ منیا سنیں ہمیں ہر جگہ ہر موڑ پر ملتی ہیں، وہ ہمیں بددعا کیں دیتی مہوے کے سائے میں غائب ہو جاتی ہیں۔ اندھیری راتوں میں میں نے ان منیا سنوں کو چلا چلا کر روتے سنا ہے۔“ کملا نے کہا۔

دوسرے کمرے میں زور زور سے مرد گم بچنا شروع ہو گیا۔ آج رات سر یکھا اور کملا کا ناچ ہے۔ سارا عالم دیکھنے کے لیے آئے گا۔ طلعت کو خیال آیا۔

روشن اس کے قریب آئی۔ ”میں واپس جا رہی ہوں۔ تم لوگ مجھے کبھی خط لکھا کرو گے؟“ طلعت کو ایسا لگا جیسے اس کی آواز میں التجا تھی۔

”ہاں۔ ہم تمہیں ہر سال عید اور سال نو کے کارڈ بھیجیں گے۔“ طلعت نے کہا۔ (کیا انجام بس اتنا ہے۔ کچھ عرصے تک ان سب کے کرسمس کارڈ روشناس کے پاس جائیں گے مگر وہ بھی بند ہو جائیں گے۔ راہ میں جب مختلف خرابوں کے وسیع ویرانے اور سیاسی حد بندیاں حائل ہوں تو کہاں تک ان خوشگوار تعلقات کو گھسیٹا جاسکتا ہے۔ ہاں۔ ہم تمہیں کبھی بھولیں گے نہیں روشن ڈیر۔ اس نے دہرایا۔ ”ہم سب ایک شراب کے زیر اثر ہیں۔“

مردنگ کی آواز تیز ہو گئی۔ نادردام تاندی رے نا۔۔۔ سر یکھا چھن سے اسٹیج پر آئی۔ اب حسب معمول میں ناچوں گی۔ اس نے سوچا۔ کمانا چے گی۔ سب ناچیں گے۔ ای رپو جتی سورم۔ شہدم۔ شو جاری رہے۔ ایسی کیا خاص بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں جاری رہے۔ کڑتک تامنت تام۔ کڑتک تئی نت تئی۔ کل مجھے ٹیلی ویژن پر ناچنا ہے۔ پرسوں ہالینڈ جا کر ملکہ جولیانہ کے لیے رقص کرنا ہے۔ دریا بچے جا رہا ہے۔ ڈلن نامس مر گئے۔ ہبل چودھری مر گئے۔ روشن۔۔۔ افسوس کہ وہ بھی شاید مر گئی۔

اور اب ہال خالی پڑا ہے۔ صرف رادا کی چند لڑکیاں ارواڑ کے ادھر ادھر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ اخباروں کے نمائندے کاغذ پھیل ہاتھ میں لیے سر یکھا دیوی کے قیمتی الفاظ سننے کے لیے کان لگائے کھڑے تھے۔ کارڈ بورڈ کے سیٹ افراد تفری کے عالم میں بکھرے ہوئے تھے۔

”رقص میں میری زندگی ہے۔“ سر یکھا نے رامیشورم کے مندر کی سیڑھی پر پیر

”کاتے ہوئے امروہی والی شانستہ اور توازن آواز میں کہنا شروع کیا۔

”خداوند! \_\_\_\_\_ سر یکھا۔“ طلعت نے بے انتہا پور ہو کر جمائی لی۔

”ہش \_\_\_\_\_ میں پرپس کو بیان دے رہی ہوں۔“

اخبار کے رپورٹر مسحور ہو کر اسے دیکھتے رہے۔

طلعت نیم تاریک آڈیٹوریم کی ایک نشست پر بیٹھ کر اونگھنے لگی۔ یہ ننھا سور مارکیٹ گیا تھا۔ یہ ننھا سور مارکیٹ گیا۔ یہ ننھا سور گھر پر رہا۔ اس ننھے سور نے بھنا گوشت کھایا۔ یہ ننھا سور سارے راستے روتا ہوا گھر واپس آیا۔ وی وی وی وی وی۔

۸۴

وی وی وی وی \_\_\_\_\_ شوراب آسمان تک پہنچ گیا ہے۔ چپا نے درپچہ بند کر دیا اور ہوٹل سے باہر نکل آئی۔ سارے میں سہ پہر کا سناٹا طاری تھا کل کالج بند ہو جائے گا۔ اب میں کہاں جاؤں گی؟ کیا کروں گی؟ (زندگی منتظر ہے منہ پھاڑے۔) یہ تجربہ بھی غالباً نا کام رہا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دور دور تک پھیلے ہوئے باغوں کو دیکھا۔ کیمبرج کی ہریالی پر نیلی گھٹائیں چھائی تھیں، وہ بیکس پر سے گزرتی انہیری کی طرف جانے والی پلپا پر آگئی۔ ”شولوم صلیخیم۔“ ایک یہودی طالب علم دوسرے یہودی طالب علم کو جو پلپا پر بیٹھا تھا سلام کرتا ہوا سائیکل پر گزر گیا۔ ”تم پر خدا کی رحمت ہو۔“

”تم سب پر خدا کی \_\_\_\_\_ رحمت ہو۔“ چمپا نے دل میں دہرایا۔

زندگی میں بذات خود اتنی شدت ہے۔ اس کے لیے فلسفے کی فروعات کی کیا ضرورت ہے اور مسرت کی تلاش کے سلسلے میں ہم کس قدر کمینے بن جاتے ہیں۔ یہودی طالب علم جو پلپا سے درخواست کی۔ ”میں تمہارا اسکچ بناؤں گا۔“ وہ بیٹھ گئی تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔ ”آج آخری دن ہے۔ کل تم جانے کہاں چلی جاؤ گی۔ تمہارا اسکچ میں اپنے پاس رکھوں گا۔ اس نے تندی سے پنسل چلاتے ہوئے کہا۔ چمپا نے جھانک کر دیکھا۔ اسکچ بڑا خراب تھا، مگر وہ بڑے صبر اور اخلاق سے چپکی بیٹھی رہی۔ شاید میری اصل شکل ہے۔ اس نے دل میں کہا۔ ”یہ نا کام مصور ہی شاید میری شبیہ اتارنے میں دراصل کامیاب رہا ہے۔“

”پسند آئی تم کو تصویر۔“ یہودی لڑکے نے خوشی سے پوچھا۔ ”میں تم کو مسرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تم کو کس طریقے سے خوش کروں؟“ وہ بڑا پر خلوص نظر آیا۔ ”تم مجھے خوش نہیں کر سکتے۔“ چمپا نے دفعتاً بڑی کراختی سے کہا۔ (ہم سب کمینے ہیں۔ مسرت کی تلاش میں ہماری چار سو بیس تو دیکھو۔ اس نے دل میں سوچا۔

”وہ کون ہے؟“ لڑکے نے یکلخت بے حد رنجیدہ ہو کر پوچھا۔ ”وہ کون ہے جو تم کو مسرت بخشنے گا؟“

”یہ بڑا بے رحم اور کمینے پن کا سوال ہے۔“

”معاف کرنا۔“ اس نے اداسی سے کہا۔

”اچھا خدا حافظ شولوم علیکم۔“ چمپا نے مسکرا کر کہا۔

”شولوم علیکم۔“ لڑکے نے جواب دیا اور اسے ندی کی سمت جاتے ہوئے دیکھتا رہا جدھر مائیکل اور ڈینس کھڑے تھے۔

”سرل اب تک نہیں ملا؟“ ڈینس نے سر اسیمگی کے عالم میں چلا کر پوچھا۔  
”نہیں۔“

”کہاں غائب ہو گیا سرل؟“ ڈینس نے کہا۔ ان دونوں نے غصے سے چمپا کو دیکھا۔

”میں سرل کی ذمہ دار نہیں ہوں دینس۔“ چمپا نے آہستہ سے کہا۔  
”اوہ چمپا، مجھے معاف کر دینا۔ کیا میں تم پر برس پڑا تھا؟“ مائیکل نے عجز سے کہا۔

”نہیں مائیکل۔ ٹھیک ہے۔“

”آج آخری دن ہے چمپا۔“

”ہاں۔“

”چلو چل کر آخری مرتبہ کو یہ نور میں کھانا کھالیں۔“

”آج آخری۔“ سب یہی دہرا رہے تھے وہ اس جذباتیت سے بچنا چاہتی تھی مگر یہ ناممکن تھا۔ یہ واقعہ تھا آج کیمبرج میں طالب علمی کی زندگی کا آخری دن تھا۔

ریسٹوران میں بیٹھ کر انہوں نے سرل کا قطعی ذکر نہیں کیا۔ انہوں نے تو روشن تک کا ذکر نہیں کیا۔ لوگ اتنے مہربان کیوں ہوتے ہیں؟ ایک دوسرے سے اتنی



ہمدردی کیوں کرتے ہیں؟ یہ لوگ میرے بھی بہت سخت بھی خواہ ہیں۔ اب میں  
پھر کہنے پن پر اتر آئی ہوں۔

چند روز قبل اس نے برسمیل تذکرہ روز ماری کی خیریت دریافت کی تھی۔

”اچھی ہے۔“ سرل نے جواب دیا تھا۔ ”وہ غریب تو بیماری کی حالت میں بھی  
نوکری کرتی ہے تاکہ میں کیمبرج میں تعلیم مکمل کر سکوں۔“

”اور۔۔۔ دوسری لڑکیوں سے عشق لڑا اسکو۔“ چمپا نے بے دھیانی سے کہا  
تھا۔ یہ سن سرل چھلانگ لگا کر کھڑکی سے باہر کود گیا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ  
ہو رہا تھا۔ اس روز سے سرل غائب تھا۔ کالج کے کوادرینگل میں، گلیوں میں، ندی  
کے کنارے، قہوہ خانوں اور کتابوں کی دکانوں میں کہیں سرل کا پتا نہ تھا۔

دفعتاً وہ باہر بارش میں بھینگتا دکھائی دے گیا۔ ڈینس لپک کر اس کی طرف دوڑا،  
مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا، پھر مائیکل اس کو بلانے کے لیے گیا، مگر وہ وہیں کھڑا  
رہا۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ طالب علم برساتیاں اوڑھے خراماں خراماں  
چل رہے تھے۔

”اندر چلو۔ یہ کی بچپنا ہے۔“ چمپا اٹھ کر باہر گئی اور ڈانٹ کر اس سے کہا۔

”نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”بکومت۔“

”میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ کیسے آؤں اندر۔“ اس نے آہستہ سے ڈینس

سے کہا۔

چمپا کے حلق میں کوئی چیز آٹکی۔ ایک ہفتہ قبل اسی جگہ پر اس نے سرل سے کہا

تھا: تمہاری بی بی اس لیے ملازمت کرتی ہے کہ تم دوسری لڑکیوں سے عشق لڑاؤ۔  
پھر وہ چپا کی طرف مڑا: ”تم کو غالباً یہ معلوم کر کے دلچسپی ہوگی کہ روز ماری  
نے مجھے اس ہفتے چیک نہیں بھیجا کیونکہ میں نے اسے اطلاع دی تھی کہ میں نے  
اسے چھوڑ دیے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”تمہارا \_\_\_\_\_ تمہارا دماغ یعنی کہ \_\_\_\_\_ بالکل چل گیا ہے۔“ چپا  
نے ہڑبڑا کر کہا۔ اسی لمحے اس نے محسوس کیا کہ مائیکل اور ڈینس اسے انتہائی نفرت  
کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ نفرت جو اس نے تہینہ نہ ملا اور شانتا کر گیگ کی  
نگاہوں میں دیکھی تھی۔

”ہاں۔“ سرل نے اطمینان سے جواب دیا اور برساتی کی جیب میں ہاتھ  
ڈال کر سگریٹ تلاش کرنے لگا۔

ڈینس اور مائیکل خاموشی سے ریستوران میں واپس چلے گئے۔  
بارش چپا اور سرل پر برتی رہی۔  
”چلو یہاں سے چلیں۔ پانی میں بھینکنے کی کون سی تک ہے۔“

”ایسڈے تو کس بات کی کون تک ہے۔“ سرل نے اسی انداز میں کہا، پھر وہ یہ  
ہنس پڑا۔ ”دیکھو تو سہی۔ بالآخر مجھ پر بھی تمہارے اپنشدروں کا اثر ہو ہی گیا۔“  
”تمہارا دماغ چل گیا ہے سرل۔“ چپا نے دوبارہ کہا۔

”ہر واقعہ منفرد ہے۔ وہ ۴۴ ایما نہیں جائے گا۔ یہ مت سمجھنا، جمہا کہ لمحے دہرائے  
جاسکیں گے۔ تمہاری زندگی۔ میں یہ ساری چیزیں۔ وقت کے لیے پر تم ہنس نہیں  
سکتیں۔“

”چلو۔۔۔ میں تمہاری طرف چلتی ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ فٹ پاتھ پر اس طرح چلنے لگے گویا قبرستان کی طرف جاتے ہوں۔ جب شناساڑ کے اورڑ کیاں راستے میں ملتے تو وہ بڑے الم سے ان کو بلو کہتا جاتا۔

”تم کیا واقعی۔۔۔ میری وجہ سے۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔“ اتنی خوفناک بات اس کی زبان پر نہ آسکی۔ ”یعنی کہ“ اس نے مری ہوئی آواز میں کہنا چاہا۔ ”کہ تم نے آخر اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا۔“ فیصلہ۔ اور اس کی وجہ۔ دو چیزیں جو اس کی سمجھ میں آج تک نہ آسکی تھیں۔

”جی نہیں۔۔۔ مجھ کو بقول تمہارے باؤ لے کتے نے کانا تھا۔“ سرل نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”مجھ پر دراصل کبھی کبھی خلل دماغ کے دورے پڑتے ہیں اسی کے زیر اثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہوں۔“

چمپا چورا ہے پر آ کر دفعتاً اپنے ہوٹل کی سمت مڑ گئی۔

”تم تو اپنے زریں مشوروں سے مجھ مستفید کرنے میرے ہوٹل آرہی تھیں!“

”میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی سرل۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔“

”یہ تمہارا آخری قطعی جواب ہے؟“ سرل نے زرد پڑتے ہوئے کہا۔

”آخری قطعی بالکل۔ تمہیں اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔“

”تم گوتم نیلمبر کا تعاقب کہاں تک کرو گی؟“

”میری تو ہین مت کرو سرل۔“ چمپا کے تن و بدن میں آگ لگ گئی۔

”اچھا۔ اچھا۔“ سرل نے سانس روک کر کہا۔ ”سڑک پر چلاؤ مت چپا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ غلطی میری ہی تھی۔ خدا حافظ۔“ بارش کا ایک زوردار ریلا آیا جس سے مکانوں کے پردے لہرا گئے۔ ہوائیں خنک گلابوں کی مہک تھی۔

شام کو وہ چند کاغذات لینے کے لیے سرل کے کالج گئی۔ رات کی ٹرین سے بہت سے ساتھی اپنے اپنے ملکوں کو لوٹ رہے تھے۔ سینور کارلوں برازیل جا رہا تھا۔ اس سے اس کی کتنی تکرار رومن کیتھولک فیسلمے پر ہوتی تھی۔ لڑکیاں اور لڑکے بارش سے بچنے کے لیے پھانک کے اندر کھڑے تھے۔ پھانک کا بھاری پندر ہوئی صدی کا چوبلی دروازہ اب آخری بار کھل کر بند ہوگا۔

اس کے بعد جب کبھی وہ یہاں آئیں گے تو سب کچھ تبدیل ہو چکا ہوگا۔ بارش اور زور سے ہونے لگی۔ پورٹیکیاں لے لے کر آ رہے تھے۔ لڑکوں نے برساتیوں کے کالر کان تک اٹھا لیے تھے۔ لڑکیاں چھتیاں کھول رہی تھیں۔ سب خاموش تھے۔ اب یہ بات کرنا کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ مثلاً ڈورس سے یہ کہنا کہ جب میں اسٹیٹس آئی تو تم سے ملنے مار تھو ڈیکو ما ضرور آؤں گی۔ یا جینیٹ یہ کہہ سکتی تھی کہ تم جب نیوزی لینڈ آؤ تو میرے ہاں ہی آ کر ٹھہرنا۔ یہ سب کس قدر مسخرے پن کی بات تھی، اگر یہ آخر وقت خدا حافظ کہنے کا سلسلہ نہ ہوا کرے تو انسان کس قدر زبردست کوفت سے بچ جائے گا مگر نہیں۔ کھڑے ہیں۔ بے ربط بے تکی جملے ادا کیے جا رہے ہیں۔ نظریں بچا بچا کر آنسو پڑے جا رہے ہیں۔ الاحول والاقوة۔ ٹیکیاں آئیں اور سب ایک ایک کر کے اس میں بیٹھ گئے۔ پھانک بند ہو گیا۔ ایک بار اس نے گھوم پھر کر سنان کو اوڑی نگل کا چکر لگایا۔ چپیل

میں گئی۔ سنگ مرمر کی تختیوں پر ان لڑکوں کے ناموں کو آخرتی بار پھر سے پڑھ ڈالا جو دوسری جنگ عظیم میں کام آئے۔ مایوں سے بات کی۔ ایک خانہ ماں ڈاکنگ ہال کی طرف لپکا جا رہا تھا۔ اس کو بڑے تپاک سے خدا حافظ کہا گیا وہ خود میدان جنگ پر جا رہی ہے اور دنیا کا انجام ہونے والا ہے، پھر وہ صحن کی دیوار کے دروازے کی طرف جانے لگی جو چیزیں لین کی طرف کھلتا تھا۔ راستے میں اسے کیٹ مل گئی۔ ”میں تم کو ڈھونڈ رہی تھی۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ”میں کل کینیڈا جا رہی ہوں۔ اب کب ملیں گے؟“

”پتا نہیں کیٹ“ چپا نے اس کا یعنی سوال سے بچنے کی کوشش کی۔ ”سرل کو دیکھا ہے؟ میں اس کو بھی خدا حافظ کہہ لوں۔ اس نے بڑی بے تعلقی کا انداز پیدا کر کے کیٹ سے پوچھا۔“

”ہاں وہ تو سینٹر کومن روم میں بیٹھا ہے۔“ کیٹ نے جواب دیا۔ ”اس کے مزے ہیں۔ کہیں بھی نہیں جا رہا۔ مزے سے اپنے وطن میں رہے گا، ڈاکٹر ٹیٹ ختم کرے گا اور تم کو معلوم ہے، مجھ کتنی خوفناک جگہ جا کر رہنا ہے۔“ نیوگنی اچھا ڈارنگ۔ خدا حافظ۔“

چپا کچھ دور تک اس کے ساتھ چلی اور اس کو پھانک تک پہنچا کر سینٹر کومن روم کی طرف مڑ گئی۔

سارے کالج پر مکمل سناٹا طاری تھا جسے صرف برقی بارش کی آواز مٹا کر رہی تھی۔ پتوں کی سرسراہٹ سرل بوشلے کومن ور میں درتپے کے پاس چمڑے کے صوفے پر بیٹھا وہ معمہ دیکھ رہا تھا جو کنگز لے مارٹن ہر ہفتے اپنی انتہائی اہمکچول ریڈ سنگ

پبلک سے حل کرواتے ہیں چپا کمرے میں آگئی تب بھی وہ معمہ حل کرتا رہا پھر جب چپا ایک کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے سر اٹھا کر ایک حل کے متعلق اس کی رائے پوچھی، چپا نے غور کر کے اس کا جواب بتایا۔

”ٹھیک ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم غلطی پر نہ ہو۔“ اس نے خالص برطانوی انداز میں کہا۔

وہ چونکی۔ اس نے دفعتاً دیکھا دیکھا کہ اس کے سامنے صوفے پر سنہرے بالوں والا ایک برطانوی لارڈ کرلڑکا تھا: قدامت پسند، مغرور خاموش طبع، باقتدار۔ اس لڑکے کے ساتھ اس نے چند سال اس یونیورسٹی میں بتائے تھے اور ہم جماعت ہونے کے ناطے اب اسے خدا حافظ کہنے آئی تھی۔ یہ لڑکا وہ نہیں تھا جس نے صبح بارش میں بھینگتے ہوئے دیوانوں کی طرح اس سے شادی کی درخواست کی تھی۔ یہ لڑکا تو لارڈ بارن فیلڈ کا چھوٹا بیٹا سرل ڈیرک ایڈن نہیں۔ کون سی ٹرین سے جا رہی ہو؟“

”سارے چھ کی ٹرین سے۔“ چما نے گھڑی دیکھ کر جواب دیا۔ ”تم کب لندن آؤ گے؟“

”جب بھی آؤں، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، تم سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ میں تم سے عمر بھر نہیں ملنا چاہتا۔“

وہ خاموش رہی۔ پانی کی شفاف پھوار درتپے پر ٹکرایا کی۔ ہوا کا بھینا بھینا پن کمرے میں رچ گیا۔

یکلخت چپا نے نہایت ہشاشت سے باتیں شروع کر دیں۔ یونیورسٹی

چھوڑنے کے بعد جو پروگرام گروہ کے افراد نے بنائے تھے۔ ان کا ذکر کیا۔ ”میں تو ابھی قانون پڑھوں گی۔“

”مبارک ہو۔ اس کے بعد کیا کرو گی۔“

”علم نجوم تو مجھے آتا نہیں کہ بتا دوں کہ ۶۲ء میں کیا کروں گی اور ۶۵ء میں میرا کیا ارادہ ہے۔“ اس نے خورشیدی کالج پر قرار رکھنے کی سعی کرتے ہوئے کیا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ وہ رسالے پر جھکا رہا۔

”تم البتہ ڈاکٹریٹ لینے کے بعد یہاں کے استاد بن جاؤ گے۔ تنقید پر موٹی موٹی کتابیں لکھ گے۔ ٹی وی کے برین ٹرسٹ کی پینل پر بیٹھو گے۔ دنیا عیش عیش کرے گی۔“

”ہو سکتا ہے۔“

”یا تم ڈاکٹریٹ سے بور ہو کر بنک آف انگلینڈ میں نوکری کر لو۔“

”یہ بھی ممکن ہے۔“

”اچھا اب چلنا چاہیے۔“ چمپا نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اگر میں تمہاری جگہ پر ہوں تو مجھے زیادہ تاخیر نہ کرنی چاہیے۔ ٹرین کا وقت قریب ہے۔ ایسی سرل نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ گویا اب تشریف لے جائیے بیگم صاحبہ۔

چمپا نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کمرے پر آخری مرتبہ ایسی جذباتی حرکتیں کرتے ہوئے وہ خود کو پکڑ لیتی تو بعد میں بہت مادم ہوتی تھی۔ دروازے تک آ کر اس نے سرل کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ دروازہ بہت نیچا تھا۔ کئی سو

سال سے اس پر عشق پیچاں کی گھنی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ کئی سو سال سے ان گنت طالب علم اسی طرح دروازے سے خدا حافظ کہہ کر نکلے تھے اور باہر کی دنیا میں دھکیل دیے گئے تھے۔

سرل نے جھک کر اس کو جانے کا راستہ دیا اور ہاتھ بڑھا رکھا۔ ”اتنے عرصے۔“ اس نے ایک ایک لفظ الگ الگ صاف اور گہری آواز میں ادا کیا۔ ”تم کو جان کر اور تم سے واقفیت حاصل کر کے مجھ بے حد مسرت ہوئی۔ خدا حافظ۔“ وہ عشق پیچاں کئی بیل کے نیچے سے جھک کر باہر نکل آئی۔

”تم مجھے پھاٹک تک نہیں چھوڑنے آؤ گے؟“ اس نے یکفخت اپنی اٹل اڑنی اور ابدی تنہائی کو محسوس کرتے ہوئے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

”نہیں۔“ سرل نے جواب دیا۔ ”مجھے مجھے معہ حل کرنا ہے اور خدا کرے میری تنوم سے دوبارہ ملاقات کبھی نہ ہو۔“ وہ واپس اندر چلا گیا۔

چمپا کو اڈرینگل کے موڑ پر پہنچ کر ٹھکی۔ اس نے پٹ کر دیکھا وہ درتپے کے اندر رسالے پر جھکا معے میں مصروف تھا۔ چمپا نے پھاٹک کھولا اور سنسان سرک پر آگئی۔

سرل نے بالکل صحیح کہا تھا۔ اس روز کے بعد چمپا احمد کی سرل ایشلے سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔



بس ڈہرسٹ کی طرف جانے والی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ میزمل میز کے جنگل شام کا اندھیرا اچھا گیا تھا۔ سڑک کے ایمپ لطیف سے دھندلکے میں ٹمٹمارہے تھے۔ چاروں اور اونچے درخت کھڑے تھے انسانوں کی قسمتوں کے پاسانوں کی مانند خاموش اور سب کچھ دیکھتے ہوئے۔

پھر کئی گھنٹے کا سفر کر کے بس ڈہرسٹ کی طرف مڑی۔ چڑھائی پر دور سے سینی ٹوریم کی روشنیاں نظر آرہی تھیں جیسے اندھیرے میں روشنی کا مینار ہو یا کسی ان دیکھے اسکاؤٹ نے کسی خطرناک پہاڑ پر سنگل کے لیے الاؤ روشن کر دیا ہو۔ دور سے تاریکی میں روشنیاں اس طرح جھلملا رہی تھیں جیسے زندگی روشن ہوتی ہے اور بجھتی ہے روشن ہوتی ہے اور بجھتی ہے۔

گوتم نیلمبر بس سے اتر کر سینی ٹوریم کی طویل سڑک پر چڑھنے لگا۔ اندھیرے کے جنگل میں سے گزرتا ہوا جگمگاتی ہوئی عمارت کی سیڑھیوں پر پہنچا۔ شفاف گیلریاں عبور کرتا نما کے کمرے میں داغ ہوا۔

نرملہ اس کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی۔ اس کے آنے سے پہلے وہ دیوار کی طرف منہ کیے لیٹ تھی اور جانے کیا سوچ رہی تھی۔

”بی بی۔“ گوتم کی آواز یکا یک اس کے حلق میں رندھ گئی۔ باہر کی شور مچاتی، خود غرض، دکھی دنیا سے علیحدہ وہ اتنے سکون سے کاہے کہ انتظار میں مصروف تھی۔

اس کے دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی انگلیوں سے اس نے بال درست کیے اور دل میں سخت جھنجھلا کہ کوئی آئینہ قریب نہیں جس میں وہ جلدی سے اپنا چہرہ دیکھ لیتی۔

”افوہ۔ تم تو بے حد صحت مند نظر آرہی ہو۔ بالکل سرخا سرخ فرخ آبادی  
 “عیادت کرنے والوں کی طرح یہ بٹاش انداز اختیار کرتے ہوئے گوتم نے دل  
 ’س خود کو گالیاں دیں۔ “کیوں گپ مارتے ہو۔ ذرا مراٹھ پر پچر چارٹ دیکھو تو پتا  
 چلے گا بچہ جی کو۔ آج بھی میرا بخارا ایک سو ایک تھا۔ اب تو ممبئیوں سے چلا آرہا  
 ہے۔“ اس نے گویا بڑے فخر سے کہا۔

گوتم ڈوبتے دل سے اس کے قریب بیٹھ گیا مگر وہ خود بہت خوش نظر آنے کی  
 کوشش کر رہی تھی۔ اب وہ اس سے حسب معمول لندن کے تازہ ترین اسکندرز  
 سنانے کی فرمائش کرے گی۔ دوستوں کے جم غفیر کی فردا فردا خیریت دریافت  
 کرے گی۔ بات بات میں جرح کرے گی۔

زملاتو، جس کا میں نے کبھی نوٹس نہ لیا تھا، اب تو میری روح میں شامل ہے۔  
 مگر وہ دو لڑکیوں کو بیک وقت کس طرح چاہ سکتا ہے۔ یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا  
 چمپا \_\_\_\_\_ اور یہ لڑکی \_\_\_\_\_ جس میں چمپا والی کوئی خطرناک خصوصیات  
 موجود نہ تھیں، سیدھی سادی، خوش خلق، معصوم لڑکی۔

”چمپا جو“ وو من آف دی ورلڈ بن چکی تھی، ہمیشہ سے مردوں کو اپنی خطرناک  
 کشش سے رجھاتی آئی تھی۔ تجربہ کار تھی اور زمانے کی اونچ نیچ دیکھے ہوئے مگر  
 اس کے باوجود بے بس تھی اور اس کی توجہ کی منتظر۔ زملاتھی، جو بستر مرگ پر پڑی  
 تھی، گھر یلو، نا تجربہ کار، اس کی توجہ کی منتظر، وہ چمپا کو یکسر بھول جائے گا۔ کس قدر  
 کوشش کے بعد پچھلے پانچ برسوں میں اس نے چمپا کو اپنے خیالوں سے دیس نکالا  
 دے دیا تھا۔ ایہک ملک اور دوستوں کے ایک حلقے میں رہنے کے باوجود اس نے

بڑی کامیابی سے چمپا سے ملنے سے احتراز کیا تھا، مگر اب چمپا کی پکار سے مقابلہ کرنا اس کے بدس میں نہیں تھا۔ یہ پکار میڈرڈ اور روم اور وی آنا بجتے ہوئے آرکیسٹراز میں سنائی دیتی، بارش کی پھوار میں، بازاروں اور طعام خانوں کی چھل میں اظہار تک کی لہروں میں تیویارک کے شور و شغف میں، \_\_\_\_\_ ہر جگہ یہ پکار اس کا پیچھا کرتی آرہی تھی۔ آوازوں کے ظلم سے وہ عاجز آ گیا تھا۔ شاید سنانا اس کے مقدر میں نہ تھا۔ چمپا آواز تھی، نرملا سنانا۔ چمپا نے اس سے طرح طرح کی باتیں کی تھیں، لکھنؤ کے بادشاہ باغ کی سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے، کوسی نگر کے کھیتوں کی پلڈنڈیوں پر سے گزرتے، گل فشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور پروفیسر بنرجی کے گھر اور کیلاش ہوٹل کے ڈرائنگ رومز میں بیٹھے ہوئے، پلنگوں میں اودھم مچاتے ہوئے۔ اسے وہ سب باتیں یاد تھیں، وہ سب شامیں، دوپہریں، لکھات۔ یہ سب سرفضا میں موجود رہتا ہے۔ نرملا خاموش تھی۔ گو متی خاموش تھی۔ برسات کی دوپہر کا سکون، جب بارش ہو کر کھلی ہو۔ کھر آلودہ سڑکوں کے کھیتوں کا سنانا۔ نرملا نے اس سے کبھی شخصی باتیں نہ کی تھیں، چمپا کے ہر لفظ ہر انداز کے ذریعے دوسرے انسان سے ایک غیر مرئی (mystic) رشتہ قائم ہو جاتا تھا۔

اسے یاد آیا: مدتیں گزریں جب وہ پہلی بار لکھنؤ گیا تھا۔ اس نے سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھ کر اپنی اس وقت کی محبوبہ شاننا نیلمبر کو خط میں لکھا تھا کہ گو مجھے آفیشل طور پر پردھوے کے لیے یہاں بلایا گیا ہے مگر میری ہونے والی مگلیترزل رانی کو اپنی انٹی سیدھی بحثوں ہی سے فرصت نہیں جو وہ میری طرف توجہ کریں۔ ہاں نرملا میں بڑی شان اور تمکنت تھی۔ اس میں خود سپردگی کا انداز کبھی نہ

آیا وہ علیحدہ رہی تھی۔ غیر شخصی اور خاموش۔۔۔۔۔ وہی کی طرح بلند اور اترم۔ وہی کی طرح سکون بخشے والی۔ اب مجھے تھوڑا سا سکون بخش دے۔۔۔۔۔ اس نے نرملا پر جھک کر ول میں کہا اور اس کے ماتھ پر ہاتھ رکھا۔

”گوتم!“

“باب بی بی”

”سرمیکھا کا نیافلیٹ کسما ہے؟“

اس نے تفصیل سے سر یکھا کے مکان کا جغرافیہ سمجھایا۔ ”اب اچھی ہو جاؤ تو آکر خود ہی دیکھ لیں۔“

”ہاں بالکل“ ترملا نے بڑی گرمجوشی سے جواب دیا۔

”آج کل ایک نئے بزرگ آئے ہوئے ہیں، طغیان بھاگل پوری۔“

”ہائے کتنے مزے کا نام ہے۔ کریک ہیں؟“

“ ۳۳ ”

”چندرا بھی ہے؟“

“ہاں ہاں”

”تمہارے نئے نئے دوستوں کا ذکر سن کر اس قدر دل چاہتا ہے کہ ان سے ملوں، خصوصاً رمیش سنگوی سے۔“

”ہاں۔ ریش سنگوی بالکل آفت کا پر کالہ ہے۔“ گوتم نے مزید بے معنی انداز میں کہا۔

”اب رات زیادہ آگئی ہے گوتم ماشٹرم۔“ نرملانے حسبِ عادت مَمال اور ہری

شکر کے لہجے میں اس سے کہا۔

”ہاں۔“ وہ کرسی پر سے اٹھا۔

”ارے ارے رے ایک بات تو سنو۔“ دفعتاً نرملانے ہٹا شیشے سے کہا۔

”اتنی زبردست خبر پوچھنا تو بھول ہی گئی۔“

”کیا گوتم نے آہستہ سے پوچھا۔“

کل طلعت بتا رہی تھی کہ چمپا باجی اپنا فائل امتحان دینے کے بعد کیمبرج سے لندن آگئی ہیں۔ تم کو معلوم ہے؟

”نہیں۔ گوتم نے کہا اور اپنے آپ کو دل میں پھر کئی گالیاں دیں۔“

”اچھا۔“ نرملانے سادگی سے جواب دیا۔ ”میرا خیال تھا شاید طلعت نے بتایا

ہو۔ تم ان سے مل لو ضرور بے چاری سے۔“ اس نے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔

مجھے آج کل اتنی فرصت کہاں ہے نزل کہ میں لوگوں سے سوشل ملاقاتیں کرتا

پھر روں۔ ایچ۔سی (انٹی کمشنر) رات کے دس دس بجے تک کام کروا رہے ہیں۔ اس

نے نظریں پچاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”اچھا بی بی، خدا حافظ!“ وہ تیزی سے

دروازے سے باہر نکل گیا، گویا نرملا کے سامنے سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتا

ہو۔

نرملا، جس کا چھٹا حس بیدارہ ہو چکا تھا، سمجھ گئی کہ گوتم نے اس سے جھوٹ

بولی ہے۔ اس کو چمپا باجی کی آمد کی اطلاع ہے اور اس کے چہرے کی بدلتی رنگت کو

دیکھ کر نرملا کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ وہ چمپا باجی سے ضرور ملے گا۔

نرملانے آہستہ سے بیڈ سوچ دبا کر روشنی بجھائی اور پھر دیوار کی طرف منہ کر

کے یٹ گئی۔

۸۶

گوتم نے نرملا سے جھوٹ بولا تھا۔ اس روز مکڈ ہرسٹ آنے سے کچھ دیر قبل اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اسے بڑی جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ اس کی کار کوئی دوست لے گیا تھا اور روکٹوریہ اسٹیشن جا کر وہاں سے مکڈرسٹ کے لیے گرین لائن کی بس پکڑنا تھی۔ خواہ مخواہ کی دیر ہوئے جا رہی تھی اور اب یہ فون آ گیا تھا۔

اس نے ریسیور اٹھایا۔

آواز \_\_\_\_\_ اس کے کانوں میں پہنچی

”گوتم \_\_\_\_\_ ہلو \_\_\_\_\_ ارے بھئی گوتم“

وہ خاموش رہا۔

”گوتم بیلنمر۔“ دوسرے سرے پر چمپا نے زور سے کہا۔ ”کیا بات ہے؟ میری آواز سن رہے ہو۔“

”سن رہا ہوں۔“

”فون خراب ہے کیا؟“

”نہیں تو۔“

”شرم کرو۔“ چمپا بڑی نارمل آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”ڈوب مرو جی \_\_\_\_\_ حد ہے۔ میں اتنے برسوں سے یہاں ہوں اور تم کو ایک روز بھی تو فیتق

نہ ہوئی کہ مجھ سے مل لیتے کیا میں کھا جاتی تم کو؟“ پھر وہ ہنسی وہ چپکارہا۔

انتابڑاڈپلو میٹ اور حاضر جواب بذلہ سنج آدمی اور اس سے مطلق کوئی جواب نہ بن پڑا اور چمپا نے کہا تھا: ”میں کیمرج سے آگئی ہوں اور جون کارٹر کے یہاں ٹھہری ہوں۔ آؤ کسی روز ملنے تعلیم کا زمانہ بالآخر ختم ہو چکا۔ اب مجھ فرصت ہی فرصت ہے۔“

”ہاں چمپا، میں ضرور آؤں گا۔“ گوتم نے ہڑبڑاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ”دراصل \_\_\_\_\_ وہ تم جانتی ہوں لندن کی زندگی کس قدر ہنگامہ خیز ہے اور پھر فارن سروس کی مصروفیات، یہ کوئی لکھنؤ یونیورسٹی کا زمانہ تھوڑا ہی ہے کہ گھنٹوں بیٹھے گپ کر رہے ہیں۔ اور پھر میرا کام بھی ایسا ہے کہ مستقل دورے پر رہتا ہوں۔ آج ہائی کمشنر کے ساتھ یہاں جا رہا ہوں، کل وہاں جا رہا ہوں۔ جب کبھی کشمیر کیس یو۔ این۔ میں جاتا ہے تو کرشنا مینن کے ساتھ پندرہ چکر نیویارک کے لگانے پڑتے ہیں \_\_\_\_\_ ویسے میں تمہاری خیریت دوستوں سے برابر دریافت کرتا رہا۔“

اس نے کامیابی سے بات ختم کی اور بے انتہا زورس ہو کر سگریٹ جلایا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ چمپا دوسرے سرے پر اس کی آواز سن کر اس قدر مسرور ہے جیسے اسے ساری دنیا کی دولت مل گئی ہو، جیسے اسے راج سنگھاسن پر بٹھلا دیا گیا ہو۔

مڈپہر سٹس واپسی میں رات کے بارہ بج گئے۔ اپنے فلیٹ پر پہنچ کر اس نے ڈرتے ڈرتے فون اٹھایا اور جون کارٹر کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہلو۔ کون ہے؟“ ادھر سے نیل کی سوتی سوتی آواز آئی۔

”مس احمد ہیں؟“

”نہیں۔“

”کہاں چلی گئیں؟“ اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

”آپ کون صاحب ہیں۔“

”نیلمبر۔“

”ہلو ہو۔۔۔۔۔ ہلو مسٹر نیلمبر۔۔۔۔۔ مس احمد نے شام کو کئی بار آپ کو فون

کیا تھا مگر آپ شاید باہر چلے گئے تھے اس وقت تو وہ جون کے ساتھ کہیں گئی

ہوئی ہیں۔“

”اوہ۔“

”آپ نے گینگ کے باقی افراد کے یہاں فون کر لیا؟ کوئی ضرورت

ہے؟“ گوتم کی آواز کی سراسیمگی محسوس کر کے نیل نے کہا۔

”فیروز مسٹر یکھا، زرینا، کملا، طلعت۔ ان سب کے یہاں فون کر دیکھیے۔ شاید مل

جائیں۔

”بہت بہت شکریہ نیل۔ میرے خیال میں اب رات بہت آگئی ہے، کل

دیکھا جائے گا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ گڈ نائٹ۔“ اس کو اپنی حماقت کا احساس

ہوا، اس نے ریسیور رکھ دیا اور سگریٹ جلا کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔



اس رات ٹیمز کی ایک لانچ پر بہت سی لڑکیوں اور لڑخوں نے ایک پارٹی کی تھی۔ جون کے ساتھ چہما وہاں گئی اور رات گئے تک وہ لوگ عرشے پر ناچتے رہے۔ کشتی میں چمپا کو بہت سے اجنبی چہرے نظر آئے: کالے، گورے، انگریز، فرانسیسی۔ لندن مجلس کے چند لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ ریلنگ پر جھکے وہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔

ارے یہ پروگریسو ہو گئیں! جون کارٹر کے ساتھ گھومتی ہیں، سنا ہے پہلے تو بڑی سخت لگتھیں انڈیا میں۔ کسی نے چپکے سے اپنے ساتھی کے کان میں کہا۔  
”ممکن ہے پاکستان کی جاسوسی کرتی ہوں۔ کیا بھروسہ“

”یہ بھی ٹھیک ہیا اور پھر ہندوستانی مسلمان! ان سے زیادہ دوغلا اور خطرناک کون ہوگا؟“ ایک مراٹھی ڈاکٹر نے کہا۔

”اور سنا ہے“ پہلے نہ کہا، ”رضا جو مال اور طلعت کا کزن ہے، اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ اس نے گھاس نہیں ڈالی، وہ آج کل کیمرج والی روشن کے چکر میں ہے کیونکہ روشن کا باپ کسی منسٹری کا سکرٹری ہے۔“

”روشن کو بھی رضا نے گھاس نہیں ڈالی کیونکہ اس بے چاری کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”باپ کا انتقال اصل وجہ نہیں، دراصل اس کا جی بھر گیا۔ پور ہو گیا بچا رہ۔“  
”میں یہ نقطہ نظر خوب سمجھ سکتا ہوں۔ لڑخیوں کے ساتھ یہ کیا مصیبت ہے کہ جہاں ذرا سی دلچسپی ان میں لی اور وہ فوراً شادی پر تیار۔ میں رضا کے نقطہ نظر کو خوب سمجھتا ہوں بھائیو۔ کیونکہ کل میں ایلن سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔“

فوراً بلز شروع ہو گیا: ”یہ آندرے کی آزادی کی آخری رات ہے، اس رات کو اچھی طرح منالو بھائیو۔“ سال نے اسٹول پر چڑھ کر رقت انگیز آواز میں کہا۔ وہ سب بوٹ سے اتر کر شور مچاتے قریب کے ایک پب کی طرف روانہ ہو گئے۔

عرشے پر صرف لڑکیاں رہ گئیں اور وہ نوجوان جس نے سب سے پہلے یہ تذکرہ چھیڑا تھا، سیڑھیاں اترتے ہوئے سال سے بولا:

”عامر رضا بڑا سمجھ دار آدمی ہے۔ ہم کو چاہیے اس سے ٹریننگ لیں۔ آخر یہ لڑکیوں سے شادی کرنے سے صاف کیسے بچ جاتا ہے۔“

”مگر دیکھ لینا آخر میں کرکری کھائے گا۔“

”اجی بعد کی بات دیکھی جائے گی، فی الحال تو عیش کر رہا ہے۔“

”ہاں بھائی۔“

”اور یاریہ کزن شاہ رخ سلطانہ کون ہیں، تمہاری رشتہ دار ہیں؟“

”آج تک تو میں نے ان کا نام سنا نہیں تھا، شاید پاکستان میں بھی صاحب کی کوئی عزیز پیدا ہو گئی ہوں۔“

”جرمن سننے ہوتے آئے تھے، یہ پاکستان کزن کی قسم آج ہی معلوم ہوئی۔“

”دراصل یہ نوجوان خاتون کسی وزیر کی بھتیجی ہیں۔“

”اوہ آئی سی۔“

”آوازیں ڈو پتہ چلی گئیں۔ کشتی آگے بڑھ گئی۔ چپا اتر کر کنارے پر واپس آگئی اور قلو پطرہ کی موٹی کے نیچے آن کر بیٹھ گئی۔ سامنے دریا بہہ رہا تھا۔“

اسے معلوم نہیں تھا کہ چند روز قبل عامر رضارات بھر یہیں اسی جگہ پر بیٹھے رہے تھے۔ اس رات بھی پورنماش کا چاند دریا کی ابروں پر بہہ رہا تھا اور عامر رضا کو بے حد ڈر لگا تھا، اپنے آپ سے، دنیا کے حس سے، مستقبل سے۔ ان کے سامنے کوئی خطرات نہیں تھے، کوئی مسائل \_\_\_\_\_ صرف ان کے ذاتی غرور کا مسئلہ تھا مگر اس کا تعلق پتھالوجی سے تھا اقتصادیات سے نہیں۔ قلوبطرح کی سوئی کے سائے میں بیٹھے بیٹھے ان کو ان لڑکوں کا خیال آیا تھا جو تلاش معاش میں سرگرداں تھے اور لڑکیوں کا جن کو عامر رضا نے چھوڑ دیا۔ روپیہ اصل چیز ہے۔ روپیہ اور عزت اور ایک کوٹھی، اپنی ذاتی۔ ساٹھ ہزار کی مالیت کی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی، ڈرگ روڈ، کراچی میں۔ ایک امریکن کار۔ فریجڈیرریڈیو گرامی زندگی کی اصل حقیقت، اتم حقیقت صرف یہ چیزیں ہیں۔ زندہ باد زندگی۔ مجھے سے سے کوئی شکایت نہیں۔ صبح ہوتے میڑھیوں سے اٹھ کر وہ کار کی طرف چلے گئے۔ دوسرے روز وہ چھٹی لے کر شادی کرنے لکھنوجا رہے تھے۔“

۸۸

”میں ایک کتاب لکھنے والا ہوں جس کا نام ہوگا پورٹریٹ آف دی آرٹسٹ  
ایز اے ڈون ٹوان“ کمال نے منہ لٹکا کر کہا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ طلعت نے ہمدردی سے پوچھا۔

”بس یونہی \_\_\_\_\_ اب جیمز جوائس اور ڈالین طامس کے بعد۔“

”کل ڈلن طامس نے بل کے یہاں بڑے مزے کی باتیں کیں۔ ترنگ میں  
تھے موانا۔“ شکر نے مڑ کر کہا۔

”اجی وہ تو تھے۔ آپ کس ترنگ میں ہیں آج کل؟“ گلشن آہوجہ نے سال  
سے پوچھا۔ ”یہ کیا پڑھ رہے ہو۔“

”کچھ نہیں۔ یار خط آیا ہے گھر سے۔ یعنی لکھنو سے۔“

”کیا خبریں ہیں؟“ طلعت نے پوچھا۔

وہ سب سر یکھا کے وسیع ڈرائنگ روم میں فرش پر ناٹکیں پھیلائے بیٹھے تھے  
جس کا بڑا دروازہ باغ میں کھلتا تھا۔ بہار کا روشن دن تھا۔ سر یکھا دلیز کے پاس بیٹھی  
مشین پر لہنگے کی آڑھی گوٹ سی رہی تھی۔ طلعت اور فیروز باورچی خانے میں کھانا  
پکانے میں مصروف تھیں۔ ہری شکر بھی ان دنوں ہو ہیں موجود تھا جو اسٹیشن سے  
آیا ہوا تھا اور قاہرہ جا رہا تھا۔ ”یہ ہری شکر اور گوتم کے مزے ہیں۔ بالکل ابن  
بطوطہ بنے ہوئے ہیں۔ آج کل، صبح گوتم کا فون آیا تھا پھر ماسکو جا رہا  
ہے۔“ گلشن نے اظہار خیال کیا۔

”گوتم تو ہیون سا نگ بھی یہ۔ سال نے کہا۔“ اکثر چین سے آیا کرتا ہے۔“

باغ میں چند راما تھر نے ایک اور گیت شروع کر دیا۔ ان سب کی پرانی دوست  
چندرا، جو نیویارک سے دلی جاتے ہوئے زرینہ کے یہاں لندن میں ٹھہر گئی تھی،  
بہت اچھا گاتی تھی۔ ڈرائنگ روم کے دوسرے سرے پر طغیان صاحب سر یکھا  
کے شو ہر گلشن آہوجہ کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔

بڑا خوشگوار اور پرسکون اتوار کا دن تھا۔ باغوں میں پھولوں کا سیلاب آیا ہوا

تھا۔ صبح صبح جب چمپا جون کارٹر کے گھر سے سیکھا کے یہاں آنے کے لیے بس میں سوار ہوئی تھی تو بس کا بوڑھا کنڈکٹر اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا تھا اور اس نے اپنی ٹوپی چھوتے ہوئے کہا تھا: ”مانی ڈیر‘ تم بے حد خوبصورت لگ رہی ہو۔ تمہارے بوائے فرینڈ تمہیں دیکھ کر بہت مسرور ہوگا۔ خوب خوشی سے اتوار مناؤ۔ دنیا بڑی مہربان تھی اور خوشگوار کون کہتا ہے کہ دنیا غم خانہ ہے اور نلانا ہے اور ڈھمکانا ہے۔ دنیا تو بے حد آرام دہ حسین جگہ ہے۔

وہ بے حد خوش تھی کل اس نے گوتم س فون پر باتیں کی تھیں۔ اتنے برسوں بعد آج اس کی آواز سنی تھی۔

وہ سر یکھا کہ یہاں پہنچی یہاں محفل جمی تھی، وہ بے حد مسرت کے ساتھ سب سے باتیں کرتی رہی۔

”رات کی پارٹی میں بوٹ پر بڑا چنڈو خانہ رہا۔“ مال نے اس سے کہا۔  
”آپ کے بچے تک گھر پہنچ گئی تھیں؟“

”ہم جب پہنچے تو ٹرینیں بند ہو چکی تھیں۔ اسٹریڈ سے گھر تک پیدل آئے۔“

”کیا خبریں ہیں ابھی۔ کس کا خط ہے؟“ طلعت نے باورچی خانے سے سر نکال کر دوبارہ پوچھا۔

”اپنی کا۔“ مال نے جواب دیا۔

”میاں ہری شکر۔ اے بھائی ہری شکر ہوت“ طلعت نے باورچی خانے میں آواز دی ہری شکر جو باغ کے دروازے میں کھڑا تھا پلٹ کر اندر آیا۔ ”لو یہ گرم

گرم پوریاں۔ چمپا باجی کدھر ہیں۔ یہ پلیٹ ان کو دے آؤ۔“

وہی گلفشاں کا گھر بلو ماحول یہاں بھی موجود تھا۔ گھر۔ جو اسے کبھی میسر نہیں

ہوگا۔ چمپا کو ایک درتپے کی نشست میں بیٹھے بیٹھے ایک پھریری سی آئی۔

ہری شکر نے پلیٹ ہاتھ میں لے کر کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔

چمپا دوسرے سرے پر درتپے میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ سب یاد آتا تھا۔

نکار خانوں کی زندگی۔ فرن کے پتے۔ درتپے میں جھانکتا ہوا پیرس کا مدہم

سورج، یوہیمیا، برآمدے میں رکھی ہوئی جدید وضع کی آرام کرسیاں، دھاری دار سن

شید، ایک کابل الوجود ذوق فی زندگی جس میں فلسفے تھے اور نیا فرانسیسی ادب، بڑے

سائز کے سمفی کے ریکارڈ، سائز برگ یک موسیقی کے تھپوار، کیمبرج کے کوڈرینگل

اور جانے کیا کیا۔ اسی قسم کی چیزیں جن کی ایک علیحدہ دنیا نیویارک کے گرینچ وینچ

پیرس کے بائیس ساحل اور یہاں لندن کے چیلسی اور سینٹ جانز وڈ میں آباد تھی۔

اس دنیا کے باسیوں کے یہاں بڑے گھرے جذباتی تجربے تھے اور ادراک اور

ماورائی قسم کی گفتگو۔ چمپا باجی تم تو بہت جلد ایک دوسرے سرے پر پہنچ گئیں۔ پتا

نہیں اب تم کھل کر ہنستی بھی ہو یا نہیں۔ اندرونی توازن تم نے قائم رکھ لیا نہیں جس

کی تم کو ہمیشہ بڑی تلاش تھی۔ اب سریکھا، طلعت، میروزان لڑکیوں ہی کو دیکھ لو۔

کیسی سمجھ دار ہیں۔ ایک سے ایک۔ لڑکیوں کا معاملہ دراصل بڑا بے ڈھب ہوتا

ہے۔ ایک دفعہ میں نیا پارلگ گئی تو لگ گئی ورنہ پڑا ہوا۔ ہم تو صاحب یہ جانتے

ہیں۔ ”چمپا باجی، لوپوریاں کھاؤ“ اس نے با آواز بلند کہا۔

چمپا کے قریب جا کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا، جس طرح سنگھاڑے والی کوٹھی

کے لان پر وہ اس کی کرسی کے قریب بیٹھا کرتا تھا۔

”ان سب کو کیا ہوگ یا۔ سب چپ ہو گئے ایک دم۔“ طغیان صاحب نے باتیں کرتے رکتے رک کر گلشن سے سرگوشی میں پوچھا۔

”ان سب پر خیالات سوار ہیں۔“ گلشن نے اپروائی سے جواب دیا۔

”بڑا پرسکون سے ہے۔“ طغیان صاحب نے کہا۔ ”سریکھا دیوی کیڑے سینا بھی جانتی ہیں۔ مجھے گیان نہت صا۔ مال جی پوریاں کھا رہے ہیں۔ چندرا دیوی سچلوا ری میں مرغیاں چراتی ہیں۔ طلعت جی پھلکیاں تل رہی ہیں، یہ تو بالکل گرو دیو یگور کے ناولوں جیسا ماحول ہے۔ پرسکون۔ شاعرانہ دھڑ۔“

”اجی دیکھے تھے یگور کے ناول۔“ گلشن نے چڑ کر کہا۔ ”طلعت تم نے ساری پوریاں جلا دیں اٹھا کر۔ چائے بھجواؤ۔“

طغیان صاحب پھر مرا تے میں چلے گئے۔

”ہلو۔ ہری شکر۔“ چمپا نے اخبار پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر کہا۔ ”کیا بات ہے۔“

اب پوچھتی ہیں کیا بات ہے۔ قسم خدا کی ان کی دھاندلی کی حد نہیں۔ ”کچھ بھی تو نہیں چمپا باجی۔ چائیس کی۔“

”بنادو۔“

اس نے پیالی اٹائی۔ چھپے نچے کر گیا۔

ہم ایک دوسرے کی زندگیوں میں گھسے زندہ ہیں اور مستقل ایک دوسرے کو مارتے جلاتے رہتے ہیں۔ ”چمپا باجی۔“ ہری شکر نے کہا۔ ”تم ہم سب میں گریٹ ہو۔ کیونکہ تم میں محبت کی اتھاہ بے پناہ اہلیت موجود ہے۔“ اس نے دفعتاً

آہستہ سے کہا۔ ”سنو۔۔۔ یو۔۔۔ این۔ میں ایک بڑی اچھی جگہ نکلی ہے، انڈیا کے کوٹے میں۔ اس کے لیے کروں کوشش تمہارے لیے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔ میں عمر بھر اسی طرح ماری ماری پھروں گی؟“

”اس کے علاوہ اور کرنا بھی کیا ہے تمہیں۔“ ہری شکر نے کہا۔ پھر معاً اسے اپنی اس فاش غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے کسی چھوٹے موٹی اینٹ کے بجائے پورا پہاڑ لڑھکا دیا تھا، مگر یہ تو بڑی بہادر، فرخ دل آدمی ہیں۔ اس کا کیا برامانیں گی۔ ”میرا مطلب ہے۔۔۔“ اس نے ہڑبڑا کر بات بنائی۔ ”کہ تم میں اتنی خود اعتمادی ہے۔ تم اوروں کی طرح تھوڑا ہی ہو کہ کہیں چوہا ہنڈیا لے کر بیٹھ جاؤ۔“ اس نے باورچی خانے میں گھسی لڑکیوں کی طرح دیکھ کر کہا۔ اجی میں تو کہتا ہوں، تم تو ایورسٹ تک مزے سے چڑھ جاؤ گی دند و ناتی ہوئی۔ تم بڑی گریٹ ہو چمپا باجی۔۔۔“ اب اس کی آواز میں رقت آگئی۔ اسے چمپا پر یکلخت بے حد ترس آرہا تھا۔

وہ خاموش بیٹھی باغ کو دیکھا کی۔

کمرے کے دوسرے سرے پر اب باتیں پھر زور سے شروع ہو چکی تھیں۔

چمپا کو یکلخت ایسا لگا جیسے خاتمہ اب بالآخر آن پہنچا۔ کمرہ بڑے زور سے مانا چنے لگا۔ باغ میں گھومتی چند را سے قدیل کی طرح چکر کاٹتی نظر آئی۔ کمرے میں بیٹھے لوگ کٹھ پتلیوں کی طرح عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔ طغیان صاحب اسے ایک بہت عظیم انجھ نظر آئے جو نیچے سروں میں قانیں قانیں کر رہی



تھی۔ میں دوانی ہو جاؤں گی۔ اس نے آہستہ سے کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ہری شکر نے اس کی آنکھوں میں آنسو پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔

”چمپا باجی۔“ اس نے کہا۔ ”محبت کو خدا را جذباتیت میں تبدیل نہ کرو۔۔۔ تو ازن ضبط، تناسب، کلاسیک گریک امیڈیلز اصل چیز ہیں۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔“

”کیا معماروں کی سی باتیں کرتے ہو۔۔۔“ چمپا کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ ”میں محبت کر رہی ہوں یا کوئی عمارت کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف ہوں۔“

”چمپا باجی۔۔۔“ ہری شکر نے اسی طرح احتجاجاً کہا۔ ”تمہارے خیالات تھک ہیں۔ ہمیشہ تھے۔ تمہارے جذبات میں واگز کا بوجھ ہے۔ پہلے بھی تھاب زیادہ ہو گیا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ تم اپنی روح کی پیورٹی کو تباہ کیے ڈال رہی ہو۔۔۔ دس سال گزر گئے مگر تم بالکل نہ بدلیں۔“

جون اور اوجیت پارٹی کی تاریخ لے کر اندر آئے اور مال کی طرف چلے گئے۔

”ہری شکر۔۔۔“ چمپا نے جھک کر کہا۔ ”مجھ پر ترس نہ کھاؤ مجھے شکست کا احساس آج تک نہیں ہوا“ میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ شکست کیسی ہوتی ہے۔“

ڈائینگ ٹیبل پر سے طغیان صاحب کی آواز بلند ہوئی۔ ”ہم سب سائے ہیں

سائے۔“ وہ گلشن سے کہہ رہے تھے۔

”جی ہاں درست ہے۔“ گلشن نے پور ہو کر سگریٹ جلایا اور چمپا کی طرف بے دھیانی سے دیکھنے لگا۔

”کیونسٹوں نے مارکنز کو تباہ کر دیا۔“ طغیان صاحب نے جون کارڈ پر نظر ڈال کر دوسرے موضوع شروع کر دیا۔

موصوف بڑے زبردست سوشلسٹ تھے۔ صوفی ازم ان کی سائیڈ لائن تھی۔ انہوں نے پندی میں بہت سے ناول لکھ ڈالے تھے۔ اب انگریزی میں لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ان کا پورا نام رائے ہرنس رائے طغیان بھاگلپوری تھا۔ بہار کے رہنے والے تھے۔

”میرے حضرت نے مجھ سے کہا“ انہوں نے کہنا شروع کیا۔  
ان کے ایک مسلمان گرو ہیں جو سرینگر میں رہتے ہیں۔“ ہری شکر نے چپکے سے چمپا کو بتلایا۔

”میرے حضرت نے مجھ سے کہا: بچہ تو روس جا۔“  
”اور ان ملعون لحدوں کو بھی سوشلزم کی مشعل ہدایت دکھلا کر راہ راست پر لا۔“  
”طلعت نے باورچی خانے میں سے اقمہ دیا۔

”انہوں نے تو بھی اپنے حضرت کو بھیا چھا سدھایا۔“ چند رائے باغ کے دروازے میں آ کر کہا۔

طغیان صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔  
”یہ کون مہیلا ہیں؟“ انہوں نے سر یکھا سے دریافت کیا۔

”یہ مہیلا بھی بڑے پروگریسو و چاروں کی مالک ہیں، لیکن ڈالرمائے کی اولیش سے نیویارک کی آکاش وانی سے ہندی میں سماچار سنایا کرتی ہیں، ان کا ومان ابھی ہی یہاں پہنچا ہے۔“ کمال نے جواب دیا۔

”آپ بہار کے رہنے والے ہیں؟“ چند رائے شگفتگی سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ طغیان صاحب نے خفا ہو کر کہا۔ ”ہوں تو سہی پھر“

”ارے۔ میرا مطلب تھا۔ تب تو آپ شاید گوتم نہیلمبر کو جاتے ہوں۔ اس نے پٹنہ یونیورسٹی میں پڑھا ہے۔“

”جانتا ہوں۔۔۔۔۔ بیوقوف چھو کر ا ہے۔“ طغیان صاحب نے مختصر ا کہا۔  
 - ”ہاں تو میں کہہ راہ تھا کہ ہم سب سائے ہیں۔ میں بھی، گوتم نیلمبر بھی  
 تمہارا۔۔۔۔۔ میرے حضرت نے کہا تھا۔“

”سماں \_\_\_\_\_ طلعت پتیلیاں چولہے سے اتار کر جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی  
ماہر آئی۔“ اُبی نے کیا لکھا ہے خط میں۔“

”ارے ہاں \_\_\_\_\_“ مال نے اوجھٹ سے باتیں کرتے ہوئے مڑ کر کہا۔ ”کچھ نہیں۔ بھیا صاحب کی شادی ہو گئی۔“

”ہائیں۔۔۔ وہ کب؟“ کورس ہوا۔ ہر ایک اپنی جگہ سے اٹھل پڑا۔

”اتنی بڑی بات ہوگئی اور تم گپ چپ کالڈو بنے بیٹھے ہو۔“ طاعت نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”ایسی کون بڑی بات ہو گئی بھیجی۔ ہم سب سمائے ہیں۔“ مال نے اطمینان سے کہا۔ ”ابھی تم نے سنا ہے طغیان صاحب کے حضرات کیا کہتے ہیں۔“

”تم بکواس مت کرو۔“ ہری شنکر نے چھلانگ کر کمرے کے وسط میں آتے ہوئے کہا۔ ”تفصیل سے واقعہ بتاؤ۔ کیا لکھا ہے اپنی نے۔“

”یار۔ ہوا یہ کہ۔“

”شروع سے شروع کرو۔“ طلعت نے حکم دیا۔

”خوب نمک مرچ لگا کر سناؤ ورنہ لڑکیوں کو چین نہیں آئے گا۔“ گلشن نے حسب معمول اپنے سوتے سوتے انداز میں کہا۔ سب مال کے چاروں اور آن بیٹھے اور کان کھڑے کر کے قصہ سننے لگے۔ مال نے ماہر فن داستان گو کی طرح سگریٹ مٹھی میں لے کر لمبا کش لگایا۔ چپا درتپے میں بیٹھی ان سب کو دیکھتی رہی۔

”بھائیو اور بہنو۔۔۔ تم کو معلوم ہی ہے۔ کہ بھیا صاحب بے چارے بڑے زبردست سوشل کلائمبزر۔“

”یہ کیسے۔ لکھنؤ میں تو نہیں تھے۔“ غیروز نے اعتراض کیا۔

”تم اب نما لکھنؤ لیے پھرتی ہو بات بے بات۔ بھیا صاحب اور ان کے وہاں کی ویلیوز۔۔۔“

”پھر سیاست شروع ہوئی۔“ گلشن نے کہا۔ ”یہ تم تو اپنے بھیا جی کا قصہ سناتے لگے تھے۔“

”سناتے لگے تھے نہیں یا رسنانے والے تھے۔ تم پنجابی ادبدا کر غلط اردو بولتے ہو۔“ ہری شنکر نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

”ارے جا۔ یو۔ پی کے بنے۔“ گلشن نے جواب دیا۔

”لاؤ بھئی۔ اپنی کا خط دو۔ ہم باہر جا کر خود پڑھ لیں۔“ غیروز نے تنگ آ کر

کہا۔ ”تم لوگوں کو لونڈیاں ہار پارٹی کبھی سنجیدہ ہونا جاتی ہی نہیں ہونہ۔“

”ہاں تو ہوا یہ کہ بھیا صاحب ایک سوشل کلائمر \_\_\_\_\_ جب روشن کراچی واپس گئی یہ اس سے بہت پہلے ہی ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ بے چاری کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اب شاہ رخ سلطانہ منظر پر آئیں مگر کراچی میں حکومت تبدیل ہو گئی۔“

”\_\_\_\_\_ ایں \_\_\_\_\_ اس کا کیا مطلب جو بات کی بے تکی۔“ ہری شکر نے کہا۔

”ارے۔ اس کا مطلب یہ کہ کزن شاہ رخ کے ابا منسٹر نہیں رہے۔“

”اوہ“

”اب لکھنؤ سے ہماری والدہ یعنی بھیا صاحب کی چچی کے خط پہ خط آنے شروع ہوئے کہ میرا چل چلاؤ کا وقت ہے۔ میاں تم گھر بسالو۔ ایک ایک کر کے گلشناس سے پنچھی اڑ گئے، کم از کم تم یہاں آ کر بہو کا دولا ہی لے جاؤ۔ طلعت ذرا چاہنا۔“

~~~~~

~~~~~

”اور بل چھوڑنے والا ہے اسے۔“

”زیادہ تر انٹلکچول لوگ اپنی بیویوں کو چھوڑ دیتے ہیں..... اگر چہ وہ خود بھی انٹلکچول ہوتی ہیں۔“ کمال نے لاپرواہی سے کہا۔ ”تم لوگ تو یار لندن کی ایک

انسائیکلو پیڈیا اسکندلیکا مرتب کر ڈالو۔ ریفرنس کے لیے آسانی رہے گی۔“  
”روشن کی بھی سنا ہے شادی ہو گئی کسی بڑے افسر سے۔“ طلعت نے کہا۔  
”مبارک ہو.....“ کمال نے جواب دیا۔

”بے چاری چلی گئی واپس اپنے خول میں.....“ عمیر وڑبولی۔ ”بیکار اس نے یہ  
سارا جھنجھٹ کیا۔“

”یہ لڑکیا عشق کیوں اور کیسے کرتی ہیں آج تک میرے پلے نہ پڑا۔“ طلعت  
نے کہا۔

”ارے یا رخدا کے لیے آہستہ بولو.....“ وہ ٹبل رہی ہیں سامنے باغ میں۔  
کمال نے کہا۔

”ہماری نگریا میں آئے بسو بنواری۔“ طلعت نے لوفروں کی طرح گانا شروع  
کیا۔ لڑکیاں اٹھ کر ایک کونے میں چلی گئیں۔

”آج کل ان کا کیا سلسلہ ہے۔“ سر یکھا نے چپکے سے پوچھا۔  
”میاں۔ میاؤں۔“ کمال نے دور سے چڑایا۔

”یاروہ سرل اسٹیلے تو کل میں نے دیکھا شینڈا مکر جی کے یہاں ڈٹا ہوا تھا۔ کیا  
وہ بھی سکون دل کی خاطر.....“ طلعت نے پوچھا۔

”واہ عین عین معلوم ہو رہا ہے مسلم اسکول لکھنؤ کی سیکنڈ آہیر میں پڑھنے والی  
لڑکیاں گفتگو کر رہی ہیں۔“ کمال نے کہا۔ سر یکھا اور طلعت اور زگیش سنی ان سنی  
کر کے کھس پھس کرتی رہیں۔

”یہ لوگ کتنی ہی افلاطون کیوں نہ بن جائیں گی وہی کشمیری محلہ گرنز

اسکول لکھنؤ۔“ مال نے دوبارہ کہا۔

”سوال یہ ہے۔“ فیروز نے فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کٹڈل کلاس لڑکیاں اتنی رومان پرست کیوں ہوتی تھیں۔“

”ہوتی تھیں کیا معنی۔ اب بھی ہیں۔ تم تو اس طرح کہہ رہی ہو گویا یہ پوسٹ ریو لیوشن پیریڈ ہے اور ماضی پر خالص مورخانہ انداز سے بحث کر رہے ہیں ہم“ طلعت نے کہا۔

”مگر صاحب۔ روشن میں ممکنات تھیں، وہ برلین والا قصہ یاد ہے، وہ تو جب ہم لوگ بخار سٹ جا رہے تھے تو پیٹھی ہمارے ساتھ ساتھ آسٹریا کی سرحد تک پہنچ گئی، وہ نکل چلتی ہمارے ساتھ مگر۔“ فیروز بولی۔

”مگر کیا یار۔ ڈرپوک تھی۔ پچانوے فیصدی بورژوا لڑکیوں کی طرح۔ بس رومانس دماغ میں ٹھنسا تھا۔ وے رومانس۔ وے بورژوا فلسفہ۔ لا حول والا۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یعنی عشق بھی کیا تو کس سے..... بھیا صاحب جیسے بوگس انسان سے۔“ طلعت نے کہا۔

”اب وہ اس بڑے آدمی، کی بیوی بن کر جم خانہ کی پارٹیوں میں زندگی گزارے گی، کیا ڈاؤن فال ہوا ہے۔“ سریکھانے کہا۔

”تمہارا تنخیل اس وقت زوروں پر ہے۔“ طلعت نے کہا۔

”میرے تنخیل نے ہم سب کو عجیب عجیب حالتوں میں دیکھا ہے۔“ سریکھا نے اواسی سے کہا۔ ”میں نے دیکھا ہے کہ چمپا بیگم ایک تنگی ہاری پروفیسر کی طرح ہندوستان کے کسی کالج میں لڑکیوں کو ہسٹری پڑھا رہی ہیں۔ بہت جلد وہ

وقت بھی آنے والا ہے جب میری شہرت ختم ہو جائے گی۔ قص کے متعلق کتابوں میں ایک آدھ پیرا گراف میرے سارے وجود کا ماحصل رہ جائے گا۔ شریقتی سر یکھا دیوی جو دس سال قبل بہت عظیم رفاصہ تھیں۔ طلعت کو لوگ بھول جائیں گے۔ کملا گنام ہو جائے گی۔ اس وقت ہم میں اور روشن میں کیا فرق رہے گا؟“

”ایسی ڈے کیڈنٹ باتیں مت کرو۔“ طلعت نے ڈانٹا۔

”میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔“ سر یکھانے ڈراثر مندہ ہو کر کہا۔

”میں یہی سوچ رہا تھا۔“ کمرے کے دوسرے سرے پر ہی ہری شنکر نے کمال سے کہا۔ ”لڑکیوں کا معاملہ بڑا بے ڈھب ہے۔ ذرا ان کو دیکھو تو۔ کیس مگن ہیں اس سے۔ ایک نے نیا بلاؤزی لیا ہے تو خوشی سے پھولی نہیں سہاتی۔ دوسری ادھر ادھر کی بے ضرر رگیں ہانک کر ہی مسرور ہے، مگر دراصل انہیں کتنے عظیم دکھ اٹھانے پڑتے ہیں، یہ ایک بچے کی تخلیق کے ذریعے ساری کائنات کی ذمہ داری سنبھالتی ہیں۔ بے چاریاں اپنے آپ کو ایک دوسرے انسان کے حوالے کر دیتی ہیں۔ ان کا دل رکھنا کتنی آسان بات ہے۔ کتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے خوش ہو جاتی ہیں یہ لوگ۔ ان کو تو دیوی بنا کر رکھنا چاہیے۔ ان کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ ہے۔“

”طلعت، ہری شنکر کی طرف آئی۔ ہری شنکر پھر مبالغے سے کام لے رہا تھا، یہی مبالغہ طلعت کو ہر طرف نظر آتا تھا۔ گوتم نیلمر کے کردار میں چمپا میں، اپنی میں، یہ لوگ گویا انسانوں کی انلارجڈ تصاویر تھیں۔ اسی مارے فوکس سے کبھی کبھی باہر ہو جاتی تھیں۔“

”میاں، کیا بے تکی ہانک رہے ہو۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ بھرے کسی



اور کو دینا۔ کہاں کی دیوی اور کیسے دیوتا۔ یہ شاعری رکھو چھپر پر۔ معاشی آزادی اصل چیز ہے۔“

”یہی بات تو تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ معاشی آزادی اصل چیز ہوتی تو چمپا بیگم اس سے باغ میں چکر نہ کاٹ رہی ہوتیں۔“ شکر نے جواب دیا۔

”اوھ۔ ان کا تو دماغ خراب ہے۔“ طلعت نے کہا۔

”اے لیجئے۔ اتنی قابل لڑکی۔ کیمبرج میں سب پر دھاک بٹھا کر آ رہی ہے، جس سے ملتی ہے وہی فلور ہو جاتا ہے۔ آپ ان کا دماغ خراب بتائے دے رہی ہیں۔“

”کیوں بھی کیونست لوگ عشق نہیں کرتے؟“ طغیان صاحب نے نہایت بھونڈے پن سے گلشن سے سوال کیا۔

”الاحول والاقوۃ۔“ طلعت جل کر واپس چلی گئی۔

”بی بی۔“ ہری شکر نے اس سے بڑے پیار سے کہا، وہ نرملہ کی قائم مقام تھی۔ ”ابھی تم اور پڑو۔ اب تم لگے ہاتھو پی۔ ایچ۔ ڈی کر ہی ڈالو۔ کون مردود کہتا ہے کہ معاشی آزادی ضروری نہیں۔ اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔“ وہ یک لخت گھبرا گیا کہ اس نے طلعت کو خفا کر دیا ہے۔

”پٹی۔ ایچ۔ ڈی کر کے بڑے لڈو مل جائیں گے۔ تین سو کی ملازمت، صرف تین سو کی۔“ اس نے عین ہری شکر کی ناک کے آگے تین انگلیاں لہرائیں، وہ بالکل سننے کی موڈ میں نہیں تھی۔ دراصل بھیا صاحب کی شادی کی خبر نے اس کی طبیعت مکدر کر دی تھی۔ اسے اس وقت پہلی بار احساس ہوا تھا کہ شادی کی کتنی

زبردست مارکیٹ ہے جس میں لڑکیاں، خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں خواہ جاہل چپٹ  
برائے فروخت دکان پر رکھی جاتی ہیں۔

”ارے تو روپیہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ نیا ہندوستان ہے۔ ہم سب کو اس  
کے لیے کام کرنا ہے کمال کو دیکھو، صولت کو، کسی ٹھاٹھ دار کی ریویمن ہیں۔“  
چمپا نے ٹہلتے ہوئے ایک مرتبہ کمرے میں جھانکا اور ان سب باتوں میں  
مصروف پا کر باغ میں سے گزرتی باہر سڑک پر آ گئی۔

۸۹

برفباری شدید ہو گئی۔ شنیلہ دہی نے کھڑکیاں بند کر دیں۔  
سوامی دیویکانند نے گیتا کا صفحہ الٹ کر مجمع کو دیکھا، یہ وہی کمال اور ہری شنکر  
کے انگریز پروفیسر تھے جو تیرہ چودہ سال قبل ایک روز لا مارٹیز کالج لکھنؤ سے  
اچانک غائب ہو گئے تھے اور کمال اور ہری شنکر ان کے تعاقب میں ہردوار کی  
گھاٹیوں میں مارے مارے پھرے تھے۔ اب یہ زعفرانی کپڑے پہنے، داڑھی  
بڑھائے، یورپ اور امریکہ میں لیکچر دیتے پھرتے تھے۔ گوتم نے شنیلہ امرکچی کے  
فیلڈ میں پہنچ کر کھڑکی میں سے جھانکا تو اسے یہ منظر نظر آیا کہ سوامی جی مشرق  
پسند انگریز لڑکیوں میں گھرے بیٹھے ہیں، ایک طرف کیرتن ہو رہا ہے۔ شنیلہ امرکچی  
سب کو کافی پیش کرنے میں مصروف ہیں۔

گوتم اسی صبح کئی ماہ بعد ماسکو سے لوٹا تھا۔ مال نے اس کے توسط سے ہندوستان میں مختلف ملازمتوں کے لیے جو درخواستیں دے رکھی تھیں ان کے جواب میں انڈیا ہاؤس میں گوتم کی میز پر بہت سے لفائے آئے رکھے تھے۔ وہ ان کھولے بغیر خوشی سے ہڑا کر مال کو سارے میں ڈھونڈتا پھرا۔ سر یکھا کے یہاں معلوم ہوا کہ مال اور ہری شنکر اپنے پرانے پروفیسر سے ملنے شنیدلا مکر جی کے یہاں گئے ہوئے ہیں مگر وہ لوگ یہاں بھی نہیں تھے۔ گوتم اندر آ کر ایک کونے میں مائیکل کے پاس بیٹھ گیا۔

”ہلو کا مریڈ۔ ہو سکو وا سے کب لوٹے۔“ مائیکل نے چپکے سے پوچھا۔  
 ”آج صبح۔“

”بھئی یہ تمہارے سوامی جی تو بالکل فراڈ معلوم ہوتے ہیں۔“ مائیکل نے کہا۔  
 ”ہوں گے۔ مجھے ان میں دلچسپی نہیں ہے۔ تم نے مال کو دیکھا ہے؟“  
 ”نہیں۔“ مائیکل نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ ان کو روپیہ دے رہا ہے کہ مذہب کا پرچار کریں اور کانگریس آف کلچرل فریڈم کی طرف سے دورے پر نکلے ہیں۔“  
 ”تم اب تک سرائیکل نہیں گئے۔“ گوتم نے دریافت کیا۔  
 ”بس اب جانے ہی والا ہوں۔“

”سب جا رہے ہیں۔“ شنیدلا وہی مائیکل کی بات سن کر ان کی طرف آئیں۔  
 ”نومشکار مسٹر نیلومبر۔“ انہوں نے کہا۔  
 ”نمسکار شنیدلا دیوی۔“

بہت سے پھول اٹھائے زگیش کمرے میں داخل ہوئی۔ ”روشنی میں آ کر دیکھا تو یہ سب سرخ نکلے۔ میرا خیال تھا زرد ہوں گے۔“ اس نے سوامی جی کے سامنے پھول رکھ کر کہا۔

”زگیش.....“ گوتم نے آ زردگی سے نیچی آواز میں کہا۔ ”یہ کیا سوانگ رچا رہی ہو؟“

”گوتم..... کلچر کی خاطر..... یہ سب کلچر کی خاطر ہے۔“ اس نے پہنچے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”مال کہاں ہے۔“

”سریکھا کے یہاں دیکھ لیا؟ شاید وہ لوگ مڈ ہرسٹ سے نہ لوٹے ہوں۔“

”مڈ ہرسٹ.....“ گوتم کے ذہن پر ایک موگری سی پڑی۔ ”مگر آج تو اتوار نہیں ہے۔“

”ہاں، لیکن نرملا کے دوسرے پھیپھڑے کا آپریشن ہوا ہے۔ تم کو معلوم نہیں؟

ارے ہاں، تم آج ہی تو باہر سے لوٹے ہو۔“

”سب جا رہے ہیں۔ سب اپنے اپنے اسرائیل کی طرف جا رہے ہیں۔“

شنیدا مکر جی نے آنکھیں نیم وا کر کے گوتم سے کہا۔ ”تم لوگوں کی پوری پارٹی ہندوستان واپس جانے والی ہے۔ زگیش نے آج بتایا مائیکل بھی جا رہا ہے۔

ڈینس کو نیروبی کی یونیورسٹی میں پروفیسری مل گئی ہے۔“

”شنیدا دیوی یہ تو دنیا کا قاعدہ ہی ہے۔“ گوتم نے سخت اکتا کر کہا۔ ”لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔“

”یہ تو مجھے معلوم ہے کہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، بلکہ چلے جاتے ہیں، آتے کبھی نہیں۔“ اب وہ بھی پھر گرو دیو یوگور کا حوالہ دینے والی تھیں۔ گوتم جلدی سے اٹھا۔ ”نرگیس“ اس نے مڑ کر کہا۔

”مجھے سال کی بڑی سخت تلاش ہے، اس کے نام چند بے حد ضروری خط آئے ہیں۔“

”بی بی سی کینٹین میں دیکھ لو۔ یا شاید چوزے کی سرائے میں ہوں وہ سب۔ سوامی جی سے تو ملتے جاؤ۔“

”ارے ہاں۔“ وہ آگے بڑھ کر سوامی جی کے سامنے جھکا اور ان کے پیر چھوئے۔ سوامی۔ دیویکا نند جی سابق ڈاکٹر رچرڈ ہیلمنٹن۔ نے اسے اشیر وادی اور اوکسفرڈ کے لہجے میں اس سے اس کی روح کی خیریت دریافت کی۔

”مجھے تمہارا ہی انتظار تھا کہ تم آ جاؤ تو ایک روز اسٹیون اسپنڈروغیرہ کو اپنے یہاں بلا کر ایک محفل منعقد کریں۔“ شنیلا دیوی نے کہا۔ ”سوامی جی سے میں نے تمہارا بہت ذکر کر رکھا ہے۔“

گوتم دوبارہ جھکا اور سب کو نمسکار کرتا ہوا باہر نکلا۔ وہ اوور کوٹ میں منہ چھپا کر تیز تیز قدم رکھتا کار کی طرف چل دیا۔ شنیلا مکر جی کے فلیٹ میں سے کیرتن کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔

چوزے کی سرائے اس وقت غیر معمولی طور پر سنان پڑی تھی صرف ایک لڑکی دروازے کی طرف پشت کیے اونچے اسٹول پر بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ گوتم ویٹرس سے پوچھنے کے لیے کاؤنٹر کی طرف بڑھا کہ بی بی سی والے تو ابھی ادھر نہیں آئے تھے۔ اسٹول والی لڑکی نے مڑ کر اسے دیکھا، وہ چمپا احمد تھی۔

”ہلو..... تم یہاں موجود ہو۔“ گوتم نے بے ساختہ کیا۔

وہ اپنی جگہ سے اتر کر برابر کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ ”تم ہی نے تو کہا تھا کہ دنیا بہت مختصر ہے، ہم کہیں نہ کہیں ضرور ملیں گے دوبارہ۔“

”اب ایسی مختصر بھی نہیں ہے۔“ گوتم نے ذرا برا مان کر کہا۔ ”یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر بات کلائرل سمجھ لیا جائے۔“

”لائرل تو تم مانتے ہو باتوں کو۔“

”وہ کیسے؟“ گوتم نے پھر کمال کی تلاش میں چاروں اور نظریں دوڑا کر پوچھا۔

”میں نے تم سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ بڑی مابعد الطبیعیات بات تھی۔ تم اس کو مجاز کی طرف لے گئے، یہ سب تمہارا قصور ہے۔“ اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔

”مابعد الطبیعیات کا ذکر مت کرو۔“ گوتم بے انتہا چڑ کر بولا۔ ”میں ابھی ششیل دیوی کے یہاں سوامی دیوی کا اند سے مل کر آ رہا ہوں۔ تم نے کمال کو تو نہیں دیکھا۔“

”نہیں۔“ چمپا نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا، یہ آدمی پل پل میں کیسے

رنگ بدلتا تھا۔ ابھی تک میں مردوں کو سمجھ نہیں پائی۔ ”تم نے مجھے فون کیا تھا اس روز..... جون کارٹر کے یہاں۔ یورپ جانے سے پہلے۔“

”ہاں۔ کیا تو تھا؟“ گوتم کو اپنا اس طرح پکڑا جانا بالکل پسند نہ آیا۔ ”کیونکہ تم نے مجھے رنگ کیا تھا کیمبرج سے لوٹ کر.....“

”گوتم، یہ تم کاٹنے کو کیوں دوڑ رہے ہو، بات بے بات۔ تم پہلے تو ایسے نہ تھے، میں تقریباً سات سال بعد تم سے ملی ہوں۔ ذرا تمیز سے پیش آؤ۔“

”چپا۔“ گوتم نے کہا۔ ”میں اس وقت بے حد پریشان ہوں۔ مال کے کئی ضروری خط ہیں، ممکن ہے اسے دو تین دن کے اندر انٹرویو کے لیے دلی پہنچنا ہو۔ نرملکا دوسرا آپریشن ہوا ہے۔ تم چوبیس گھنٹے خوابوں میں کھوئی رہتی ہو، باقی کی دنیا ہر سہ ماہی کے خوابوں کا ساتھ کس طرح دے سکتی ہے۔“

”ارے۔“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”چلو سال کو ڈھونڈتے ہیں، مجھے یہ سب معلوم نہ تھا۔“ گوتم نے اسے دیکھا، یہ کسی عجیب دلکش عورت تھی۔

وہ سرائے سے باہر نکلے اور سر یکھا کے یہاں فون کیا۔ گلشن نے دوسرے سرے سے جواب دیا۔

”مال کا پتا نہیں۔ شاید سر روجر کے یہاں نرملکا کی رپورٹ لینے گیا ہے۔ سر یکھا ابھی راڈا سے نہیں لوٹی۔ مال نے کہا تھا کہ وہ سر روجر کے یہاں سے ہمارے گھر ہی آئے گا۔ تم آ جاؤ، میں کالج جا رہا ہوں۔ کنجی ہمسایوں کو دیے جاتا ہوں.....“

”کوئی مدد ہر سٹ گیا؟“ گوتم نے پوچھا۔

”طلعت اور ہری شکر گئے ہیں اگر تم بھی جا رہے ہو تو میرے یہاں سے ایک پارسل لیتے جانا۔ نرملا کو بھجوانے کے لئے سر یکھانے ڈانگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ طلعت لے جانا بھول گئی۔“

”اچھا۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

گوتم کار کی طرف لوٹا اور وہ سینٹ جانز ووڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ آشا کے یہاں سے کنجی لے کر وہ سر یکھانے کے مکان میں داخل ہوئے۔ گیلری میں دو بڑے بڑے مجسمے رکھے تھے۔

”اوہو..... ہماری طلعت نے بڑے زوروں سے سنگتراشی شروع کر رکھی ہے۔“

”یہ آشا کے بنائے ہوئے ہیں۔“ چمپا نے فوراً کہا۔

گوتم ٹھٹھکا۔ چمپا، طلعت اور ان سب کو کس قدر ناپسند کرتی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا، وہ گارڈن۔ روم میں گئے اور باغ کی طرف بڑا شیشوں والا دروازہ کھولا۔ اب برف پھر مدھم سی دھوپ میں روشن تھی۔ ”کتنا آرام دہ گھر ہے سر یکھانے اور گلشن کا۔“ گوتم نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ باغ کی دیوار کے پرے سے موسیقی بلند ہو رہی تھی۔ فضا میں خوش گوار خنکی تھی۔ چمپا نے آتش دان روشن کیا۔ گوتم کمرے کے ساز و سامان پر کامل اور مطمئن انداز سے نظریں دوڑاتا رہا۔ اب چمپا کی موجودگی کی وجہ سے برسوں بعد ایسا معلوم ہوا گویا وہ بہرائچ میں اپنے گھر پہنچ گیا ہے، یہ بڑا غیر منطقی اور عجیب سا احساس تھا۔

کمرے میں ایک طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ اقتصادیات، علامہ



اقبال، فیض، کرشن چندر، پھر سر یکھا کی کتابیں تھیں۔ موسیقی، نیلے، کربوگرافی۔ سارے میں نفیس آرٹسٹک چیزیں بھی تھیں جو سر یکھا اور گلشن نے سارے ہندوستان، عوامی چین اور یورپ میں گھوم کر جمع کی تھیں۔ روس کا ہیلا لیکا، چین کے نو اور ہنگری کی گڑیاں، اٹلی اور فرانس کی پینٹنگز۔

صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک آرٹسٹ اور رقاصہ کا کمرہ ہے۔ پیانو پر مارگو فونٹین اور رابرٹ ہیلپ مین کی دستخط شدہ تصاویر رکھی تھیں۔ جگہ جگہ بانی اور جنوبی ہند اور سیام کے رقاصوں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے سجے تھے۔ کونے میں سینے کی مشین دھری تھی اور مردگم اور ترکاری کی ٹوکری، گوتم مسکرایا، یہ آرٹسٹ کا کمرہ تھا مگر اس میں آرام اور بے تکلفی سے رہا بھی جاتا تھا۔ زندگی کی اسی سادگی اور بے تکلفی کا وہ ہر جگہ متاثر تھا۔

”میں نے یہاں بڑے اچھے لمحے گزارے ہیں۔“ اس نے کہا۔  
 ”یہ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ہیں نا۔“ وہ کہتا رہا۔ ”کمروں سے یکینوں کی شخصیت کسی قدر عیاں ہوتی ہے..... ذرا سوچو تو۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔ ”ہیچلسی میں کملا کا الراموڈرن فلیٹ دیکھا ہے؟ اس کی آرائش سے معلوم ہوتا ہے کہ یکین شدید غلچہ پھول، شدید خوش ذوق اور انتہائی مزاجی حس کی مالک ہے اور ڈائریکٹ۔ اس کے خیالات میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ اوسٹریلی میں زرینہ کا مکان بھی ایک آرٹسٹ کا مکان ہے لیکن ستھرا، خوبصورت اور گھریلو۔ سینٹ جانز ووڈ میں طلعت اور مال کا گھر عین میں گلنشاں کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے، وہی ہنگامہ، وہی افراط فری، ہماہمی، مہمانداری۔ حد ہے محرم میں مجلسیں تک تو یہ دونوں کرتے ہیں

یہاں۔

میں نے واشنگٹن میں ہری شکر کافلیٹ دیکھا ہے جو بالکل سنگھاڑے والی کوٹھی کا ایکشن معلوم ہوتا ہے۔ پھر شنیا وہی کاکمرہ نشست جہاں ہر چیز شروع سے آخر تک پوز ہی پوز ہے۔“

”تم پوز اور غیر پوز میں فرق کیسے معلوم کر لیتے ہو۔“ چپا نے اس کی بات کاٹی۔

”نہیں چپا، ہم خود کو اپنے پس منظر سے، کبھی اپنے ظاہر کو اصلیت سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ پھر وہ رکا۔“ مگر کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے آج تک تمہارا اصل پس منظر نہیں دیکھا۔ چوزے کی سرا کی اسٹول پر بیٹھی تم بالکل معلوم نہیں ہوتا تھا کہ بنارس سے آئی ہو۔ عجیب بات ہے نا۔“

”اچھی بات ہے یا بری؟“

”پتا نہیں، مگر ہمیں اپنے پس منظر سے وفادار رہنا چاہیے جو شاید تم نہیں رہیں۔“

”یہ غلط ہے۔“ چپا نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں بنارس واپس جانا چاہتی ہوں مگر مجھے کوئی لے جانے والا نہیں ملتا۔“

وہ خاموش ہو گیا۔

”تم کو معلوم ہے،“ گوتم نے کہا ”پچھلے سال میں نے تم کو امریکہ سے خط لکھا تھا، میں ایک بے حد خوبصورت علاقے میں گیا ہوا تھا، وہاں ایک دیودار کے جنگل میں بیٹھ کر میں نے تم کو خط لکھا۔ ان دنوں میں جانے کیوں بے حد خوش تھا۔ مجھے

یہ وقتاً فوقتاً اپنے خوش ہوتے رہنے کی وجہ آج تک سمجھ میں نہ آئی۔ بہر حال میں نے تم کو لکھا تھا خط ایک عدد..... مگر شاید وہ تم کو ملا ہی نہیں۔“

”مجھے آج تک کوئی خط نہیں ملا۔“

”اب تم پھر رومانٹک ہوئیں!“

برابر کے مکان میں آشنا کے یہاں کسی نے اونچی آواز میں گانا شروع کر دیا۔

”گوتم..... کہینے پن پر مت اترو.....“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ

گئے۔

”تمہارے بنارس واپس جانے کے راستے میں کون چیز حائل ہے۔ اور تم

روتی کیوں ہو بھائی۔ زندگی میں آنسوؤں کی کمی تو نہیں کہ تم یونہی رونا شروع کر دو

بیٹھے بٹھائے۔ ہنسا کرو۔ مثال کے طور پر بھیا صاحب کو لو۔ آج میں نے ان کو

سلفر جز سے نکلنے دیکھا اپنی بیگم کے ساتھ۔ اس قدر خوش تھے کہ کیا بتاؤں۔ کھلے جا

رہے تھے۔ بڑے تپاک سے انہوں نے میرا تعارف اپنی بی بی سے کروایا۔ میں

نے بھی بہت بشاش محسوس کیا۔ وماغی طور پر صحت مند لوگ ایسے ہوتے ہیں جیسے

بھیا صاحب ہیں۔“

”بکو اس مت کرو۔“ چمپا نے کہا اور آتش دان کے کونلے ٹھیک کرنے میں

مصروف ہو گئی۔

گانے کی آوازیں اب قریب تر ہو گئیں۔ اوجیت اور ترونا کی آواز سب میں

اونچی تھی۔ چمپا درتپے کے قریب جا کر سنتی رہی، پھر واپس آ گئی۔

”دریچہ بند کر دو۔“ گوتم نے معاً کہا۔

”ہاں۔“ چمپا نے جواب دیا۔ ”یہ تورات گئے تک بلڑ پتا رہے گا۔ لندن مجلس والوں کو اس کے علاوہ اور کوئی کام معلوم نہیں ہوتا۔“

”ارے رے.....“ گوتم نے چونک کر کہا۔ ”وہاں شاید مال بھی پہنچ گیا ہو، یہ لوگ رت جگا کیوں کرنے والے ہیں؟“

”صبح یہ سب بوڈا سپٹ جا رہے ہیں اس لئے۔“

”بوڈا سپٹ؟“

”ہاں، وہیں۔ بالکل وہیں۔ نیلی ڈینیوب کے کنارے۔“

گوتم نے کان لگا کر آواز پہچاننے کی کوشش کی۔

”وہی سارے پرانے کورس ہیں اور اپٹا کے گیت۔“ چمپا نے اکتاہٹ کے

ساتھ کہا۔ ”ابھی تمہارا جی ان گانوں سے نہیں بھرا۔“

”ان گانوں سے میرا جی کس طرح بھر سکتا ہے چمپا بیگم؟“

”اوہ۔ میں بھول گئی تھی کامریڈ گوتم..... مگر تم ہی نے کہا تھا کہ درپچہ بند کر

دو۔“

اب وہ ”بوجھاٹھا لوہیا ہیا۔“ گارہے تھے۔ گوتم نے باہر جا کر باغ کی دیوار پر

سے جھانکا۔

بہت سے لوگوں کو ہاتھ ہلا کر دیو کیا اور واپس آ گیا۔ ”نہیں مال وہاں نہیں

ہے۔“

”گوتم ماشٹر۔“

”ہاں بھائی۔“

”کیا میں بہت ہی بیوقوف ہوں؟“

”نہیں تو، لیکن کچھ ایسی زندگی عقلمند بھی نہیں۔“

”بس..... میں یہی پوچھنا چاہتی تھی۔ اچھا ہوا تم نے بتلادیا، اب مجھے

اطمینان رہے گا۔“

”گروگوتم کو بلاؤ۔ گروگوتم کہاں ہے۔“ آشا کے گھر میں سے صدائیں بلند

ہوئیں۔

”گروگوتم سر یکھا کے یہاں بیٹھا ہے۔“ کسی نے جواب دیا۔

وہ باہر جا کر دوستوں سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ ”نہیں میں آنے نہیں سکتا۔

ایک بے حد ضروری فون کا انتظار کر رہا ہوں۔“

مگر دوسرے لمحے وہ دیوار کو دکر گانے والوں کی منڈلی میں جا شامل ہوا۔ چمپا

پھر اکیلی رہ گئی۔

اس کی دنیا کی کشش اس کے لئے زیادہ طاقتور ہے، یہ مجھے معلوم ہونا

چاہیے۔

بہت دیر بعد وہ سر یکھا کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ سال کا فون تو نہیں آیا

تھا؟ اس نے سوال کیا۔ چمپا آتش دان کے سامنے قالین پر لیٹی پڑھ رہی تھی۔

”نہیں“ اس نے جواب دیا۔ گوتم نے اس طرح اسے تنہا چھوڑ کر آشا کے یہاں

چلے جانے کی معذرت نہیں کی، وہیں بیٹھ کر وہ بھی ایک کتاب پڑھنے میں مصروف

ہو گیا۔ ”یار چاء بنائی جائے۔“ کچھ دیر بعد اس نے تجویز کیا۔

”تم آشا کے یہاں پی کر نہیں آئے۔“

”ہاں، مگر تم نے جو نہیں پی ہوگی۔ آ شام جو اتنی دیر تک آوازیں دیتی رہی۔ تم وہاں آئیں کیوں نہیں۔ اب تم بنا لو چاء اپنے لئے۔“

بہت جلد تم کو میرا خیال آیا۔ چپا نے کہنا چاہا مگر وہ جھٹڑنا نہیں چاہتی تھی، یہ اس قدر واہیات نسوانیت ہوتی، وہ چپ چاپ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

”آتا بھی ہے چولہا سلگانا۔“ گوتم نے پیچھے سے مذاقاً آواز لگائی۔

”بنارس میں میری اماں خود کھانا بناتی ہیں۔“ اس نے مختصراً کہا۔

”مگر تم تو کیمبرج پڑھتے ہو!“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”چپا رانی.....“ گوتم آ کر باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا ہو

گیا۔ ”آخر اس قدر افسردہ کیوں نظر آ رہی ہو؟“

”اور کیا کروں ناچوں؟“

”یہ تو کوئی جو ب نہ ہوا۔ تم تو ایک زمانے میں بڑی سخت بذلہ سنج تھیں۔“

”وہ دیکھو تو اس جلا دیا تم نے.....“

”افسوس طلعت یہاں موجود نہیں جو تم کو پکوان بنا کر کھلاتی۔“

”چپا، ایسی واہیات باتیں مت کرو۔“

”گوتم.....“ چپا نے کینٹلی اٹھاتے ہوئے رمان سے کہا۔ ”اگر تم چاہتے

ہو کہ میں یہاں سے چلی جاؤں گی اور آہندہ تم سے کبھی ملنے کی کوشش نہ کروں گی۔

غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اتنے برسوں تم سے دوبارہ ملنے کی آس لگائے

رکھی۔“

”چپا رانی.....“ گوتم باورچی خانے میں آ کر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا، اس نے اپنا سراپے ہاتھوں پر ٹکا دیا۔ ”چپا رانی۔“ اس نے بھاری آواز میں کہا۔ ”اصلیت جاننا چاہتی ہو۔ اصلیت یہ ہے کہ میں اپنے آپ سے ڈر رہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں تم سے کیا بات کروں۔ تم مجھ کو کیا بتانا چاہتی ہو اور میں تمہیں کیا سنانے کا متمنی ہوں۔ اتنا طویل وقفہ گزر چکا ہے اور ظاہری طور پر ہمارے پاس اس باتیں کرنے کے لئے کوئی مشترکہ موضوع نہیں ہے سوائے ان خرافات کے جو ہم پچھلے دو گھنٹے سے دہرا رہے ہیں۔“ اس نے سر اٹھا کر چپا کو دیکھا۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ چو لھے کے پاس کھڑی اور زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے چپا کو آج تک اسنے گھریلو اور پرسکون ماحول میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ چاہہ بنا کر ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

”ادھر آ جاؤ۔“ اس نے ذرا درشتی سے کہا۔ گوتم اس کی آواز کی درشتی سے ڈر سا گیا، وہ پھر آ تشدان کے سامنے آن بیٹھے۔

مخض کوئی بات کرنے کی خاطر گوتم نے وارجلنگ کے ایک بیگ کو چھوا جو کرسی پر رکھا تھا۔ ”کتنا خوبصورت ہے۔“ اس نے کہا۔

”اس میں میں اپنے کاغذات رکھ دوں؟“

”رکھ دو۔“

اس نے لفافے بڑی احتیاط سے بیگ میں ٹھونس دیے۔

اب پھر باتیں ختم ہو گئیں۔

”اس بیگ میں۔“ اس نے گلا صاف کر کے پھر کہنا شروع کیا۔ ”تمہارا

سامان ہے نا چلتے وقت مجھے یہ کاغذات نکال دینا۔ ورنہ سب گر بڑھو جائے گا۔“

”زیر بحث بیگ“ چمپا نے تلخی سے کہا، ”میرا نہیں سر یکھا کا ہے۔ اس میں تم اپنا سامان رکھ سکتے ہو۔ اسے اپنے گھر لے جا سکتے ہو۔ میری اور تمہاری کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ نہ یہ بیگ، نہ کاغذات، نہ یہ مکان، چیزیں حتیٰ کہ یادیں۔ کچھ بھی نہیں۔ جس میں تمہارے ساتھ حصہ لگا سکوں۔ صرف دکھ مشترک ہے، لیکن تم اپنے دکھ بھی اپنے لئے ہی محفوظ رکھنا چاہتے ہو۔“

گوتم خاموش رہا۔

”کیا تم کو معلوم ہے گوتم بلمبر کہ گو بچھلے سات سال سے میں نے تم کو نہیں دیکھا مگر مجھے پتا ہے کہ تم ہر سے، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اپنے خلاف گواہی دیتے رہے ہو؟“

”ٹھیک ہے میں جس سے بات کرتا ہوں مجھے لگتا ہے میرا مخاطب میرا کنفیسی ہے۔ میرا سارا وجود میرا اعتراف ہے۔ میں نے کتنے قتل کیے ہیں۔ تم کو مارا ہے۔ اپنے آپ کو ختم کیا ہے۔ میرا جرم تمہارے جرم سے مختلف ہے۔ تمہارے اندر معصومیت کا جرم چھپا ہوا ہے۔ ایک بات بتاؤ.....“ اس نے رک کر کہا.....

”تصور گناہ تمہارے نزدیک کیا ہے۔“

”کسی کا دل دکھانا۔“ چمپا نے سوچ کر جواب دیا۔

”اور؟“

”ریا کاری۔“

”اور؟“



”اور..... اور کمینہ پن۔“ اس نے دماغ پر اور زیادہ زور ڈال کر جواب

دیا۔

”سڈے اسکول کے سبق۔“

”ایں؟“ چپا نے اس کی بات اچھی طرح نہیں سمجھی۔

”میں نے دل دکھایا ہے، تمہارے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے؟“

”بہت بڑا۔“

”لیکن تم کو جلد یہ معلوم ہو جائے گا چپا رانی کہ راستے میں بعض ایسے موڑ

آتے ہیں جب کسی دوسرے کا دل دکھانا بالکل ناگزیر اور لازمی ہو جاتا ہے۔“

”قاتل بھی قتل کرتے وقت یہی سوچتا ہے کہ یہ قتل بالکل ناگزیر اور لازمی ہے،

ورنہ قاتل ہی کیوں بنتا؟“

گو تم پھر خاموش ہو گیا۔

”سراونچے نیچے ہوتے جا رہے ہیں۔“ کچھ دیر بعد انہوں نے باہر کی

آوازوں پر کان لگاتے ہوئے کہا۔ ”مگر ہارمنی کی طرف بڑھتے ہوئے دفعتاً رک

گئے ہیں۔“ اس نے پیانو کے نزدیک جا کر پردوں پر انگلیاں پھیریں۔

”اس کا ایک سر کہیں سے ٹوٹ گیا ہے۔“ چپا نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔ پیانو میں اکثر چوہے اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ میرے پیانو

میں، بہرائچ میں، اکثر آدھی رات کو ایک پیارا موٹا سا چوہا اندرتاروں پر دوڑ دوڑ

کر سمنی بجایا کرتا تھا۔“

”تم نے مجھ سے بہرائچ کا ذکر کبھی نہیں کیا۔“

”بڑی پیاری جگہ ہے۔ کیونکہ میرا وطن ہے۔“

”ہم سب ایک دوسرے کے رحم و کرم پر زندہ ہیں ایک دوسرے کے ساتھ وقت میں مقید ہیں یہ بڑی کوفت کی بات ہے۔“ اس نے چند لمحوں بعد الجھ کر کہا۔

حالانکہ یہ وقت بڑا غیر حقیقی تھا جس میں کمرے کی ہر چیز بے حد روشن اور واضح نظر آرہی تھی۔ باغ کے پھولوں پر سے برف پگھلنا شروع ہو گئی۔

”یہ جوتا دیکھو۔“ معاگوتم نے ٹانگیں آگے بڑھا کر سنجیدگی سے کہا۔ ”زندگی اس کی طرح فٹ نہیں بیٹھتی۔“ پھر اس نے ایک تو س کا ٹکڑا اٹھا کر بلی کو پھینکا جو درستکے میں آن بیٹھی تھی۔ اس نے تو س سونگھ کر چھوڑ دیا۔

”یہ بھی بوہیمیلین بلی ہے، تو س نہیں کھاتی۔ اس کے لئے لولیسٹر اور شیمپین

لاؤ۔“

پھر وہ چمپا سے مخاطب ہوا: ”چمپا تم نے اتنے دنوں بیکار میرا انتظار کیا۔ میں بالکل بوگس ہوں۔“ وہ آتش دان کے پاس بیٹھی اسے خود بے حد غیر ضروری نظر آئی۔ غیر ضروری اور سخت بیوقوف اب بھلا اس کی کیا تک ہے کہ اتنی گنوان ہونے کے باوجود مجھ جیسے لپاڑی آدمی کی آس لگائے بیٹھی ہیں۔ حد ہے، بے وقوف لڑکی ہے اور سخت معصوم، بورژوا فلسفی بے چاری۔ اگر اس کے دماغ کو کھرچا جائے اندر سے تو اس میں سے کتنی فالتو مٹی ملے گی۔ ہزاروں سال پرانی مٹی۔ ٹیرا کوٹا۔“ طلعت نے اتنے سارے مشہور لوگوں کے سر بنائے ہیں۔“ اس نے با آواز بلند کہا۔ ”پم نے کبھی اس سے اپنا سر بنوا کے نہ دیا، اب بھی وقت ہے بنواؤ، تم کہیں جاتو نہیں رہیں۔“ اس نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

”فی الحال تو نہیں۔ ہم ایک دروازے سے داخل ہوئے تھے مگر باہر جانے کے سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔“

”تھاری اتنی معصومیت بھی غلط ہے۔ بے کار ایک دم۔“ وہ ٹہلتا ہوا جسموں کی طرف چلا گیا اور کی سرٹھونک بجا کر دیکھنے لگا۔ ”کیونکہ.....“ اس نے ایک مجسمے کی ناک چھوتے ہوئے کہا۔ ”ہر دفعہ تم پ کڑی جاؤ گی۔ تمہارا خیال ہے تم نے فیصلہ کر لیا اس لئے اب ہر بات آسان ہے حالانکہ یہ اتنا آسان نہیں۔ ابھی تم پر اور مصیبتیں آئیں گی۔“

وہ درتے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ لمحہ گھومتا چکر کاٹنا چتا رہا۔ لمحے کا بخنور دور دور تک پھیل گیا۔ ختم ہو گیا، باقی رہا جگمگاتی ہوئی برف پر سے پھلتی روشنی کمرے میں داخل ہوئی۔ پیٹرن مکمل ترین بن گیا، وہ ساکت و صامت آتش دان کے پاس بیٹھی رہی۔ کمرے کے حجرے میں بی بی بھی شریک تھی۔ ہوائیں بھی جانتی تھیں۔ بہت دور سڑک کی موڑیں، راہ گیر، دکانیں..... سب کو معلوم ہو چکا تھا۔

اب سارا جو ایک کتاب ہے جسے میں پڑھ چکی ہوں اور انت سے تک کئی بار پڑھوں گی۔ چپا نے اپنے آپ سے کہا۔

”دو دنیا کیں ہر سے میرے ساتھ رہتی ہیں۔ ایک دنیا میں یہ سب لوگ ہیں جہاں“ اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا ”دوسری دنیا میں صرف میں اور تم تنہا ہیں۔ دونوں کے درمیان ایک پل ہے۔ جس روز یہ ٹوٹ گیا تو کیا ہوگا۔“

”پل تم خود توڑو گے۔“

”نہیں۔ لوگوں نے چاروں طرف مشین گنیں لگا رکھی ہیں۔ جھاڑیوں میں

تو ہیں چھپی ہیں۔ اوپر بادل گرج رہے ہیں۔ ایک روز مجھے لگتا ہے لوگوں کی دنیا  
پاتال میں گر کر غائب ہو جائے گی۔ میں باہر ہاتھ پاؤں مارتا رہ جاؤں گا۔ یہ سوچ  
کر دل ڈوب جاتا ہے۔“

”تم اپنی اسپوٹ الائٹ لئے چھت کی کڑیوں میں چھپے بیٹھے ہو، جو شامت کا  
مارا اسٹینچ پر آتا ہے تم انتہائی کمینے پن سے اچانک لیمپ کا رخ اس کی طرف کر دیتے  
ہو، وہ روشنی میں عیاں ہو جاتا ہے۔“

”میں خود بھی تو برابر اس روشنی میں ہوں۔“

”نہیں تم پردوں کے پیچھے چھپے رہتے ہو۔ اگر کسی روز ایک سرچ الائٹ تم پر پڑ  
گئی تو کیا ہوگا۔ اس دن تم اوپر کی منزل سے چھلانگ لگا کر سر پٹ نکل بھاگو گے۔  
کھڑکیوں میں لوگ تمہیں نظر آئیں گے۔ اسٹوو کے گرد بیٹھے بخشیں کرتے،  
کھاتے پکاتے، کھاتے تم کسی آوارہ گرد بے کی طرح چاند کے مقابل میں چھت  
کے نالکوں پر دبے پاؤں چلتے ہوئے آؤ گے۔ تمہارا چہرہ ہمیں کھڑکی کے شیشوں  
میں سے نظر آئے گا۔ بوگی میں!“

”اور اس سے میں تمہارے ساتھ وہیں موجود ہوں گا: اسٹوو کے گرد بخشیں  
کرتا، کھانا بناتا، کھاتا، اور تم مجھے کھڑکیوں میں سے جھانکتا دیکھو گی..... بوگ  
وومن!!“

وہ خاموش ہو گئے۔

وہ اچک اچک کر دیواروں کی تصویریں دیکھتا پھرا، پھر درتے کی طرف چلا

گیا۔

”اُج بہت برف پڑی۔“ درتچے میں کھڑے کھڑے گوتم نے ایک جنرل اسٹیمٹ دیا۔

ابھی، اس کی بعد بھی باقی ہے۔ اس کے بعد، جو موت تک، ابد تک پھیلتا چلا جائے گا، موجود رہے گا۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

”سریکھا کا باغ کتنا خوبصورت ہے۔“ گوتم نے کمرے کی طرف سے پشت کیے کیے دوسرا بیان دیا۔

میری کوئی قسمت نہیں۔ سنا ہے لوگوں کی قسمیں ہوتی ہیں۔ چمپا نے اپنے آپ سے کہا۔

معاوہ چونکا اور پیچھے مڑا۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے کیڑے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ سارا دن گزر گیا..... سورج ڈھل چکا..... شام آگئی..... میں ابھی یہیں ہوں..... میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اتنا وقت برباد کیا۔ اتنا انمول۔ انمول وقت..... وہ بڑبڑایا اور تیر کی طرح گیلری کی اور بڑھا ڈانگ ٹیبل پر رکھے ہوئے پارسل پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے پیچھے پٹ کر چمپا کو نہیں دیکھا۔ پارسل جھپٹ کر وہ بگولے کی طرح باہر نکلا اور موٹر میں بیٹھ کر دیوانہ وار منڈ ہرسٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد چمپا نے جھک کر دارجلنگ کے بیگ سے مال کے نام کے وہ لمبے لمبے سرکاری لفافے نکالے جو گوتم یہیں بھول گیا تھا۔ اس نے ان کو کھولا۔

ایک ایک کر کے ہر ٹاپ شدہ خط میں مال کی ملازمتوں کی درخواستوں کو

”آئے پریم پگے پروانے۔ جوال منی چھوی کے دیوانے  
جڑ چلمن کے پیچھے رے بیٹھی  
دھپ شیکھا لہرائے رے۔ دھپ شیکھا لہرائے رے۔  
دھپ شیکھا لہرائے رے“  
چند راگاتی ہوئی باغ سے کھانے کے کمرے کے اندر آ گئی۔  
”طلعت..... چاء.....“ اس نے میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔  
طلعت نے چاء انڈیلی۔

سر لکھا انہماک سے ویڈیو ٹیون کرتی رہی۔ زرینہ نے باغ کے رخ دروازے  
میں پھیلی ہوئی دھوپ میں ایزل رکھ کر ایک اور تصویر شروع کر دی۔ پڑوسن نے باڑ  
پر سے سر نکال کر جھوڑی سی شکر مانگی۔

دنیا کا کام سکون سے جاری رہا۔ بلکہ جب سے زلمامری تھی دنیا کا کام اور  
زیادہ سکون سے جاری تھا۔ سب اپنی اپنی مصروفیات میں اس طرح جڑے تھے گویا  
اس سے پہلے انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ ان کے فرائض کیا ہیں۔ اسی شدید مصروفیات  
کے مارے وہ ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ طلعت اخبار کی رپورٹیں

لکھتی۔ کمائلڈ ٹمپل میں ڈنر کھاتی۔ فیروز کتابیں سنبھال کر بڑی سعادت مندی سے روز یونیورسٹی کا رخ کرتی۔ مال شکستہ یا سریکھا کے ڈرائنگ روم میں آتش دان کے سامنے اوندھے لیٹ کر مزید درخواستیں لکھنا۔ ہری شنکر نے ایک نیا مشغلہ شروع کر دیا تھا۔

وہ چڑیوں کے پر جمع کیا کرتا۔

نرملہ کو مرے آج محض دسواں روز تھا مگر معلوم ہوتا جیسے اسے ان لوگوں سے رخصت ہوئے کئی سو سال گزر چکے ہیں۔ وقت ربر کی طرح پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ جس روز ایک جھٹکے کے ساتھ ربر کا یہ تناؤ ٹوٹے گا تو کیا ہوگا۔

”اب ہمیں زل کے دسویں کی فکر کرنا چاہیے؟“ شنکر نے چڑیوں کے پروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اس طرح کہا ”اس طرح مال سے کہا جیسے وہ اکثر اس سے پوچھتا تھا: ”اب ہمیں زل کے بیاہ کی فکر کرنا چاہیے۔“

”ہاں۔ شاید۔“ مال نے آہستہ سے جواب دیا۔

”یہاں کوئی پنڈت جی بھی نہیں ہیں جن سے پوچھ لیتے کہ آج کے روز ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا۔“ طلعت نے بھی ہری شنکر ہی کی طرح بڑے عملی انداز میں بات کی۔ برا بھلا زندگی کا کاروبار زما نپٹا کر چلی گئی تھی مگر اس کی موت کے بعد کے کاروبار تو ابھی باقی تھے۔

شنیدہ دہی پوچھ رہی تھیں کہ اگر تم لوگوں نے دسویں کا کچھ انتظام نہ کیا ہو تو فکر نہ کرو۔ سوامی دیویکا نند جی کہہ رہے ہیں کہ ان کے سنٹر میں.....

”جی..... جی ہاں..... جی بہت اچھا..... شکریہ.....“ مال

نے ریسورر کھدیا۔

موت بھی سوامی دیویکا نند کی طرح فراڈ ہے۔

اب پھر وہ سب اپنی شدید بہادری کا ثبوت دینے کے لیے اپنے اپنے مورچوں پر جا بیٹھے۔ طلعت نے ایک مضمون ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔ سریکھا گیلری میں جا کر ڈانس کی شق میں مصروف ہو گئی۔ ہری شنکر نے پروں کا الیم اٹھا لیا۔

وقت کا سنا بہت سی توپوں کی طرح گرجنے لگا۔ گھڑی نے تین بجائے۔ سماں نے بزبان خاموشی ہری شنکر سے کہا۔ ”سر روجر سے ڈیڑھ ستر ٹھیکس لینے جانا ہے۔“ کیونکہ اس لرزہ خیز جملے کو الفاظ میں تو نہیں ادا کیا جاسکتا تھا۔

”لے آؤ۔“ ہری شنکر نے اسی خاموشی سے جواب دیا۔

”مڈ ہرسٹ سے نرملا کا سامان بھی آنا ہے۔“ طلعت نے اپنے خاموش الفاظ بھی اسی سنائے میں انڈیل دیے۔

”لیکن ہم مڈ ہرسٹ کس طرح جاسکتے ہیں؟“ سماں نے اسی طرح احتجاج کیا۔

ہر شنکر نے ان الفاظ کو ڈی کو ڈ کیا۔ وہاں، مگر ہم بہت بہادر ہیں۔ ہم ضرور جائیں گے۔ ہم ستر ٹھیکس بھی لائیں گے اور اس کا سامان بھی۔ چلو اٹھو۔ اپنے اپنے زرہ بکتر پہنو۔ افٹ رائٹ۔ مارچ کرو۔ اپنے پرانے آزمودہ ہتھیار سنبھالو۔ چلو ہم جا کر نرملا کے زرہ بکتر اور ہتھیار واپس لے آئیں جن کی اب اسے ضرورت نہیں۔



اس پنڈو مائے کے بعد، جسے کسی نے، خود انہوں نے، نہیں دیکھا، وہ سب باہر نکلے، موٹر میں بیٹھے اور ایک جانے پہچانے راستے پر روانہ ہو گئے۔ چار سال تک متواتر وہ اس سڑک پر سے گزر کر سینی ٹوریم جاتے رہے تھے۔

اب وہ آخری بار ٹڈ ہرسٹ سے لوٹ رہے تھے۔ شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ خاموشی سے موٹر سے اتر کر وہ اس روڈ ہاؤس میں گئے جہاں وہ ہمیشہ نارنگیوں کے سائے میں بیٹھ کر چاء پیتے تھے۔ روڈ ہاؤس کی مالکہ موٹی سارہ نے باہر آ کر ان کے سامنے چاء رکھی، وہ بھی اس پنڈو مائے میں شامل ہو گئی۔

سینٹ جانز ووڈ میں اپنے فلیٹ پر واپس پہنچ کر کمال نے سارا سامان گیسٹ روم میں رکھ دیا جس میں ہری شنکر ٹھہرا ہوا تھا۔

جب سب لوگ اپنے مورچوں پر واپس لوٹ گئے تو طلعت نے چوری سے نظر بچا کر اپنا مورچہ چھوڑا، اپنا زرہ بکتر اتار کر گیسٹ روم میں داخل ہوئی۔

ہری شنکر پروں کا الہم میز پر ڈال کر کمال کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔ کمرے میں ہر چیز لیمپ کی روشنی میں بڑی واضح نظر آ رہی تھی۔ آئینوں کا فرنیچر۔ وکٹورین وضع کا اونچا سائیڈ بورڈ جس پر الم غلم بہت سی فالتو چیزیں رکھی تھیں۔ دیوار پر ایک موڈرن پینٹنگ لگی تھی جسے ایک مرتبہ طلعت کسی کباڑی کی دکان سے بہت سستی خرید لائی تھی۔ ایک تانبے کا سو سال پرانا مجسمہ جو ایک مرتبہ طلعت نے کیمڈن ٹاؤن میں ایک کباڑیے سے محض چند شلنگ میں خریدا تھا۔ پرانے اخبار اور رسالے۔ تقریباً شکستہ صوفہ۔

ان سب چیزوں کے درمیان گھرے ہوئے، جب کہ نرملا کا سامان اس کے

قدموں میں پڑا تھا، اسے لگا گویا اس کی زندگی، ساری زندگی ایک بہت عظیم الشان  
کباڑی کی دکان ہے۔ یہ سب سامان فالتو ہے۔ ان سب چیزوں کو ذرا بیچ کر تو  
دیکھو۔ اپنی زندگی کو ذرا اس کباڑی مارکیٹ میں رکھو۔ موت اس کی قیمت ہے۔  
موت؟

دفعتاً پھر اس کے کانوں میں ایک توپ دغی۔ موت۔

سامنے سائیڈ بورڈ کے گوشے میں وہ چھوٹا سا مرتبان تھا جس میں کماری نرملا  
سریواستوا کی راکھ تھی۔ اس کی کنجی ہری شکر کے پاس تھی جو گویا اس کا قانونی  
وارث تھا۔ اس مرتبان کو آنگا میں بہانے کے لیے اپنے ساتھ واپس وطن لے  
جائے گا۔ جو اس وقت مال کے ساتھ اسی موت کے سلسلے کے باقی ماندہ آخری  
انتظامات کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ آخری انتظامات۔ ڈی۔تھرٹیفکٹ۔ گیتا کا  
پاٹھ۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ۔

ہر شے میں بڑی واقعیت تھی، وہ مرتبان بھی اتنا ہی ٹھوس اور حقیقی تھا جیسے یہ  
کری یا وہ صوفہ۔ یا کھانے کے برتن۔

کون الو کا پٹھا کہتا ہے کہ موت ماورائی ہے۔

موت سے زیادہ پھٹنے پھریٹ سیکنڈ ویٹ بات کیا ہوگی۔

یعنی ذرا یہ غور کیجئے کہ دوسروں کی موت پر چمکو پہلو روتے ہیں اور پھر خود مر  
جاتے ہیں۔

ارے میں کہتی ہوں رونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ایک سخت ایڈیٹ لڑکی  
تھی۔ اس کا یعنی کہ انتقال ہو گیا۔ کون سی ایسی طرم جنگ تھی۔

اور لکھنؤ میں آپ ردولی والی ثریا باجی کے مرنے کی خبر سن کر کتنا روئی تھیں۔  
 جب کمال نے ڈانٹا تھا کہ صرف دو دفعہ ہی تو ملی تھیں ثریا باجی سے، اس قدر  
 دہاڑیں کیوں مار رہی ہو، تو اس نے جواب دیا تھا، میں تو اصولاً رو رہی ہوں۔  
 جب کسی کا دیہانت ہو جائے تو کیا ہنسنا چاہئے؟

یوں بھی سب کو ثریا باجی کے انتقال کا بہت غم ہوا تھا کیونکہ مرحومہ بارہ بنکی  
 والے اصغر بھائی پر جان دیتی تھیں اور اصغر بھائی نے وعدہ تو ان سے بیاہ کا کیا تھا  
 مگر ایک روز نمینی تال جا کر کسی عیسائی لڑکی سے انہوں نے شادی رچائی تھی اور اس  
 صدمے سے ثریا باجی کو سل ہو گئی تھی اور کئی سال تک ردولی کی نیم تاریک کوٹھڑی  
 میں پلنگ پر پڑے رہنے کے بعد انہوں نے اس جہان فانی سے کوچ کیا تھا۔

اور چونکہ وہ نہ رقاصہ تھیں نہ اٹھلکچول نہ لکھکانہ چتر کار نہ ہی لیڈر لہذا نہ ان کی  
 تصویریں چھپی تھیں نہ ان پر مضردون لکھے گئے۔ ان کے جہیز کے کپڑے اور ان کی  
 حیدر آبادی چوڑیاں زنا نہ اسلامیہ یتیم خانے میں بھجوا دی گئی تھیں اور ان کے  
 چالیسویں کے بعد، جس میں لکھنؤ سے رشتے دار آ کر شریک ہو گئے تھے، گویا اسٹیج  
 پر پڑوہ گر گیا تھا۔ ہاں ان کے مرنے کے دوسرے روز لکھنؤ کے مسلم اسکول کے  
 اسمبلی ہال میں ان کی مغفرت کی دعا بھی مانگی گئی تھی جہاں انہوں نے ایف۔ اے  
 تک پڑھا تھا۔

یوں بے چاری ثریا باجی کی زندگی کا افسانہ ختم ہوا تھا جو کوئی ایسا لمبا چوڑا افسانہ  
 بھی نہ تھا۔ ایک بڑے، غیر اہم قصے کا بے حد غیر اہم سب پلاٹ تھا۔  
 پیکل مسلم سوشل پیکر۔

مگر نرملا تو بڑی غیر معمولی لڑکی تھی۔

وہ بھی اس معمولی طریقے سے ختم ہو گئی۔

اری نرملا کی بچی۔ ایڈیٹ۔ ارے بھائی تو بھی اتنی ہی حقیر نکلی۔ کہاں گیا وہ تیرا سارا فلسفہ اور آئیڈیالوجی، مگر واقعہ صرف یہ ہے کہ کچ مچ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا۔ بخارہ..... وغیرہ..... واقعہ صرف یہ ہے کہ آپ کی زندگی ہی کیا تھی۔ لمبی چوڑی۔ ساری عمر تو محنت کرتے، پروگرام بناتے گزری۔ رات رات بھر پڑھا جا رہا ہے کہ فرسٹ ڈویژن مل جائے۔ یا اللہ۔ اچھا سیکنڈ ڈویژن ہی مل جائے۔ ہائے بھگوان کم از کم پاس ہی ہو جائیں۔ سچی، پھر ملک اور قوم کی فکر میں جان دے دے رہی ہیں۔ لڑتی بھڑتی پھر رہی ہیں۔ جہاں کسی نے کوئی غلط بات کہی اور یہ کاٹ کھانے کو دوڑیں۔ ہر بحث میں یہ کودنے کو موجود، پھر جب فرسٹ کلاس مل گیا تو کیمبرج جانے کے لیے انہوں نے مہنا متھ مچا دی۔ ان کے بابا نے بڑی مشکل سے روپیہ جوڑ کر ان کو ولایت بھیجا، وہاں یہ خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔ کئی دن تک تو ان کو یقین نہ آئے کہ یہ واقعی کیمبرج میں موجود ہیں۔ سہمی سہمی پھریں کہ یہ خواب ہے، جلد ٹوٹ جائے گا، پھر پروگرام بنے کہ جب یہاں سے پڑھ کر نکلیں گی اچھی سے اچھی ملازمت ملے گی۔ بابا پر جو قرضہ چڑھا ہوا ہے وہ اتاریں گی۔ بھین کے لیے بہو ڈھونڈیں گی۔ پری زاد بالکل، پھر ذرا پیسے جمع ہو گئے تو میکسیکو کی سیر کریں گی جا کر۔ (یہ جانے میکسیکو جانے کا اتنا شوق کیوں تھا۔) یہ موہوم سی امید تھی کہ ایک روز ایک اپنا مکان بھی بنے گا۔ اس میں ایک چھوٹا موٹا سا باغ ہوگا۔ روک گارڈن۔ مکان کا نام رکھیں گی..... کسی

قسم کا کج..... یا کچھ اور..... خیر..... کوکل جی سے پوچھ لیں گی، وہ شاعرہ ہیں۔ اتنی تو تھی مستقبل کی چٹنا، پھر یہ کہ بلایاں پل رہی ہیں، کتے، کیوتر، گائیں، بھینسیں پالنے کا بھی شوق ہے اور ساریوں پر تو خیر دم نکلتا ہے۔ نیا اور کوٹ بنانے کے لیے وہ مہا بھارت مچائے ہوئے ہیں۔ ضد ہے کہ جیسے زمرد کے گہنے لاج کے بنے ہیں ایسے ہی میرے بھی بنیں۔ اپنی جہیلیوں کے لیے جان حاضر ہے۔ چند لوگوں سے سخت جلن بھی ہے۔ محبت کی اہلیت بھی ہے۔ جو ہر انسان، ہر جاندار میں ہوتی ہے۔

پھر ہوا یہ کہ کیمبرج میں ان کو بخار بھڑ گیا۔ ان کو ہسپتال پہنچایا گیا جہاں کئی سال تک پلنگ پر لیٹے رہنے کے بعد ایک روز آپ نے جان شیریں جان آفریں کے سپرد فرمادی۔

تو کیا اس موت پر اصولاً رونا چاہیے۔ قطعی نہیں۔ یہ تو بڑی سخت ہنسی کی بات ہے۔ دراصل اس سے زیادہ لطیفے کی بات تو طلعت نے بہت دنوں سے نہیں سنی تھی۔

اس نے کمرے کا چکر لگایا۔ سارے فلیٹ میں گھومی۔ باغ کے سرے پر باورچی خانے میں روشنی ہو رہی تھی۔ چندرا اور سر یکھا کے سائے درتپے میں سے نظر آ رہے تھے، گھوم پھر کر وہ پھر بری شکر کے کمرے میں واپس آ گئی۔ فرش پر بیٹھ کر اس نے نرملا کے سامان کو اکٹھا کر کے سٹگو انا چاہا۔ بے دلی سے اس نے چیزیں اٹھیں پٹھیں۔ کتابوں کے بکس میں گیتا پر اس کی نظر پڑی۔ اسے نکال کر وہ ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

لمپ جلا کر اس سے اصولاً گیتنا کا صفحہ کھولا اس احساس کے ساتھ کہ گویا وہ  
شناختی کے حصول کے لیے اس آسانی صحیفے کا مطالعہ کر رہی ہے۔ اس نے بے حد  
دھیان سے پڑھنا شروع کیا:

.....ان کو بہادری سے جھیل.....

جسم فانی ہیں لیکن ان جسموں کے اندر رہنے والی روحیں امر ہیں۔ چنانچہ لڑ۔  
او بھارت کے فرزند۔ آتما نہ قتل کرتی ہے نہ خود قتل ہوتی ہے۔ تلوار سے زخمی نہیں کر  
سکتی۔ آگ اسے جلا نہیں سکتی۔ پانی اسے بھگو نہیں سکتا۔ ہوا اسے خشک کرنے  
سے قاصر ہے۔ جو پیدا ہوا اس کی موت یقینی ہے۔ جو مر اس کی پیدائش اٹل۔ اس  
میں دکھ کی کیا بات ہے؟

دکھ اور سکھ، نفع نقصان، ہار جیت کو ایک سمجھ کر تو جنگ کر۔

تب ارجن نے کہا: او کیشو، اگر خرد کی راہ عمل کی راہ سے افضل ہے تو تو مجھے  
جنگ کرنے کے لیے کیوں کہتا ہے؟ جنگ کا عمل خوفناک ہے۔

بھگوان نے جواب دیا: انسانوں کو کام نہ کر کے کرم سے نجات نہیں مل سکتی۔ نہ  
کرم سے بے نیاز ہو کر وہ مکمل بن سکتا ہے کیونکہ پراکرتی سے پیدا شدہ گنوں کے  
زیر اثر انسان متواتر مصروف عمل رہتا ہے۔

او ارجن! تو اور میں کئی بار پیدا ہوئے ہیں۔ گو میں خداوند عالم ہوں لیکن اپنی  
پراکرتی پر قدرت رکھتے ہوئے اپنی مایا کے ذریعے خود وجود میں آتا ہوں۔ او  
بھرت، جب دنیا میں نیکی کا زوال ہوتا ہے تو میں خود کو مجسم کر لیتا ہوں اور جو میری  
الوہی پیدائش اور میرے عمل کو پہچان لیتا ہے، اے ارجن، وہ اپنا جسم چھوڑنے کے

بعد دوبارہ پیدا ہونے کے بجائے مجھ سے آن ملتا ہے۔ بڑے بڑے گنوان گھبرا جاتے ہیں کہ کرم کیا ہے اور نہہ کرم کیا، وہ جو نہہ کرم میں کرم اور کرم میں نہہ کرم دیکھتا ہے وہی اصل گنوان ہے۔ اوارجن، عقل کی آگ کرموں کو جلا کر رکھ کر دیتی ہے۔

او جنار دھن، میری پراکرتی مٹی، پانی، ہوا، آکاش، دماغ، ذہن اور انانیت میں منقسم ہے۔ یہ ادنیٰ و تیجے کی پراکرتی لیکن مضبوط بازوؤں والے شہزادے، میری اعلیٰ پراکرتی وجود اور حیات کے احساس اور شعور میں موجد ہے جس کے سارے یہ کائنات قائم ہے میں ہی ابتداء عالم ہوں اور میں ہی اس کی انتہا! او کنتی کے بیٹے، میں پانی کا سودا ہوں۔ سورج اور چاند کی روشنی۔ میں سارے ویدوں میں لکھا ہوا اوم ہوں۔ میں آکاش کی آواز ہوں۔ میں انسانیت کی اجتماعی خود آگہی ہوں۔ میں زمین کی ممبرک خوشبو ہوں۔ میں سارے جانداروں کی جان ہوں۔ راہبوں کا زہد ہوں۔ جو جس عقیدے سے میری عبادت کرتا ہے میں اسے بھگتی میں تبدیل کر دیتا ہوں۔ میں عالم الغیب ہوں لیکن مجھے کوئی نہیں جانتا۔

میں عبادت کے مختلف طریقے ہوں۔ میں ہی جڑی بوٹی ہوں اور پوجا کی آگ۔ میں خود ہی پوجا کا عمل بھی ہوں۔ میں کائنات کا باپ ہوں۔ میں ہی ماں۔ راستہ ہوں اور گواہ اور آخری جائے پناہ۔ ابتداء۔ انتہا۔ آرام گاہ۔ گنجینہ اور ازلی جج۔ اوارجن! میں تپش پیدا کرتا ہوں۔ مینہ برساتا ہوں۔ میں ابدیت ہوں۔ میں موت ہوں۔ میں وجود اور عدم وجود ہوں۔ میں وشنو ہوں۔

ویدوں میں میں سام وید ہوں۔ دیوتاؤں میں اندر۔ حواس میں ذہن ہوں

اور خود آگہی۔ روروں میں شکر ہوں۔ پانیوں میں مہاسا کر۔ الفاظ میں اوم۔  
 عبادت میں جاپ۔ نہ بٹنے والی چیزوں میں ہمائیہ ہوں۔ رشتیوں میں نارو۔ میں  
 فلسفی کہل ہوں۔ گھوڑوں اور شاندار ہاتھیوں اور انسانوں میں الگ الگ میرا  
 بادشاہ کا رتبہ ہے۔ ناگوں میں میں انت ہوں۔ پانی کے باسیوں میں دوون۔  
 فرمانرواؤں میں یم۔ پیکش میں میں وقت ہوں۔ جنگلی جانوروں میں شیر ببر۔  
 پرندوں میں گرڑ۔ جنگجو بہادروں میں رام۔ دریاؤں میں گنگا ہوں۔

میں بے پایاں وقت ہوں۔ میں تباہ کن موت ہوں۔ میں عورت کی گفتار اور  
 ذہانت، وفاداری اور رحم دلی ہوں۔ میں گالتری منتر ہوں۔ میں جیت ہوں۔  
 صوفیوں میں میں ویاس ہوں۔ رتوں میں بسنت ہوں۔ اناجوں میں جو۔ میں  
 سنسار کا آدہ مدھ اور انت ہوں۔ میں رازوں کا سناٹا ہوں۔ اوارجن! میرے الو  
 ہی مظاہر پیکراں ہیں۔

اوارجن۔

اوارجن کے بچے۔ ایڈیٹ۔

وہ کتاب زور سے بند کر کے پھر اٹھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بجنے والا  
 تھا۔ ابھی ہری شکر اور مال لوٹتے ہوں گے۔ اس نے ابھی ہری شکر کا کمرہ بھی  
 ٹھیک نہیں کیا تھا، وہ دوبارہ گیسٹ روم میں داخل ہوئی۔ فرش پر رہیٹھ کر اس نے  
 ایک بار پھر نرملا کی چیزوں کو درست کرنے کی کوشش کی: ساریاں۔ جوتے۔  
 چوڑیاں۔ میک اپ کے پٹارے۔ ہینڈ بیگ جس میں دنیا بھر کی الابلان جمع تھی جو  
 لڑکیوں ہی کے ہینڈ بیگ میں سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ بس کے ٹکٹ۔ لائڈری



کے بل۔ پرانے خالی لپ اسٹک۔ کانوں کے بندے۔ پنیں۔ پیسے خریداری کی  
فہرستیں اور جانے کیا کیا۔ ان سب چیزوں پر چار سال قبل کی تاریخیں پڑی تھیں۔  
چار سال سے نرملا دنیا سے الگ تھلگ سینی ٹوریم میں مقید تھی، پھر اس نے نرملا کی  
کتابوں کا بکس پیک کرنا چاہا۔ ایک کتاب میں سے ایک تصویر پٹ سے نیچے  
گری۔ طلعت نے جھک کر اسے اٹھایا۔

یہ گوتم نیلمر کی تصویر تھی جو آج سے دس سال قبل بردھوے کے لیے بہرائچ  
سے سنگھاڑے والی کوٹھی بھیجی گئی تھی۔ طلعت نے خالی خالی آنکھوں سے اس تصویر  
کو دیکھا اور اسے کتاب میں واپس رکھ دیا۔

ہال میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ لڑکے واپس آچکے تھے۔

سر یکھانے کھانے کی میز پر سے آواز لگائی۔

طلعت، ہری شکر کا کمرہ قریب سے ٹھیک کر کے محاذ پر واپس چلی گئی۔

برف باری شدید ہو چکی تھی۔

اس رات، جب ہری شکر سو چکا تھا، طلعت نے اس کے کمرے میں دبے  
پاؤں جا کر کتاب میں سے گوتم کی تصویر نکالی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس تصویر کو  
جوتوں سے خوب ہی مارا جب جا کر اسے ذرا شانتی کا احساس ہوا۔ تب وہ فرش پر  
بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

چونکہ وہ پچھلے دس روز سے نہیں روئی تھی۔

روتے روتے وہ بیہوش ہو گئی اور گھر میں ڈاکٹر کو بلانے کے لیے ایک اور

ہنگامہ شروع ہو گیا۔

ساری دنیا نے سفید برف کا کفن پہن لیا۔ سڑکوں کے کنارے کھڑے ہوئے درخت ایسے نظر آ رہے تھے جیسے کسی مصور نے کینوس پر پھیلے ہوئے چائناوائٹ پر سیاہ رنگ سے ادھر ادھر آڑی ترچھی لیکریں کھینچ دی ہوں جن کے عقب میں مکانوں میں سے چھنتی ہوئی اداس زرد روشنی کے دھبے سے چاروں طرف پھیلے تھے۔ بڑے زور کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ اس عظیم کینوس کے ایک کونے میں ایک خوبصورت دو منزلہ کالج تھا جیسے کالج عام طور پر اوسٹریلی میں جا بجا ہیں۔ ایونیو میں داخل ہوتو بائیں ہاتھ پڑتا تھا۔ سامنے چھوٹا سا روک گاڑن تھا جو بہار کے زمانے میں پھولوں سے لد جاتا۔ سامنے مناسا برا آمدہ تھا جس کی سرخ اینٹوں کی دیوار پر تانبے کی لائین نصب تھی۔ اندر گیلری تھی جس میں سے زرینہ اوپر بیڈرومز کو جاتا تھا۔ نیچے نشست کا کمرہ تھا اور کھانا کمرہ اور گیلری کے سرے پر پارلر تھا۔ اس کے اندر جا کر باورچی خانہ۔ پیچھے لان تھا جس کے سرے پر شاہ بلوط کا درخت کھڑا تھا۔ گھر والوں کا زیادہ وقت پارلر میں گزرتا تھا جہاں وائریس سیٹ اور ٹیلی ویژن کرسیاں، وہیں کھانا بنتا، برتن دھوئے جاتے، اسٹوو کے پاس بیٹھ کر گیمیں ہوتیں۔ جاڑوں کے زمانے میں زرینہ سر پر اسکارف لپیٹے، پتلون پہنے باہر کولری میں سے لکڑیاں نکال کر سوسوں کرتی اندر لاتی اور ڈرائنگ روم کا آتش دان دہک اٹھتا۔ تب دنیا

ایک دم بے حد محفوظ معلوم ہونے لگتی۔ آتش دان پر ایک موڈرن مجسمہ رکھا تھا۔ دیوار پر آشا کا بڑا سا پورٹریٹ تھا۔ جو زرینہ نے مائیس کی طرز میں بنایا تھا بڑا سا ایرانی قالین تھا۔ بڑے بڑے اسٹینڈرڈ لیمپ۔ درتکے میں سے باہر حد نظر تک برف دکھائی دیتی۔ ریڈیو پر اپنیف پسندیدہ نغمے بجتے۔ دوستوں کے فون آتے اب تک بڑی پرامن، سیدھے سادے پرسکون احساسات سے گھری ہوئی زندگی گزر رہی تھی۔

زرینہ یہاں اپنی ماں اور چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی اور یونیورسٹی میں روسی ادب اور فارسی میں بی۔ اے آنرز کر رہی تھی۔ سلیڈز سے آرٹ کا ڈپلو مالے چکی تھی۔ اس کے والد بیرسٹر تھے۔ اس کی جواں سال، سرخ بالوں والی ماں، جو نسلاً انگریز تھیں مگر خالص لکھنؤی زبان میں گفتگو کرتی تھیں ہنسالی محاورے بولنے میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ بے حد محبت والی بی بی تھیں اور بے حد خوش مزاج اور پر مذاق۔ ان کا گھر زرینہ کی دوستوں کے لیے ہمیشہ جائے پناہ کا کام دیتا اور وہ ان سے بڑی بہنوں کی طرح پیش آتیں۔

اس وقت زرینہ پارلر میں میز پر بیٹھی ایک روسی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ اتنے میں گلیری کی گھنٹی بجی۔ زرینہ نے اٹھ کر درتکے میں سے جھانکا۔ برف سے جو تے لت پت کیے، اوور کوٹ کے کالر سے منہ ڈھانپنے سامنے گونم کھڑا تھا۔ زرینہ اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

وہ ہاتھ میں اٹیچی کیس لیے سیڑیاں چڑھ کر برآمدے میں آ گیا۔  
”یہ پانچواں شہر ہے۔ یہاں بھی روشنیاں جل رہی ہیں۔ میرا خیال تھا یہ

جگ مختلف ہوگی۔“

”مگر افسوس کہ تمہارا خیال غلط ثابت ہوا۔ اندر آ جاؤ۔“ زرینہ نے جواب

دیا۔

”میرے ساتھ باہر بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔“

”ان کو بھی بلا لو اندر۔“

”کیسے بالوں۔ اس روشنی میں تم ان کی شکلیں نہیں دیکھ سکو گی۔“

”وہ کون لوگ ہیں۔“

”بہت سے بھوت۔ لاشیں۔ ارواح خبیثہ، وہ سب میری دوست ہیں اور باہر

اندھیرے میں دانت نکو سے کھڑی ہیں۔ ان کا جلوس میرے ساتھ ساتھ چلتا

ہے۔“

”مجھے ان سے ڈر نہیں لگے گا۔“

”تمہیں ان سے ڈر نہیں لگنا چاہیے کیونکہ ہم سب برابر خود ان لاشوں میں

تبدیل ہوتے رہتے ہیں مگر۔“ اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”میرا خیال تھا یہ جگہ مختلف

ہوگی۔ یہاں اندھیرا ہوگا، لیکن تم نے یہاں بھی دیوالی منارکھی ہے۔ روشنی میں تم

کیا دیکھنے کی کوشش کرتی ہو بھائی؟“

وہ اکتا کر اپنے اٹیچی کیس پر بیٹھ گیا۔ زرینہ نے گیلری کا دروازہ کھولا۔

”گو تم۔ میرا مطلب ہے، کہ تم واپس آ گئے ہو، جہاں بھی گئے تھے۔ یعنی کہ۔

دراصل ہم سب بے حد پریشان تھے تمہاری وجہ سے۔“

”میں تم سب کا ممنون ہوں۔“

”میرا مطلب ہے کہ..... ویکلم ہوم..... ہوم جہاں کہیں بھی ہو یعنی۔ ہر سفر کے بعد کا عارضی پڑاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے شان استغنا سے ہاتھ ہلایا۔ ”میں نے تمہارا سواگت قبول کیا،“ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ”یہ مکان تو وہ والا نہیں ہے جس میں تم رہا کرتی تھیں۔ آرٹسٹ کا مکان۔“

”وہی ہے۔“

”اچھا۔“ اس نے غیر یقینی انداز میں کہا۔ ”تم کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہوگا۔ زرینہ کیا میں جیٹی ہو گیا ہوں؟“

”نہیں تو۔“ اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”مضرتم تھکے ہوئے زیادہ لگ رہے ہو۔“

”متواتر بھاگتے رہنے سے انسان تھک ہی جاتا ہے۔ میں جانے کتنے لاکھوں کروڑوں میل چل چکا ہوں اب تک۔“

”تم کہاں تھے؟“

”میں..... یہ کیوں بتاؤں۔“ اس نے بچوں کی طرح جواب دیا۔ ”کئی راتیں میں نے کھیتوں میں گزاریں۔ بھوسے کے ڈھیروں پر سویا۔ ندیوں کی کشتیوں میں گھسا بیٹھا رہا۔ اسٹیشنوں کے ویٹنگ رومز میں چھپتا پھرا۔ سارے میں پولیس کی نظروں سے بچا بچا گھوما کیا۔ تب آج میں نے کہا کہ کیوں نہ ایک شریف بہادر انسان کی طرح سامنے آ کر اقبال جرم کر لوں۔“

”پولیس؟“

”ہاں۔ کیا تم کو نہیں معلوم؟“

”نہیں تو..... کیا؟“

”میں نے، زرینہ بیگم.....“ اس نے بڑے ٹھاٹھ سے مانگ پر مانگ رکھ کر کہنا شروع کیا۔ ”میں نے قتل کیے ہیں۔ تب سے مارا مارا پھرتا ہوں کہ کہیں سر چھپانے کو ٹھکانہ مل جائے۔ واپس آ کر سارے دوستوں کے دروازے کھٹکھٹائے مگر سب دروازے بند تھے اور اندر تیز روشنیاں جل رہی تھیں، پھر میں ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے سوچا لاؤ تمہیں بھی آزما لوں۔“

”اندر آ جاؤ گوتم..... یہاں ہوا بہت تیز ہے۔“

”مگر تم پولیس کو خبر تو نہ کرو گی۔“ اس نے سہم کر پوچھا۔

”قطعاً نہیں۔“

”نہیں میں یہیں بیٹھوں گا۔ گھروں کی چھتیں میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔“

زرینہ نے اس کا رخ سر کے گرد لپیٹ کر جھکڑ کی زد سے بچنا چاہا۔ برف کے گالے چاروں اور بکھر گئے۔

”سنو زرینہ بیگم۔“ اس نے اٹیچی کیس پر بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کر اس سے کہا۔

”میں اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے قتل کیے ہیں اور مال یہ ہے.....“

وہ ہنسا..... ”کہہ بس اس قدر چار سو نہیں ہوں کہ میرے دونوں مفتولوں کو اس کا علم

تک نہ ہوا کہ میں نے ہی ان کا کام تمام کیا ہے۔“ اب دفعتاً اس کی آواز بالکل

نازل ہو گئی۔ ”اس روز جب میں سر یکھا کے یہاں سے پارسل لے کر بھاگم بھاگ

ہسپتال پہنچا تو نرملا نے مجھے پہچان کرنے دیا کیونکہ وہ مرچکی تھی اور جب میں اسی رات وہاں سے لوٹ کر شہر میں مارا مارا پھر رہا تھا تو مجھے چیلسی کے ایک پب میں چپا احمد نظر آئی اور اس نے بھی مجھے نہیں پہچانا..... کیونکہ وہ بے حد ڈرنک تھی..... چنانچہ.....“ اس نے بڑے نخر سے کہا..... ”میں اس قدر کا ماہر فن کروک ہوں..... دیکھا تم نے۔“

برف کا طوفان بڑھتا جا رہا تھا۔ عین اسی وقت پانی اور برقی کچھڑ کے چھینٹے اڑتی ایک موٹر ڈرائیو پر آ کر رکی اور اس کی تیز روشنی میں برف پر ایک پیلا راستہ سامنہ گیا۔

کمال اور ہری شکر موٹر میں سے اترے۔

”زرینہ“ انہوں نے ڈرائیو پر سے آواز دی۔ ”گوتم تو یہاں نہیں آیا؟“

وہ دونوں برف پر بھاری بھاری قدم رکھتے سیڑھیوں پر آ گئے۔

”سوامی جی کے سنٹر میں ابھی ابھی معلوم ہوا کہ گوتم لندن لوٹ آیا ہے اور

شاید اوسٹریلیا کی طرف گیا ہے۔“ کمال کہہ رہا تھا۔

جھوڑی دیر بعد وہ دونوں گوتم نیلمبر کو موٹر میں ڈال کر اپنے گھر لے گئے۔

”کوئی نہیں آیا۔“ شنیل دہی نے دروازے میں آ کر کہا۔ ”تینوں کے تینوں

دہریے میں سوگ باشی نرملا کے گھر والے۔ سوامی جی نے سارا انتظام کیا تھا۔ پھول منگوائے تھے۔ مدارسیوں کی ایک کیرتن پارٹی بھی سوئس کالج سے آگئی تھی، مگر یہ لوگ شانتی کا مارگ ڈھونڈنا نہیں چاہتے۔“

”اور جانتی ہوا اب یہ لوگ کیا کر رہے ہیں وہاں اپنے گھر میں، یا اس انڈین ڈانس کے فلیٹ میں جمع ہو کر صبح سے شام تک تاش کھیلنے ہیں..... حد ہے۔“ ایک بے حد روحانی انگریز بڑھیا نے درتچے میں سے منڈیا نکال کر بات کی۔ چمپا سیڑھیوں پر سے واپس اتری۔

”تم کسی کی متلاشی معلوم ہوتی ہو۔“ دوسری ویدانت پرست امریکن بڑھیا نے درتچے میں سے سر نکال کر کہا۔ ”دیکھو..... وہ یہاں موجود ہے..... تمہیں..... ہم سب کو بلا رہا ہے.....“ انہوں نے انگلی اٹھا کر کرشن کی بڑی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو سنٹر کے ہال میں رکھی تھی۔ ”اسے دیکھنے کے لیے وہ تیسری آنکھ چاہئے جسے افسوس کہ تم ہندوستانی کھو بیٹھے۔“

چمپا ہڑبڑا کر دوڑتی نیچے اتر گئی۔ سڑک پر آ کر اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے سڑک پر چلنے والے سب انسانوں کے ماتھوں پر تیسری آنکھ موجود ہے جو اسے گھور رہی ہے۔ وہ دوڑ کر ایک ۳ نمبر کی بس میں سوار ہو گئی۔

سنٹر میں سوامی دیویکا نند نے اپنا لیکچر پلانا شروع کر دیا تھا۔ یوگا پر ان کا لیکچر سننے کے بعد ان کی سامعین معرفت پسند بڑھیں اپنے گھروں کو لوٹ کر سنک میں پڑے ہوئے صبح کے برتن دھوئیں گی اور موزے رفو کریں گی اور گیس کے بل



کی فکر کریں گی۔ اس وقت لارڈ کرشنا ان کے کتنے کام آئیں گے۔  
وہ بس سے اتر کر طالب علموں کے مرکز کی طرف روانہ ہوئی۔  
ہال میں طالب علموں کی ایک بالکل نئی ٹولی گپوں میں مصروف تھی۔  
”میں چمپا احمد ہوں۔“ کس نے دروازے میں جا کر کہا۔  
”ایس؟“

ایک مدد راسی طالب علم نے آگے آ کر پوچھا۔  
اس کا دل ڈوب گیا۔ اس کا نام کتنا غیر اہم تھا۔ اسے کوئی نہ جانتا تھا۔ کسی کو  
اس کی ضرورت نہ تھی۔  
”کچھ نہیں..... کچھ نہیں.....“

”جی..... آپ کو کیا چاہیے؟“ ایک بنگالی لڑکی نے پوچھا۔  
”کچھ بھی تو نہیں.....“ اس نے اور زیادہ ہڑبڑا کر جواب دیا۔ ”ایسے ہی  
آپ لوگوں کا سنٹرو دیکھنے چلی آئی تھی۔“  
چند لڑکوں نے اسے شک و شبہ کی نظروں سے گھورا۔  
وہ اٹے پاؤں پھر سڑک پر آ گئی۔

اسٹریٹ پہنچ کر وہ انڈیا ہاؤس میں داخل ہوئی۔ لفٹ میں اوپر کی منزل تک  
پہنچی جہاں کینٹین میں حسب معمول خوب شور مچ رہا تھا۔  
”میں چمپا احمد ہوں۔“

اس نے کاؤنٹر پر جا کر کہا۔ اسے اپنی اس احمقانہ حرکت پر مطلق تعجب نہ ہوا۔  
”ایس ڈیئر۔“ ادھیڑ عمر کی ہندوستانی عورت نے، جو ایڈنگ مشین پر بیٹھی تھی،

انگریز عورتوں کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا، ”کھانا تو ختم ہو چکا ہے۔ اسٹیکس ہیں۔“

نہیں..... ٹھیک ہے۔ وہ سٹ پٹا کر پھر باہر نکلی۔ میزوں پر بیٹھے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں نے سراٹھا کر بھی اسے نہ دیکھا۔ ایک کونے میں سر یکھا کامیاں گلشن سر جھکائے کچھ پڑھ رہا تھا، وہ پھر باہر آ گئی۔

اب وہ چوزے کی سرائے پینچی، وہاں سارے سال ملا جو کاؤنٹر پر کھڑا کسی کوفنوں کر رہا تھا۔ اس سے چند باتیں کرنے کے بعد وہ جلدی سے باہر نکل گیا، وہ شیشے کے دروازے کے پاس کھڑی اسے بھیڑ میں شامل ہوتے دیکھتی رہی، پھر باہر آ کر اس نے بی بی سی کی کینٹین میں جھانکا۔ چچا صدیقی کوئی لطیفہ بیان کر رہے تھے۔ اعجاز بنالوی نے ایک نئی بحث شروع کر دی۔ تقی سید منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ یاور عباس کچھ گنگنا رہے تھے۔ میں چمپا احمد ہوں۔ اس نے ان سب کو بتانا چاہا مگر پھر واپس لوٹ گئی۔

سامنے ہی انڈر گراؤنڈ تھی۔ سیڑھیاں اتر کر اس نے بالکل غیر ارادی طور پر میڈ اویل کانکٹ لے لیا۔ چند منٹ بعد میڈ اویل کی چوڑی سڑک پر برآمد ہو کر وہ ایک درخت سے ٹک گئی اور چاروں طرف دیکھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر سر یکھا اور آشا کے مکان تھے۔ باڑ کی دوسری طرف چند قدم پر طلعت اور مال کا فلیٹ تھا۔ اسٹیشن کے مقابل کے جدید بلاک میں شاننا اور ولیم کرگ رہتے تھے۔

عین اسی وقت گروسر کی دکان سے سبزی کا تھیلا اٹھائے سر یکھا باہر نکلی۔ ”ارے چمپا!“ اس نے چلا کر کہا۔ ”وہاں کیسی کھڑی ہو..... آؤ.....“

آؤ۔“

وہ خاموشی سے سر یکھا کے ساتھ ہوئی۔

چند قدم چل کر وہ مکان میں داخل ہوئیں۔

”چانچہ یہی گوگل تھا..... شمار میا..... یہی گوگل تھا.....“ اس نے

آہستہ سے کہا۔

”کیا.....“ سر یکھانے پٹ کر پوچھا۔

”کچھ بھی تو نہیں۔“

”بیٹو۔ گلشن ابھی انڈیا ہاؤس سے نہیں لوٹا۔ تمہیں معلوم ہے اس نے وہاں کام

شروع کر دیا ہے۔“

”اچھا۔“

ڈرائنگ روم کے چوڑے دروازے کے باہر ابھی دن کا اجالا باقی تھا۔ بہت

سی سرخ بتیاں آہستہ آہستہ تیرتی ہوئی آ کر نیچے بکھر گئیں۔ پورچ کی سیڑھیوں پر،

ڈرائیو پر۔ چارپانچ پیتاں درتپے کے باہر رکھی ہوئی بید کی کرسیوں کے نیچے ہوا

میں لرزتی رہیں۔ دھوپ کی سنہری لکیر نے گھاس پر حلقہ سا بنالیا۔

کیا پتا انسان دراصل کیا چاہتا ہے؟

”ارے چمپا..... یہاں اس صوف پر بیٹھ جاؤ آرام سے.....“

سر یکھانے ترکاریاں سینی میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

”اس صوف پر بیٹھنے سے کمرہ وہی تو نہیں بنے گا جو اس روز تھا۔“ چمپا نے

اپنے آپ سے کہا۔

”اس روز..... کس روز؟ کیسا تھا؟“ سر یکھا نے باورچی خانے میں جاتے ہوئے پوچھا۔

”کیا معلوم.....؟“

خالص موسم اب باہر فضاؤں میں پھیل چکا تھا۔ شدھ سردی۔ شفاف، پاکیزہ برف۔ سارا وجود بے حد ہلکا پھلکا اور صاف محسوس ہو رہا تھا۔ سر یکھا نے شمال اور ڈھنی اور کمرے میں آ کر آتش دان جلایا۔

”کل.....“ اس نے بالٹی میں سے کونلے اٹتے ہوئے بات کی۔ ”بہت سے لوگ گھر واپس جا رہے ہیں۔“

”ہاں۔ ہندوستان۔“ سر یکھا نے راکھ کریدنا شروع کی۔

”کون..... کون.....“ چمپا نے بے تعلقی سے پوچھا۔ اب اسے کسی سے کیا مطلب، وہ اس خالص موسم کی طرح سارے میں پھیلی تھی۔ اسے مخصوص شخصیتوں سے کیا غرض۔ اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔

سر یکھا گھر بلو انداز میں پلو کمریں کھونسنے کے بعد پھر ترکاری کاٹنے بیٹھ گئی۔ ”سبھی.....“ اس نے جواب دیا۔ مال۔ ہری۔ کمالا۔ ہری فلانی کر رہا ہے۔ مال پر سوں کیلے دنیا سے جائے گا۔ گوتم آج صبح کرشنا مینن کے ساتھ پھر نیویارک چل دیا۔

باہر چھتوں کے پرے ایک دم سورج ڈوب گیا۔ بگ بین نے ریڈیو میں اپنا بگل بجایا۔ باہر تاریکی چھا چکی تھی۔ جاڑوں کی رات کی تاریکی جو دفعتاً دنیا کو آ دیو چتی ہے، وہ سر یکھا کی مدد کرنے کے لیے باورچی خانے میں چلی گئی۔

ڈرائنگ روم میں گلشن کے اور اس کے دوست داخل ہو چکے تھے، وہ باورچی خانے کے دروازے سے نکل کر سردباغ میں سے گزرتی آشا کے گھر چلی گئی۔

سریکھا کی آواز پر وہ واپس لوٹی۔ اس نے درپچے میں سے اندر جھانکا۔ شام کا اثر کمرے میں ختم ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ رات نے لے لی تھی، وہ دوبارہ اس کمرے میں گئی مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ سائے دوسرے تھے، رنگ، فضا کا سر۔ وقت بھی کھڑی کے راستے باہر چلا گیا۔ اس کا ذرا سا لکڑا بھی پیچھے پڑا نہیں ملا۔

سریکھا کے گھر سے باہر نکل کر اسے مال کے مکان کی روشنیاں نظر آئیں۔

مجھے چھوڑ کر مت جاؤ..... مجھے چھوڑ کر مت جاؤ..... مجھے چھوڑ کر مت..... اس نے چلا کر کہنا چاہا مگر خاموشی سے تیز تیز قدم رکھتی اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی اور جون کارٹر کی گلی میں پہنچی اور اسٹبل کے دروازے میں جا کر روشنی جلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

مگر دفعتاً تاریکی نے سامنے آ کر اسے خوش آمدید کہا، وہ درپچے میں رکھے ہوئے جرنیم کے پودوں پر جھک گئی۔ اب تک رات میری خلاف تھی۔ اس نے سوچا۔ اب شاید میری ساتھی بن جائے۔ اونچے مکانوں پر سے گزر کر آتی ہوئی ہوا، گھاس کی سرسراہٹ، پتوں پر جمی ہوئی برف۔ زمین پر رات کی موجیں بہتی چلی جا رہی ہیں اور اب دھارے الگ الگ ہو چکے ہیں۔ اب میں واقعتاً مکمل طور پر آزاد ہوں، وہ ہنسی۔ نیچے بہت ٹھوس، حقیقی زمین ہے اور اس زمین پر مجھے موت تک چلے جانا ہے۔ قدم مجھے کہاں کہاں لے جائیں گے۔ (اس نے پیروں کو اس طرح دیکھا گویا آج تک وہ اسے پہلے کبھی نظر نہ آئے تھے۔) رات میرے ہاتھ

میں موجود ہے اور اس کے ہاتھ میں بھی۔ رات کی رسی کو میں مضبوطی سے تھامے تھا۔ دن تک پہنچ جاؤں گی۔ رات تو آج سے میری سبھی ہے۔ کہو سبھی کیس ہو۔ میں تو تم کو مدتوں سے جانتی ہوں۔ برساتوں میں، پھاگن کی رت میں پورنمشاشی میں، امتحانوں کی پڑھائی کے زمانے میں، اجنبی دیسوں میں، ٹرینوں میں سفر کرتے ہوئے میں نے تمہاری ہر کیفیت کو دیکھا ہے۔ میں نے اور تم نے اکٹھے سے بتایا ہے۔ ایک روز تم ہی جیتو گی۔

اور تم، اس نے دوسری بات شروع کی، میں تم کو تمہارے خوابوں کی دوسرا تھا میں چھوڑتی ہوں۔ میں شاید ایک واقعیت تھی اور تم خواب دیکھنے سے کبھی باز نہ آؤ گے۔

رات تاریک تر ہوتی گئی۔ سردی بڑھ گئی۔ جون کارٹر کے فلیٹ میں مکمل سنانا تھا۔ نیل اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ جون بھی سو چکی تھی۔ اوجیت اپنی میننگ سے نہیں لونا تھا۔ خاموشی کی لہریں بوسیدہ دیواروں سے ٹکرایا کیں۔ وقت نے کہا: مجھے پہچانو۔ میں تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارا خیال تھا لمحے اپنے جگہ قائم رہیں گے، لیکن تمہارا یہ خیال بھی غلط تھا۔ مجھے دیکھو اور جانو۔ میں جا رہا ہوں پل پل، چھن چھن۔ پردوں کے پیچھے تہ درتہ اندھیروں میں غائب ہوتا جا رہا ہوں۔ میں حد فاضل ہوں۔ اس کے آگے تم نہیں جاسکتیں۔ اب واپس لوٹ چلو۔ سرحد پر تم پہنچ چکی ہو۔ سامنے پھانک ہے۔ اب دوسرا دیس شروع ہوتا ہے۔ اب تم کو دوسرے پروانہ راہداری، نئے کاغذات کا انتظام کرنا ہوگا۔ نئے سرے سے خانہ پری اور دستخط کرنے ہوں گے کیونکہ اب نئی سرحد شروع ہوتی ہے۔ میں نے اب

تک بہت سے سحر توڑے ہیں۔ تمہارا والا سحر تو بہت ہی غیر اہم تھا۔  
 مجھے پ بچا نو۔ میں برابر تمہارے ساتھ چلتا رہوں گا۔ تم کم از کم مجھ سے نہیں  
 بھاگ سکتیں۔ لوگ تمہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ میں تم کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔  
 دیکھا تم سرحد پر کتنی جلدی پہنچ گئیں۔ تم کو فیصلہ کرنے میں کتنی دقت پیش آ رہی  
 تھی۔ میں سارے معاملے طے کر دیتا ہوں۔ سارے فیصلے، سارے ارادے  
 میری وجہ سے خود بخود پورے ہوتے چلے جاتے ہیں۔  
 ابھی تم پر اور مصیبتیں آئیں گی لیکن میں تم کو ان کا مقابلہ کرنا بھی سکھا دوں گا۔  
 اب مجھ سے صلح کرلو۔ میں اب بھی موجود ہوں۔  
 ہوا کے ایک تیز جھونکے سے کھڑکی کا پردہ پھٹھنا نے لگا۔ کمرہ کمرے سے بھر  
 گیا۔ تب اسے معامحسوس ہوا کہ وہ سردی سے کپکپا رہی ہے۔ اس نے جلدی سے  
 دریچہ بند کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

۹۴

”اپنی کے بیاہ میں پہننے کے لیے میں تو بڑی بڑھیا بڑھیا ساریاں بنواؤں گی،  
 کارچولی۔“ نرملا کہہ رہی تھی۔  
 میں خاموش رہی۔

”مجھے تو یہ نئے قسم کی بارڈروالی ساریاں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔“ مالتی نے

ہونٹ لٹکا کر بڑی بوڑھیوں کی طرح کہا۔ مالتی رائے زادہ سولہ برس کی تھی۔ نرملا اس سے ایک سال چھوٹی تھی۔ میں نرملا سے ایک سال چھوٹی۔ ان دونوں نے سخت بزرگی کے عالم میں ملبوسات کے متعلق اپنی وسیع معلومات کا مجھ پر رعب ڈالنا شروع کیا۔ میں بڑی عقیدت سے ان کی باتیں سنتی رہی۔

پھر طلعت دفعتاً خاموش ہو گئی۔ ”دیکھو“ اس نے کمال سے کہا، ”میں نے آج یہ محسوس کیا ہے میرا ماضی صرف میرے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ دوسروں کے لیے، دنیا کے لیے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ نہ دنیا کو اس سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔“

”میرا ماضی محض میرا ماضی ہے۔“ کمال نے طلعت کی بات دہرائی۔

”اور دنیا کو صرف حال سے دلچسپی ہے۔“ ہری شنکر کی آواز گونجی۔

”لیکن ماضی حال ہے۔ حال ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی۔ وقت کی اس شعبہ بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے۔“ طلعت نے کہا۔ ”میں وقت کے ہاتھوں عاجز آ چکی ہوں۔ تم میں سے کوئی میری مدد کیوں نہیں کرتا۔“

”تمہاری مدد طلعت بیگم شاید آسن اسٹائن بھی نہیں کر سکتا۔“

”میرے ماضی سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔“ کمال نے پھر ضد سے

دہرایا۔

”وقت برابر موجود ہے۔ وقت مسلسل حال ہے۔“ طلعت نے کہا۔

یہ لوگ جو لندن کے سینٹ جانز ووڈ میں بیٹھے ۱۵ دسمبر ۵۴ء کی سہ پہر کو یہ باتیں کر رہے تھے ان کے سائے کھڑکیوں کے شیشوں پر عجیب عجیب شکلیں بناتے



رہے۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ موٹریں آ جا رہی تھیں۔ وائرلیس میں سے وی آنا کے کسی کونسرٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وقت کے وسیع اندھیرے اور اونچی دیواروں اور سڑکوں اور گلیوں اور آوازوں کی بھول بھلیاں میں گھرے تینوں موجود رہے۔

وقت کے اسی اندھیرے میں طلعت ۱۹۴۱ء کی جولائی میں سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھی نرملہ اور مالتی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس طلعت میں اور اس لڑکی میں کوئی فرق نہ تھا مگر دونوں مختلف ہستیاں تھیں۔ شاکہ منی نے کہا تھا کہ انسان ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ بچپن میں کچھ اور ہوتا ہے جوانی میں کچھ اور۔ تم اس لمحے سے پہلے نہیں تھے۔ صرف تسلسل باقی رہتا ہے۔ دور پہاڑوں میں گلشیر ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے تھے۔ ہوائیں۔ وقت جو سیال تھا، وقت جو منجمد تھا۔

”ہم اپنا قصہ دہرا کر اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔“ ہری شنکر نے کہا۔ ”کیونکہ ہم خوفزدہ ہیں۔“

”اور گوتم نیلمر تک کس قدر خوفزدہ نکلا۔“ سال نے کہا۔

”گوتم نیلمر کا اس وقت ذکر نہ کرو۔ تم اصل موضوع سے بہت دور ہٹ جاؤ گے۔ طے یہ کرنا ہے کہ زندگی میں اصل موضوع کیا ہے۔“ ہری شنکر نے کہا۔ ”میں چودہ سال قبل بھی موجود تھا اور اگر زندہ رہا تو چودہ سال بعد بھی ہری شنکر ہی سمجھا جاؤں گا اور جب وقت کے سارے تجربے ہم اپنے اوپر کر لیں گے تو یہ جو چھوٹے چھوٹے گنی پک ہم لوگ ہیں ہم بھی ختم ہو جائیں گے۔“

وقت کے پیٹرن میں طلعت جہاں بیٹھی تھی وہی طلعت اسی پیٹرن میں ایک

جگہ اور موجود تھی اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے پر انسان صرف آگے کی سمت چل سکتا تھا۔ آگے..... اور آگے..... پیچھے جانا ناممکن تھا۔ گو ہزاروں طلعتیں ان گنت ٹکڑوں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں جیسے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں ایک ہی چہرے کی مختلف عکس نظر آتے ہیں۔

کمال گویا اسٹیج پر چلتا ہوا وسط کی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ مکھی کی آنکھوں سے اس نے سب کو دیکھا۔ مائیکل۔ بل کریگ۔ زرینہ، وہ سب صبح صبح گوتم نیلمر کو انیر پورٹ پہنچا کر واپس لوٹے تھے اور مال کے کمرے میں ہر شکر اور مال کے بندھے ہوئے اسباب پر چڑھے بیٹھے تھے۔

گوتم زرینہ کے یہاں سے آ کر چندہ دن تک مال کے گھر پر بیمار پڑا رہا تھا۔ تب وہ دن بھر تاش کھیلتے یا بیت بازی کرتے۔ مکی ماؤس کے کوکب اور فلمی رسالے تک پڑھے گئے۔ گوتم ابھی پوری طرح صحت یاب نہ ہوا تھا کہ کشمیر کے کیس کے لیے اسے پھر نیویارک جانے کا حکم آ گیا۔ لندن میں یہ مال اور ہری شکر کا آخری دن تھا۔ ہری رات کو انیر انڈیا سے پرواز کرنے والا تھا۔ مال کو کل صبح بوٹ ٹرین پر سوار ہونا تھا۔ مکلا بھی جا رہی تھی۔ مائیکل بھی جا رہا تھا۔

طلعت نے دوبارہ کیلنڈر پر نظر ڈالی۔ ۵ اکتوبر ۵۴ء۔ اسے پھریری سی آئی۔ ”مائیکل دروازہ بند کر دو“ مائیکل نے اٹھ کر ایسا ہی کیا۔ لوگ طلعت کو کھلدار کھلونوں کی طرح نظر آئے۔ سپاہی جن کے ہاتھ میں بندوقیں تھیں (مائیکل) سر ہلاتے ہوئے سفید چکی داڑھی والے چینی فلسفی (ہری شکر)۔ مہاراجہ چندر گپت

کے دربار کی زندگی (سریکھا)۔ دھاڑیں مار مار کر روتے، ماتم کرتے اپنی زندگی کے تعزیے کے ساتھ ساتھ ننگے پاؤں چلتے گولہ گنج والے کمر خیدہ نواب کمسن صاحب (مال)۔ دیوانی کے گڑیوں گڈوں کی طرح وہ سب سامنے بچے تھے۔ مورتیاں جن کو لکھنؤ کے کہاروں نے بنایا تھا۔ (ان میں سے ایک مورتی گر کر ٹوٹ چکی تھی۔) ابھی بہشتی آئے گا، چھڑکاؤ ہو گا، تختہ بچھے گا۔ تخت پر راجہ بیٹھے گا۔ لونا پھاری کا جادو چلے گا، پھر یہ سب جا کر اپنے طاقتوں میں بیٹھ جائیں گے۔

”میں بالکل ٹھیک تھی۔“ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”مگر پھر ایک دم چیزوں نے مجھے ڈرانا شروع کر دیا۔“

کمال نے گویا اس سے کیولے کر کہا: ”یہ انکشاف ہوا کہ کائنات میں بڑی گڑبڑ ہے۔“

”اور اس سے پہلے کہ مجھے معلوم ہو میں الفاظ کے سمندر میں سے گزرتی خیالات کے پر خطر راستے پر نکل کھڑی ہوئی تھی۔“

”الفاظ کیا تھے؟ حقیقت کیا تھی؟ کتابوں نے کہا الفاظ غلط ہیں۔ حقیقت کوئی شے نہیں سمبندھ لاتی ہے۔ پتارم، ماترم، پترم، پوترم..... سب.....“  
ہر شے فالتو ہے۔ کبھی میں نے دیکھا پر ہسپتی را کھشوں کو اپنا علم بڑھہا رہا ہے۔  
کبھی میں خود اپنے آپ کو ایک عظیم را کھشنی نظر آ ہی یا پریوں کی کہانیوں کی کوئی چٹیل جو اپنے علم کی جھاڑو پر سوار تاریک خلاؤں میں نا پتی پھر رہی تھی۔

ان تاریک خلاؤں میں اور بہت سی جھاڑوئیں سن سے پاس گزر جاتیں جن پر ہزاروں لڑکیاں سوار تھیں: تمہینہ، نرملا، روشن، جون کارٹر، فیروز، چمپا، زرینہ اور

جانے کون کون۔ یہ جھاڑوئیں اب اتنی اوپر اڑ گئی تھیں کہ اب ان کا نیچے اترنا محال تھا۔ دراصل ساری دنیا کے آسمان ان جھاڑوؤں سے پر تھے۔

ان سب میں چمپا ایک بڑی قابل ذکر ہستی تھی۔ اس سے غلطی یہ ہوئی خواب دیکھنے شروع کر دیے۔

اب اگر آپ ایک جھاڑو پر سوار ہوں اور سو جائیں تو لامحالہ آپ راستہ بھول جائیں گی اور آپ کی جھاڑو ٹکرا کر نیچے آ رہے گی۔

اپنی خواب کی حالت میں وہ عہد نقیض کے بھگتوں کی مانند گاتی پھری۔ گرجاؤں میں گئی۔ راہبات کو رشک سے دیکھا۔ ذاتی زندہ خدا اور اپنی زندگی کے مجازی خدا کے تصور کو یکجا کرنے سے اسے غالباً بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ اس مسرت کا تم تجزیہ نہیں کر سکتے۔ یہاں عقیدے اور اللہ کی ذات میں یقین کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ محض جموڑی سی معرفت کی ضرورت تھی جو صبح منہ اندھیرے بھیرو کاؤ تو آپ سے آپ حاصل ہو جاتی ہے۔ میں رادھا ہوں۔ میں سیتا ہوں۔ میں مریم مگدالین ہوں۔ میں زریں تاج طاہرہ ہوں۔ مدتمیں گزریں اس نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ جب میں چیمپل میں جاتی ہوں اور ہشپ گھنٹی بجاتا ہے اور یوکر اسٹ کے گلاس اٹھائے جاتے ہیں تو میں اس ساری اشاریت کے جال میں خود کو موجود پاتی ہوں۔ گوتم نیلمبر کی طرح اس ہر واقعے میں رمزیت نظر آ جاتی تھی۔

وہ سب کمرے سے نکل کر نیچے سڑک پر آ گئے۔ مال نے ناک اٹھا کر کھرے کو سونگھا۔

”چیزوں کی رمزیت کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ میں نے اس کی وجہ سے بہت

دکھا اٹھائے ہیں۔“ مائیکل نے ہوا میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ طلعت نے جواب دیا، وہ سب سر جھکائے زمین کو تکتے چلا کیے۔  
شام کی کلرنگ روشنی میں وہ ہیمپسٹیڈ ہیلتھ کی طرف بڑھتے رہے۔ مکانوں کے  
چھوٹے چھوٹے بیک گارڈن، کھڑکیوں میں سے جھانکتے ہوئے لوگ، تنگ  
گلیاں رے جن کے سرے پر نیم تاریک قہوہ خانے تھے۔ لڑکیاں دفاتروں سے لوٹ  
رہی تھیں۔

”یہ منظر میرے لیے لرزہ خیز ہے۔“ ہری شنکر نے کہا۔

”ہاں۔“ طلعت نے اسی طرح جواب دیا۔

پہاڑی پر پہنچ کر وہ مصوروں کی تصویریں دیکھتے پھرے اور مزید بولے۔  
”وہ دیکھو تو مانا وغیرہ آرہے ہیں۔“

”آہا۔“

بچے میلہ لگا تھا۔ چھپی عورتیں ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتا رہی تھیں۔ بچے  
مونگ پھلی اور آئس کریم کھا رہے تھے۔

”سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ ہم دوسروں کو اپنے خوابوں میں گھسیٹنے کی  
کوشش کریں۔“ مائیکل نے کہا۔

”ہاں۔“ طلعت نے دہرایا۔ ”میرا ماضی، میرا وقت، میرے خواب صرف  
میرے ہیں، وہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے، گو خیال رکھو.....“ اس نے جلدی سے  
اضافہ کیا۔ ”میں شخصی سطح پر یہ بات کر رہی ہوں۔ مستقبل ہم سب کا مشترک  
ہے۔“

مائیکل نے ایک کنکراٹھا کر غصے سے اسے مارا۔ ”خدا کے لیے اس نقطے پر پہنچ کر بھی پارٹی لائن مت چلاؤ۔ مستقبل مشترک نہیں ہے۔ مستقبل اس پھاڑی کے ادھر ہم سب کے لیے الگ الگ منہ پھاڑے کھڑا ہے، ہری کے دس سروالے خدا کی طرح۔“

”او مائیکل۔“ طلعت نے بچوں کی طرح کہا، ”یہ واقعہ ہے کہ میں بہت ڈرتی رہی ہوں۔“

”ہاں۔“

میرے ڈرانے کو کیا کم چیزیں تھیں۔ خوبصورت مناظر۔ آرام وہ گھر۔ بیگ کھلتی تو اس میں سے طرح طرح کے کاغذات نکلتے۔ بنکوں کے مراسلے۔ شیرز کے کاغذات۔ جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کی رپورٹیں جن پر نام ہوتے: سہنا، سر بیرین مگر جی۔ شری تھا پڑ۔ ان سب نامزوں کے پیچھے ایک اور دنیا تھی۔ اونچی مضبوط عمارتیں۔ شفاف غیر شخصی دفاتر۔ روپیہ۔ روپیہ۔ معاشیات کے مسائل۔ اسٹرائیک۔ بھوک۔ بے روزگاری۔ ڈائریکٹروں کے اجلاس۔ ٹریڈ یونین۔ مزدور بستیاں۔ سٹی آف لندن۔ کلائو رو کلمتہ۔ ہشپ گیٹ۔ چورنگی۔ ٹانما نگر۔ اینڈ ریو یول کلمتہ۔

”نیمس ڈرتے ڈرتے ان کاغذات پر دستخط کرتی، جو گویا میرے تحفظ کے ضامن سماج میں میرے اونچے دولت مند درجے کے گواہ تھے۔ یہ سب کیوں ہے؟ مجھے اس کا کیا فائدہ ہے؟ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ میں رضا خاندان میں پیدا ہو کر اس کھڑاگ کی وارث قرار دی جاؤں۔ کاغذ کے ٹکڑے۔ روپیہ۔ روپیہ۔

روپیہ۔ دفعتاً روپے کی اہمیت کا سارا احساس میرے دل سے مکمل طور پر زائل ہو گیا۔ لوگوں نے کہا: پوتروں کے رئیس ایسے ہی غنی ہوتے ہیں، وغیرہ مجھے یہ سن کر بڑی ہنسی آتی۔“

وہ سب پتھروں پر بیٹھ گئے۔ نیچے وادی میں جھیل کے پانی پر ڈوبے سورج کی کرنیں رقصاں رہیں۔ سالویشن آرمی والوں کا ایک دستہ بینڈ بجاتا سامنے سے گزرا۔

کمال جھیل کے کنارے تنہا کھڑا تھا اور اس بلندی پر سے بہت چھوٹا سا نظر آ رہا تھا۔

معا طلعت زور سے قہقہہ مار کر ہنسی۔

سب نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں نے ایک مرتبہ نرملا سے پوچھا تھا: رانی بی بی! تمہیں ڈر کا ہے کا ہے۔ نرملا نے جواب دیا تھا کہ میں اپنے خوابوں کو اس سے بچانا چاہتی ہوں، وہ میرے خواب جانتا ہے۔ کتنی ہنسی کی بات ہے کہ نرملا کے خواب اب اس کے پاس ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں۔ گوتم بالآخر لاعلم رہا۔ ہم لاعلمی میں پیدا ہو کر لاعلمی میں زندہ رہتے ہیں اور اسی میں مر جاتے ہیں۔ یہی اصل سدھانت ہے۔“

کمال ان کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ مائیکل نے جھک کر گھاس کا پتا توڑا۔ میلے میں بجتی ہوئی موسیقی ختم ہو چکی تھی۔ سردی زیادہ ہو گئی۔

ایک جیٹ طیارہ ان کے سروں پر سے گرجتا ہوا گزر کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ وہ مہراٹھا کر اسے دیکھا کیے۔

”اعلمی کا جو شہر ہم نے بسا رکھا تھا اس کی دیواریں ہم نے فلسفے کی اینٹوں سے  
چنی تھیں چہ“، طلعت نے بات جاری رکھی۔ ”ایک روز سیندھ لگا کر موت ہمارے  
شہر میں داخل ہوئی۔“

”ایک مرتبہ جب فارن برا کے ایئر فیسٹول کے موقع پر بے چارہ جان  
ڈیری آواز کی سرحد توڑتے خود ہلاک ہو گیا تھا اس کا طیارہ فضا میں پاش پاش ہو کر  
تماشا نیوں کے اوپر آن گرا تھا..... بیسیوں لوگ مرے تھے۔ اس سبب، جب  
طیارہ دکھتے ہوئے آشتیں گولے کی صورت میں آواز سے زیادہ تیز رفتار کے  
ساتھ میری طرف بڑھ رہا تھا، اس لمحے مجھے پتا تھا کہ یہ موت ہے۔ آن کی آن  
میں میں بھی جل کر بھسم ہو جاؤں گی، مگر جانتے ہو۔ زمین پر اوندھے لیٹنے کے  
 بجائے میں طیارے کے ٹکڑوں کی بوچھاڑ میں چند را اور زرینہ کو پکارتی پھری کہیں  
وہ نہ مر گئی ہوں۔ مجھے اس وقت اپنے بجائے ان دونوں کی زندگیوں کی فکر تھی۔  
اپنے متعلق تو احساس بھی نہیں تھا۔“

”لہذا انہوں نے موت کا سامنا کیا تو مجھے لگا کہ اسے بھی خوف محسوس نہ ہوا ہو  
گا گو یہی ایک واحد تجربہ ایسا ہے جس میں انسان کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتا  
لہذا ہم نے اسے یہ تجربہ کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ بے چاری ہاتھ پاؤں مارتی  
دریا کے تاریک کنارے میں بہہ گئی۔“

”ویدانت میں کہیں پر وجود کی چار کیفیتوں کا ذکر ہے:- جاگتا ہوا انسان،  
خواب، بغیر خواب کی نیند اور موت۔“

”جس روز میں بے ہوش ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ میں بہت



گہری نیند سو رہی ہوں۔ خالی اس گہری نیند میں مجھے خواب نہیں دکھائی دیے۔ میری آتما جا کر اندھیرے سے مل گئی اور جب واپس آئی تو مجھے معلوم بھی نہ ہوا کہ میں کہاں گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہی موت ہے اور جب یہ آئی تو آتما دوسرے غیر مرئی لیکن مادی جسم کو ساتھ لے کر اپنی راہ نکل کھڑی ہوئی۔ اب بہت سے راستے سامنے تھے۔ ان پر مارا مارا پھرنا تھا مگر واپس نہیں آنا تھا۔ یا نہ جانے کیا ہونا تھا۔ مہاراجہ جنک نے کہا تھا: متھا! جل رہا ہے مگر میں باقی ہوں۔ غالباً یہ صحیح ہے۔“ طلعت نے کہا۔

”ہم سب جلے جا رہے ہیں۔“ ہری شکر نے مائیکل سے کہا۔ ”کیا آگ کی لپٹیں تم تک نہیں پہنچیں۔“

مائیکل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

نیچے نیم تاریک گھاٹی میں سال گاتا پھر رہا تھا۔ اس کی آواز ہوا پر تیرتی ان لوگوں کے کانوں تک پہنچی۔ چاند درختوں پر طلوع ہو رہا تھا۔

طلعت پھر اپنے سفر پر چل کھڑی ہوئی: ”اس سے چاند سنگھاڑے والی کوٹھی کے باغ میں کنوئیں پر جھکا آنگن کے اندر کھڑا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”مرنے کے بعد روح شعلے سے رات میں، رات سے بڑھتے چاند میں، بڑھتے چاند سے بڑھتے سال میں، دیولوک میں، وایو کی دنیا میں ہوا، سورج اور بلجی سے گزرتی چلی جاتی ہے۔ واپسی میں وہ فضا، دھوئیں، بادل اور بارش اور پودوں میں پہنچی۔ قربانی کا شعلہ ہوا سے دھوئیں میں دھوئیں سے کھر میں، کھر سے بادل میں، بادل سے بارش میں تبدیل ہو کر برس جاتا ہے۔ ساری رو میں فضا میں تحلیل ہو گئیں۔“

”خیالات کا اور روح کا سفر ایک ہے۔“ شکر نے کہا۔

”موت مجھے ختم کر دے گی۔ موت کو کون ختم کرے گا؟ ہوائیں میرے سانس کو اڑالے جائیں گی۔ سورج میری آنکھوں کی روشنی پر پردہ ڈال دے گا۔ چاند میرے دماغ کو سدا دے گا۔ آتما فضا میں گھل جائے گی۔ خون پانی میں گھل کر پانی بن گیا۔ طلعت نے چٹان پر کھڑے ہو کر دہرایا۔“

”گہری نیند۔ گہرا خواب۔“ شکر نے کہا۔ ”عناصر سوچ رہے ہیں۔ حواس سوچکے ہیں۔ صرف موت باقی ہے۔“

”جسم سوچتا اور محسوس کرتا ہے، وہ ختم ہوا تو سمجھو سب کچھ ختم ہوا۔ جلتی آگنی، سرد پانی، خشک ہوائیں۔ سب اپنے سجاؤ سے آپ پیدا ہوئی ہیں۔ گوتم نے چمپا سے کہا تھا: اگر تمہارا جسم تمہارے ذہن سے کوئی علیحدہ چیز ہے تو اسے علیحدہ کر دو اور صرف تم میرے پاس آ جاؤ، مگر تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“ مادہ پرست گلشن نے کہا۔

”آئے پریم پگے پروانے جوال منی چھوی کے دیوانے

جز چلن کے پیچھے رہے بیشی دیپ شنگھا لہرائے رہے.....

دیپ شنگھا لہرائے رہے.....“

چندرا نے گایا۔

”ابھی بہت سوں کو مرنا ہے، میں ان کے پہلے جا رہا ہوں۔ بہت سے مر رہے ہیں، میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں جو مر گئے ان کے ساتھ کیا ہوا۔ آگے دیکھتا ہوں، جو میرے بعد مریں گے ان کے ساتھ کیا ہوگا؟“ ہری شکر نے کہا۔

”چیونٹی چڑھی پہاڑ پر کانوں میں ہاتھوں لٹکائے  
ایک اچنبھا ہم نے دیکھا، نیا بچ ندیا ڈوبی جائے“  
گھائی میں سے مال کے گانے کی آواز آئی۔

”میری قیمت کیا ہے۔ میں نے اب تک کیا کیا ہے۔“ سر یکھانے کہا۔  
”میں جو کچھ کرتا ہوں میرا ہر فعل لگتا ہے ساری کائنات کے چکر سے اس کا براہ  
راست تعلق ہے۔ اس اہمیت کو چھپانے کی غرض سے میں ہنستا ہوں۔ ویسے میں تم  
کو یہ بتا دوں۔“ مائیکل نے انگلی اٹھا کر کہا ”ہمارا حشر بہت برا ہوگا۔“  
”کیا کریں۔ کیا کریں۔ کیا کریں۔“ ڈراؤ نے کورس کی مانند ان کی آواز  
پہاڑی پر گونجی

”سامنے مستقبل کی دیوار ہے اور میں مائیکل کی مانند اس کے سامنے کھڑی  
کھڑی چلا کر رو رہی ہوں۔ کیا تکلیف اٹھانا جرم کا ثبوت ہے؟“ طلعت نے  
کہا۔

”کسی امریکن نیگرو کو بلاؤ، کسی جرمن یہودی کو پیش کرو، کسی عرب پناہ گزین کو  
ہمارے سامنے حاضر کیا جائے، کسی پاکستانی مہاجر اور ہندو شرنارتھی کو آواز  
دو..... اور ان سب سے پوچھو کہ تمہارا جرم کیا ہے جس کی یہ سزا تم کو ملی؟“  
گلشن نے کہا۔

”میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ میری سزا تجویز کرو۔“ مائیکل نے کہا۔  
”اسرائیل کے نئے نغمہ نواز! ہم تو محض ڈیپورا کا گیت تم سے سننا چاہتے  
تھے۔“ طلعت نے کہا۔ ”مگر تم نے ہاتھ میں بندوق اٹھالی۔“

”ہم ہزاروں برس تک روتے رہے۔ صحرائوں کی بھوک۔ غصہ۔ بے کسی۔  
 چیخ چیخ کر ہم نے یہوداہ سے فریادیں کیں۔ داؤد کے گیت کاروں کا کرب۔ بے  
 چارگی۔ خواب۔ میں طلعت کا سوال دہراتا ہوں..... کیا تکلیف اٹھانا جرم کا  
 ثبوت ہے؟ روح کی تنہائی انہوں نے اپنے لُحْن میں انڈیل دی۔ گہرائی کی تنہائی۔  
 اونچائی کی تنہائی۔ دکھ، شک، ترغیبات اور گناہ کی تنہائی۔ کسی کشش میں گرفتار ہو کر  
 انسان خود کو کس قدر اکیلا محسوس کرتا ہے۔“ مائیکل نے کہا۔

”جنگلوں میں ایک ہزار جوگی بیٹھے بھجن کرتے تھے۔ میں نے ان کی آوازیں  
 سنیں۔“ ہری شنکر نے کہا۔

”بابل اور فلسطین کے سبزہ زاروں پر میں گاتا پھرتا رہا تھا۔“ مائیکل نے کہا۔  
 ”میں نے تمہاری آواز بھی سنی تھی۔“ طلعت نے کہا۔

”یہ سارے تصورات جمع کر کے ایک قربان گاہ کا پردہ کاڑھ دو یا کھڑکیوں  
 کے شیشے رنگ دو۔ تمہارا تخیل باز نطینی مصوروں کی طرح حد سے زیادہ بھرپور  
 ہے۔“ مادہ پرست گلشن نے کہا۔

”تاریخ کا احساس میرے سر پر تلوار کی طرح معلق ہے۔ میں اپنے آپ سے  
 پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔“ مائیکل نے کہا۔

”کیا کریں۔ کیا کریں۔ کیا کریں۔“ کورس نے کہا۔

”کتابیں وہی تھیں جواب تک ہزاروں لوگ پڑھ چکے تھے۔ نئی کتابیں چھپتی  
 تھیں۔ مضمون لکھے جاتے تھے۔ نئی کہانیاں بنتی تھیں۔ روز صبح کو پھاڑوں پر روشنی  
 پھیلتی تھی۔ کلیساؤں میں داؤد کے نغمے دہرائے جاتے تھے۔ میرے ربائی نے کہا:

انسان کو سبت کی رات پانی نہیں پینا چاہیے اگر پئے گا تو اس کا اپنا خون اس کے سر پر ہے، لکھیں انسان پیسا سا ہے تو اس کا کیا علاج ہو؟ اس سے کہو، انسان سے کہو واؤڈو کے ساتھ سات آوازوں کو دہرائے۔ خداوند خدا کی آواز پانیوں کے اوپر ہے۔ خداوند خدا کی لرزہ خیز قبرناک آواز۔ اس آواز سے لبنان کے دیو وار ٹوٹ کر نکلڑے نکلڑے ہو جاتے ہیں۔ اس آواز سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ اس آواز سے ویرانے لرز اٹھتے ہیں۔ جنگل سونے ہو جاتے ہیں اور اس کے ہیکل کے پجاری کہہ اٹھتے ہیں۔ تقدیس ہو..... تقدیس ہو..... مگر تم پھر بھی کہتے ہو: میں پیسا ہوں..... میں پیسا ہوں.....“ مائیکل نے کہا۔

”بھوک سے زیادہ انسان پیدا ہوتا ہے۔ عمر بھر اسے بھوک ستاتی ہے۔ محبت کی۔ روٹی کی۔ سکون کی۔“ مادہ پرست گلشن نے کہا۔ ”بھوک اور پیاس ہمارے سب سے بڑے بھوت ہیں جن میں سب سے پہلے ان بھوتوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں وہ دوسری نجات مجھے آپ سے آپ مل جائے گی۔“

کمال گاتا ہوا چڑھائی پر آ گیا۔

”لوگوں کو احساس جرم اکٹھا کرتا ہے۔ یہاں احساس معصومیت نے کہیں کانہ رکھا۔ کاش ہم نے ایک آدھ چھوٹا موٹا گناہ کر لیا ہوتا۔ اس احساس معصومیت کی رسیوں سے ہم سب ایک دوسرے سے جکڑے ہوئے ہیں۔ جس دن ہم میں سے ایک نے اس رسی کو توڑا ہم سب، ہمیشہ کے لیے تتر بتر ہو جائیں گے۔“ ہری شنکر نے کہا۔

طلعت اب ایک دوسری چٹان پر جا بیٹھی تھی اور سب کی طرف سے پشت کیے

واوی کو دیکھ رہی تھی۔ ”ایسا کبھی نہ ہوگا۔“ اس نے مڑ کر جواب دیا۔ ”ہمیشہ ہماری کلچر، ہماری بیک گراؤنڈ، ہمارا بے حد اونچا مورل کوڈ آڑے آ جائے گا۔“

”نہیں طلعت نیگم۔“ ہری شنکر نے کہا۔ ”ہماری کلچر کی ری تو پہلے ہی ٹوٹ چکی ہے۔ جس کے ایک سرے پر تم اور دوسرے پر میں ہوا میں معلق لٹک رہے ہیں۔“

”اپنے بھوتوں کو بھول جاؤ، اپنے بھوتوں کو بھول جاؤ۔“ گلشن نے کہا۔

پھر شیشے کا بڑا دروازہ کھلا۔ اس میں سے جو لوگ اندر آ رہے تھے۔ ان میں چمپا بھی تھی۔ ہلو.....

اس نے کہا اور میری طرف آئی۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ کون جگہ ہے؟ یہ چوزے کی سرائے ہے اور میں جہاز کے دفتر فون کر رہا ہوں۔ میں فی الحال بہت محفوظ ہوں۔ میرے چاروں اور شہر کی تنگی عمارتیں کھڑی ہیں۔ میرے پیروں کے نیچے ٹھوس زمین ہے مگر مجھے بے حد ڈر لگا۔ چمپا باجی میرے سامنے موجود ہیں۔ ان کے بال بھی وہی ہیں۔ سائی بھی اسی انداز سے پہنی ہے۔ وقت کا الاؤ جو چل رہا ہے اس میں وہ بڑی نکھری ہوئی نظر آ رہی ہے اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ مجھے اسے دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی کوئی رنج کوئی جھنجھلاہٹ بلکہ یہ کہ میں جلد از جلد یہاں سے چیختا ہوا بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ میں کیا کر سکتا ہوں کہ تم چمپا ہو۔ اگر تم دوبارہ دس پندرہ سال تک بھی مجھے نظر نہ آؤ تو مجھے ہرگز فکر نہ ہوگی۔ پندرہ سال قبل میں تم کو دہی کہا کرتا تھا۔ اب تم تب سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہو۔ زیادہ سمجھ دار، سنجیدہ، بردبار۔ اللہ جانے تم کیا کیا بن چکی ہو۔“ میں نے سنا تھا کہ آپ آج کل اپنی آواز اردو میں ڈب کر رہی ہیں کسی فلم کے لیے۔ شاید آل کہہ رہا تھا۔

”میں نے اخلاقاً گفتگو شروع کی۔

مجھے لگا جیسے وہ کوئی بڑا اہم بات بتانا چاہتی تھی مگر خاموش ہو گئی۔

آسمان پر بادل گھر آئے تھے اور ہلکی چھلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ ”چمپا باجی سامنے کون فلم ہو رہا ہے۔“ میں نے پھر اخلاقاً گفتگو کی سعی کی۔ لوگ جو سینماؤں میں سے باہر نکل رہے تھے۔ ان کے چہرے اداس تھے۔ بیزاری سارے ماحول پر چھانی تھی۔ روشنیاں غمگین تھیں۔ موسیقی رو رہی تھی۔ سڑک پر موٹروں اور بسوں کے چلنے کی آواز میں پڑمردگی تھی۔ وقت گھٹتا جا رہا تھا، وہ شیشے کی بڑی دیوار سے ناک چپکا کر کھڑی ہو گئی اور باہر ٹریفک کو دیکھنے لگی۔ میں جلدی سے اسے خدا حافظ کہہ کر باہر آ گیا۔

”اب میں نے اس کو بہت پیچھے کھڑا چھوڑ دیا ہے۔ میں گھر کی طرف جا رہا ہوں وہ اس ہیکراں اداسی، سناٹے کے اس پر شور بھنور میں اکیلی چپ چاپ شیشے کے درازے کے پاس کھڑی رہ گئی ہے۔ میں کیوں اس قدر تھک گیا ہوں۔ مجھے چپکا بیٹھ جانے دو۔“ کمال نے قریب ایک پتھر پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

”لکڑی جل کوئلہ بھی، کوئلہ جل بھی راکھ  
میں برہن ایسی جلی نہ کوئلہ بھی نہ راکھ“  
چندر رائے گایا۔

”چوروں کی طرح ہم نے بھی اپنے اپنے دیوتا جگائے۔ مگر دیکھو کیا ہوا۔ دیوتا صاف چوٹ دے گئے۔“ طلعت نے کہا۔

”کاکا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس

دونی نینا جن کھائیو، پیا ملن کی آس“

”سبز رنگ کا کبرہ اب سارے میں پھیل گیا ہے۔ سب اس کبرے میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ میں تاریکی کے کنارے، اجالے اور خوف کے سنگم پر پاؤں لگائے، سونے کے رنگ والے خدا پر جا پتی کی مانند از سر نو چیزوں کے نام تجویز کر رہی ہوں۔“ طلعت نے کہا۔

”دیکھو۔“ اس نے چٹان پر کھڑے ہو کر افق کی طرف اشارہ کیا۔  
”مائیکل..... ادھر تمہارا بیرو شلم ہے۔ ہم سب کا بیرو شلم ہے۔“  
”اور بیرو شلم بھی تقسیم شدہ ہے۔“ ہری شکر نے یاد دلایا۔

”اور پھاڑیوں پر داؤد کے نغمہ نواز کراہتے پھر رہے ہیں۔ لجن ختم ہو چکے۔ صلیبوں پر یسوع کے ساتھ ہمیں لٹکایا گیا ہے۔ یسوع کے بجائے ہم سولی پر چڑھتے ہیں کیونکہ ہم سب سے بڑے چور تھے۔ ہم نے خدا کے خزانوں میں سے مسرت کی چوری کرنا چاہتی تھی۔“ طلعت نے کہا۔

”دیہی شیشے کے دروازے کے پیچھے کھڑی رہ گئی ہے۔ اب مجھے کچھ یاد نہیں۔ گزرتے ہوئے برس بگولوں کی طرح میرے چاروں اور منڈلا رہے ہیں۔ سڑکوں پر بارش میں رات کی روشنیاں جھلملاتی ہیں۔ سوتے ہوئے مکانوں کی چمبیوں پر سے چاند لڑھکتا ہوا سمندر کی اور جا رہا ہے ندی کے کنارے، گل پوش سنہرے باغوں میں۔ ایسٹ اینڈ گلیا کے جنگلوں میں تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ سسنان بندرگاہوں میں سیاہ پانیوں پر رات کے پرند چکر کاٹ رہے ہیں۔

میرے سامنے سے لوگ کے ہجوم گزرتے ہیں۔ جھیل میں ڈونگیاں تیرتی



ہیں۔ میں کنارے پر ہوں۔ مجھے اب اپنے جہاز کو تلاش کرنا ہے۔ ایسا جہاز جس کی روشنیاں بجھ گئی ہوں، جو چپکے سے سمندر کی عمیق تاریکی میں داخل ہو جائے۔ ایسا جہاز جو صرف اس سمت جاتا ہو جہاں کوئی خوش آمدید کہنے والا نہ ہوگا۔“ کمال نے کہا۔

کبرہ اب بہت گہرا ہو چکا تھا۔

”جتن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کرو کہ بھور کبھی نہ ہوئے۔“

چند راگاتی ہوئی پہاڑی کے نیچے اتر گئی۔

”روپ اور نام روپ۔“ ہری تنکر نے کہا۔

”ودیا اور اودیا۔“ طلعت نے کہا۔

”کانٹ اور ویدانت۔“ مائیکل نے کہا۔

”اب ہماری سمجھ میں آ گیا ہے۔“ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

”کیونکہ جذبات اور خیالات کی سب سے اونچی چوٹی پر ہمیشہ وہی اکیلا کھڑا

رہ جاتا ہے۔ تنہا، ازل و اب دی جس کا نام گوتم ہے اور مائیکل اور ہری اور سرل، اور

کمال رضا۔ اس کی تنہائی امٹ ہے۔“

سرد تاریک ہواؤں میں ان کی آواز ڈوب گئی سبز کمرے نے ان کو اپنے اندر

ڈھانپ لیا۔

طلعت دوسرے روز صبح منہ اندھیرے ٹیوب میں بیٹھ کر چیلسی روانہ ہوئی۔ اس وقت بہت سخت سردی پڑ رہی تھی اور دھند کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ جھائی نہ دیتا تھا۔ انڈر گراؤنڈ اسٹیشن ابھی سنسان پڑے تھے۔ وہ چیلسی پہنچ کر اس مانوس سڑک پر چلنے لگی جس پر کئی سال سے چلتی آئی تھی۔ یہ راستہ بھی ختم ہوا۔ اس نے سوچا کملا کے بلاک پر پہنچ کر حسب عادت فرن کے پتوں کو چھوؤ۔ بوڑھے پورٹرنے، جس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا، اسے دیکھ کر سر ہلایا اور مسکرایا۔ برسوں سے مسٹر جنکنز اور طلعت میں یہ مکالمہ ہوتا آیا تھا: کیسا اچھا موسم ہے یا کیسا برا موسم ہے یا اچھی ہوا چل رہی ہے یا بیمار آنے والی ہے۔ مسٹر جنکنز زندگی کے اس ڈرامے کا خاموش کورس تھا۔ مسٹر جنکنز، جس کا دایاں ہاتھ برما کے محاذ پر کٹ گیا تھا، لفت کے پاس کھڑا رہ گیا۔ طلعت اوپر پہنچی۔ گیلری کے دیہز سرخ قالینوں پر سے گزر کر اس نے کملا کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ آج گویا جو کچھ ہو رہا تھا ایک اداس سے رمز کی حیثیت رکھتا تھا۔ کملا نے دروازہ کھولا۔ اس کا سامان فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ خاموشی سے، ایک لفظ کہے بغیر دونوں پیکنگ میں جٹ گئیں۔ اتنے برسوں میں کتنی گریستی جمع ہو گئی تھی۔ برتن، کتابیں، ہلبوسات۔ یہ بھی تم لے لو، یہ بھی تم لے لو۔ کملا میکانیکی انداز سے کہتی چلی گئی۔ کتابوں کو بڑے ٹرنک میں ٹھونسا گیا۔ جوتے نکال باہر پھینکے گئے۔ تصویریں دیواروں پر سے اتریں۔ سامان کے ڈھیر پر بیٹھ کر ایک اٹیچی کیس بند کرتے کرتے کملا نے یکجہت ہوا میں ہاتھ لہرا کر Ash

Wednesday پر ہنا شروع کر دی اور پھر اسی طرح چپکی ہو کر سلیپر اور ہاؤس کوٹ سمیٹنے میں مصروف ہو گئی۔ باہر ابھی دھند کا موجود تھا۔ ایک آدھ روشنی کسی فلیٹ میں جھلملا جاتی تھی۔ ”یہ گوتم صاحب بھول گئے یہاں پر۔“ طلعت نے ایک کتاب اٹھا کر اسے الٹا پلٹا اور صندوق میں اوپر سے گرا دیا۔ جس طرح تالاب میں پتھر گراتے ہیں۔ اب وہ تھک گئی۔ چائے بنائی گئی۔ سویرا ہوا۔ آدھ گھنٹے بعد کملا کینیڈا کے لیے روانہ ہو گئی۔

اب طلعت نے مال کا سامان پیک کرنے کی غرض سے واپس گھر کی طرف رخ کیا۔ صبح دس بجے مال کی بوٹ ٹرین چھٹ رہی تھی۔

۹۶

جہاز کے برآمدے میں آرکیسٹر کا رخصتی نغمہ بلند ہوا۔ مال کا دفعتاً دل بھر آیا، وہ ریلنگ پر جھکا نیچے دیکھتا رہا۔ لندن میں اسے بوٹ ٹرین پر پہنچانے کے لیے بیسیوں لوگ آئے تھے۔ آنسو پونچھے گئے تھے۔ رومال ہلائے گئے تھے۔ اوجیت اور ترونے تو چول چول بھی شروع کر دیا تھا۔ قدم قدم بڑھائے جا، خوشی کے گیت گائے جا..... گویا وہ سپاہی تھا اور ایک ایسی جنگ میں کودنے جا رہا تھا جس کا مقصد کسی کو معلوم نہ تھا۔

مگر پورٹ سمیٹھ میں وہ اکیلا تھا۔ اجنبی بندرگاہ، اجنبی مسافر، دنیا کی

اجنبیت ابھی سے اس کے لیے شروع ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کیا۔ برابر میں دو بوڑھے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے شفقت سے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ مال نے جذبہ تشکر میں ڈوب کر اسے دیکھا۔ بوڑھا سونی سونی آنکھوں سے بندرگاہ کا نظارہ کر رہا تھا۔ جہاز نے لنگر اٹھایا تو وہ اپنے کیبن میں آ گیا اور سارا دن اس نے اپنے کیبن میں گزاردیا۔ اپنے ہم سفر سے بھی بات نہ کی جو کوئی اطالوی معمار تھا۔

دوسرے روز اس نے سارے جہاز کا جائزہ لیا۔ ہندوستانی اور پاکستانی فارن سروس کے چند اعلیٰ حکام اور ان کے خاندان فوجی افسر طالب علم جو سرکاری وظیفوں پر سفر کر رہے تھے۔ چند پاکستانی، ہندوستانی اور بنگال کی لڑکیاں جو ڈاکٹری اور ایجوکیشن کی ڈگریاں لے کر لوٹ رہی تھیں۔ انگریز اور امریکن جو دولت مشترکہ اور امریکہ امداد کے پروگراموں کے تحت برصغیر کو ترقی دینے کی غرض سے جا رہے تھے۔ ٹورسٹ کلاس کا مجمع زیادہ دلچسپ تھا۔ طلباء جو اپنے خرچے پر پڑھنے آئے تھے۔ ان پرّھ سکھ اور کاروباری، مشنری، کیتھولک راہبات، ایک فرانسیسی بھکشو۔ برلن کی مسجد کے قیادیانی مبلغ اور ان کا خاندان۔ پنڈت جی، جن کو سال اندن میں بھی جانتا تھا جو چھٹی پر گھر جا رہے تھے، اور منگل سکول میں پڑھاتے تھے۔ شدھ ہندی بولتے تھے۔ بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ گھنگھریا لے لے لے بال، لڑکیوں کی ایسی خوبصورت شکل، دبے پتلے نازک سے، مہاتما گاندھی کے چیلے، بے حد ہنس مکھ اور خوش اخلاق۔ چلے کے جاڑوں میں بھی اندن میں دھوتی اور چپل پہنتے۔ برج کے علاقے کے لوگ گیتوں پر ریسرچ کر رہے تھے۔ ”ری اماں

مورے بھیا کو بھیجوری کہ ساون آیا“ خوب لہک لہک کر گاتے۔ انہوں نے چھوٹے ہی کمال سے فرداً فرداً سارے دوستوں کی خیریت پوچھی اور ماری نرملا کے دیہانت پر اظہارِ تعزیت کیا۔ مائیکل بھی، جو جبرائیل تک جا رہا تھا، ٹورسٹ کلاس میں تھا۔

شروع شروع میں فرسٹ کلاس کی لڑکیوں نے کمال کے بے حد دلچسپی سے دیکھا مگر جب اس نے کوئی پیش قدمی نہ کی تو وہ اکتا کر دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

ایک روز کمال برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا ریلنگ میں پیرا نکائے واقعتاً سمندر کی لہریں گن رہا تھا کہ پیچھے سے کسی کی آواز آئی:

”میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“

”ضرور اس نے سراٹھا کر دیکھا، وہی بوڑھا کھڑا مسکرا رہا تھا جس نے پہلے روز کمال کو خاموشی سے دلاسا دیا تھا، وہ اس اجنبی بوڑھے کی اس چھوٹی سی مہربانی کا بے حد ممنون تھا، وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا اور اس کے لیے دوسری آرام کرسی کھینچ لی۔“

”فریڈ، پال، تم لوگ بھی ادھر آ جاؤ۔“

”کھہرو، ہم بیڑ لے آئیں۔“

چند لمحوں بعد دو اور یورپین آ کر قریب بیٹھ گئے۔

”میرا نام ڈاکٹر ہینس کریمر ہے۔ میں آسٹرین ہوں۔ میں اور میرے

دونوں دوست، جو تاریخ کے پروفیسر ہیں، انڈیا جا رہے ہیں۔ تم انڈین ہو؟“

”ہاں“

”اسی لیے میں نے پہلے سے پوچھ کر اطمینان کر لیا کیونکہ کل میں نے اس سامنے والی لڑکی کو انڈین کہہ دیا تو وہ پھر گئی، وہ پاکستانی ہے۔“ تینوں کھوکھلی سی ہنسی ہنسے۔

کمال خاموش رہا۔

”تم انڈیا میں رہتے ہو۔“

”جی“

”میں بوڈا جینٹی کے لیے جا رہا ہوں۔“ ڈاکٹر کریم نے کہا۔

”اوہ؟ اوہ! بدھ جینٹی!!“

”بوڈا تاریخ کا سب سے بڑا آدمی تھا۔“ پال نے اظہار خیال کیا۔ ”تم ہندو

ہو نا؟“

”جی نہیں۔“

”اوہ، معاف کرنا، مجھ سے پھر غلطی ہوئی۔ تو کیا تم محمدؐ نہ ہو؟“

”جی۔“

”تو پھر انڈیا میں کیسے رہتے ہو؟“

”یہی اب تک خود میری سمجھ میں نہیں آیا۔“ کمال نے جواب دیا۔

”ہائی ڈوک..... ایک امریکن نے بشارت سے قریب آتے ہوئے کہا۔

”ہائی! اس نے بے تکلفی سے کمال کو مخاطب کیا۔

”ہائی!!“ کمال کہتے ہیں۔

”میرا نام نامس جیرلڈ ایمکوز ہے۔ مگر مجھے نام پکارو اور تم؟“

”مجھے مال کہتے ہیں۔“

”میں تم کو کم کہوں گا..... کیلنگ۔ کام!!؟“

”لو بیئر پیو اولڈ نام۔“ مال نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔

”باقی جرنلسٹ لوگ کہاں ہیں؟“ فریڈ نے پوچھا۔

وہ لوگ بھی آ گئے۔ ان میں سے ایک فرانسیسی تھا، مارلیس، جو ہندوستانی جا رہا

تھا۔ وہ دوسرا ایک مشہور برطانوی شاعر تھا جو بی بی سی کے نمائندے کے حیثیت

سے بدھ کی پچیس صد سالہ برسی میں شرکت کے لیے عازم ہند تھا۔ چند دولت مند

امریکن سیاح خواتین تھیں جو امریکہ سے اسی یا ترائی پر نکلی تھیں۔ ایک فرانسیسی بھکشو

مارنجی چادر میں ملبوس سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں بیٹھا رہتا، وہ بھی گیا اور

بنارس جا رہا تھا، وہ ٹورسٹ مسافر تھا۔

”میں دیکھتا ہوں کہ تم دوڑ دوڑ کر نیچے بہت جاتے ہو۔“ کھانے کے وقت نام

نے مسکرا کر دوستانہ لہجے میں مال سے کہا۔ ”کیا وہاں تمہاری گرل فرینڈ سفر کر رہی

ہے؟“

”نہیں میرا پرانا دوست ہے، مائیکل گولڈ اسٹائن کیمبرج میں میرا ہم جماعت

تھا۔ اس سے آپ ضرور ملنے گا۔“

”مائیکل گولڈ اسٹائن، یہودی ہے؟“ پال نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”اوہ۔“

خاموشی چھا گئی۔

”اور سونے پر سہاگہ یہ۔“ مال نے گلا صاف کر کے کہا، ”کہ اسرائیل جا رہا ہے۔“

شام کو مال نے مائیکل کو ان سب لوگوں سے ملوایا۔ پنڈت جی بھی اس حلقے میں شامل ہو گئے۔ اب ان سب کی اٹھک بیٹھک ساتھ رہتی۔ ایک بیگم صاحبہ نے، جو نیو پارک سے آرہی تھیں، کئی مرتبہ مال کو اپنی محفلوں میں بلایا۔ ان کی لڑکی بھی ہمراہ تھی اور یونیورسٹی آف سن سنائی سے سوشل سائنس میں ایم۔ اے کر کے آرہی تھی اور حیرت انگیز طور پر کم عقل تھی۔ بیگم صاحبہ کے گروہ میں اعلیٰ افسران اور دوسرے بڑے لوگ شریک رہتے۔ دو مسلمان لڑکیاں اور تھیں جو ہمیشہ تنگ کرتی رہتیں۔ ایک مرہٹی لڑکی گاتی بہت عمدہ تھی۔ یورپین اور امریکن لڑکیاں ہر وقت آفتابی غسل میں مصروف رہتیں مال کی شکل و صورت اور اس کی کم آمیزی سب کو بہت بھاگتی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ہر وقت بلڑ مچانے والا لڑکا ہے جو ایسا فقیر منش بنا ہوا ہے۔

دن بھر اور رات گئے تک وہ سب ادھر ادھر کرسیوں پر بیٹھے کتابوں پر تبصرہ کرتے۔ فلسفہ تاریخ کھنگالا جاتا۔ پنڈت جی کیرتن کرتے۔ لیا بھاسکر گاتی۔ رات کو رقص ہوتا۔ سینما دیکھا جاتا۔ ہر طرف زور شور میں فلرٹیشن چل رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قصے تیار ہو گئے۔ شادی شدہ بیگمات مسلمان لڑکیوں کی ایک ایک بات نظر میں رکھتیں۔ جہاز پر ایک شادی بھی تقریباً طے ہو گئی۔ ایک پٹھان انجینئر صاحب تھے ایک کراچی کی ماہر تعلیم صاحبزادی تھیں۔ دونوں گھنٹوں ڈیک پر



کھڑے ہو کر سمندر کے منظر کا مطالعہ کریں تو لامحالہ بہمن رشیدہ سلطانہ کے کانوں میں شادی کی گھنٹیاں بجنے لگیں گی۔ ایک شادی شدہ بزرگ، جو تنہا سفر کر رہے تھے، بہمن ایڈوینائرٹن ورڈسمن پر بہت مہربان ہو گئے جو کولمبو جا رہی تھیں۔ اس کا بڑا قصہ رہا۔ مال یہ سب دیکھا کرتا۔ جہاز کی اس چھوٹی سی محدود دنیا میں انسانوں کی ساری اچھائیاں، ساری کمزوریاں ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتی تھیں۔ کاش میں بھی ان عام نارمل انسانوں میں شامل ہوتا۔ وہ بعض مرتبہ جھنجھلا کر سوچتا اور پھر ڈاکٹر کریمر کے پاس جا بیٹھتا۔ اپنے ساتھی نکھڑ گئے تھے مگر یہ لوگ کتنے اچھے تھے۔ سفر بہت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔

کل صبح جہاز جبرالٹر پہنچنے والا تھا۔ مال مختلف گروہوں میں بیٹھ کر لوگوں کی باتیں سن کر، تاش کھیل کر، سوئمنگ کر کے، لائبریری میں رسالے پڑھ کر اب بری طرح اکتا چکا تھا۔ ایک انگریز لڑکی سے فلموں پر تبادلہ خیالات کرنے کے بعد وہ پھر سارے جہاز کا چکر لگاتا پھرا اور آخر سب سے اوپر کے ڈیک پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

عقب سے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، دور کشتیوں کے پاس ڈاکٹر ہینس کریمر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مائیکل ریلنگ کے سہارے کھڑا ان کو مخاطب کر رہا تھا۔ ایک امریکن پروفیسر لڑکی فرش پر دری بچھائے کہنیوں کے بل لیٹی تھی۔ کسی نے گٹار بجانا شروع کر دیا تھا۔

”لکھو۔“ مائیکل کی آواز آئی۔

”کیا لکھوں۔“ نام نے کہا۔

”جو میں کہتا ہوں اس کی غلط رپورٹ کرو کیونکہ خداوند خدا کی وعدہ کی ہوئی  
روٹی تم اسی طرح مالتے ہو۔“ مائیکل گر جا۔

”اوہ۔“ کمال نے سوچا، مائیکل اور نام میں پھر جھگڑا شروع ہوا۔  
”مصیبت یہ ہے مائیک“ نام نے کہا ”کہ تم جذباتی ہو۔ آخر ہونا اصل نسل  
ایشیائی!“

”میں جذبات کو باعث شرم یا گالی نہیں سمجھتا۔“ مائیکل نے منہ لٹکا کر جواب  
دیا۔

”آبا۔“ پنڈت جی نے زلفیں چھٹکا کر کہا۔ ”آئیے شری رجا جی۔ اپنا مائیکل  
ایک اور بھاشن دے رہا ہے۔“

”آما، پنڈت جی! اس کی کٹونا کاوش ناشک میرے پاس بھی نہیں۔“  
کمال نے ہنس کر جواب دیا۔

برطانوی شاعر غور سے دونوں کو دیکھتا رہا۔

”مصیبت یہ ہے،“ نام نے کمال سے کہا، ”جو غیر ملکی تمہارے ملک کے  
بارے میں کچھ لکھتا ہے تم اسے ای۔ایم۔فارسٹر کے پیا نے سے مانتے ہو جو بے  
چارہ خود آئیڈیلٹ تھا۔ یونوں کی دنیا میں رہنے والے دیو۔“

”فارسٹر نے اپنا ناول ۱۹۲۴ء میں لکھا تھا۔ اس وقت اس نے ڈاکٹر عزیز کو  
ہندوستان کے نمائندہ کردار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔“ برطانوی شاعر نے کہا۔

”آج اگر فارسٹر دوسرا ”میج ٹوانڈیا“ لکھے تو اسے اپنا یہ کردار بدلنا پڑے گا۔  
اب ڈاکٹر عزیز ہندوستان کا نمائندہ نہیں رہا۔ اب ہر مسلمان الاحوال پاکستانی ہے۔“

اب ہندوستان کا صحیح نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔“

”ہاں۔“ مال نے جواب دیا۔

”مال تم نے بہت دکھا اٹھائے ہیں؟“ شاعر نے پوچھا۔

”ہاں۔ مگر مظلوم کے روپے میں نظر نہیں آتا چاہتا۔ ہندوستان کی ازلی اور ابدی، دکھنے والی روح۔! یہ تھل، یہ گریس، یہ دکھا اٹھانے اور برداشت کرنے کی عادت، تم موسیو پال بال کی طرح دھوتی پہن کر چوکے میں بیٹھ جاؤ تب بھی نہیں سمجھ سکتے۔“

”سینٹ آگسٹائن تو بنارس میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔“ ماریس نے پوچھا۔

”کیتھولک نظریہ حیات ایک مخصوص Cult تھا۔ ساری زندگی کو اس نے اپنے اندر نہیں سمیٹا ورنہ تم آج کیتھولک ہونے کے باوجود انڈیا چائنا لڑنے کے لیے نہ جا رہے ہوتے۔“ مال نے چڑ کر جواب دیا۔

”آبزرو اور combatant میں کیا فرق ہے؟“ ماریس نے پوچھا۔

”یہ تم اپنے آپ سے پوچھو۔ دوسرے جنگ کریں تم ابزرو کرتے رہو، اس سے کیا احساس جرم کم ہو جاتا ہے؟“ مال نے کہا۔

”تم تو مجھے کونکرز کی طرح پروفیشنل امن پرست معلوم ہوتے ہو۔“ نام نے کہا۔

”بھور بھئے گین کے پاتھ مدھوبن موہی پٹھایو۔“ ڈیک کے سرے پر لیا! بھاسکر نے گانا شروع کیا۔ مال نام کی بات کو نظر انداز کر کے گانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پنڈت جی نے تال دینا شروع کی۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں لیا! بھاسکر کی

طرف چلے گئے۔

ہر کلچر کی ایک خفیہ زبان ہے جسے صرف وہی کلچر سمجھ سکتی ہے۔ برطانوی شاعر نے کہا۔

”مزید! سپننگارا!“ نام نے کہا۔ ”پنڈٹ اور کم کی کلچر ایک کہاں ہے؟“

”تم تو خیر مائیکل کی بھی خفیہ زبان سمجھنے سے قاصر ہو۔“ برطانوی شاعر نے

مسکرا کر کہا۔ ”اسرار تمہاری سمجھ سے بالاتر ہیں نامس جے اٹیکنر!!“

مائیکل ڈرائی مارٹینی کے اثر میں مبتلا ایک کونے میں چپکا بیٹھا تھا۔ اپنا نام سن کر وہ چونکا۔ میکا کی انداز سے اس نے پٹ کر وہیں سے بات شروع کر دی جہاں سے اس کا سلسلہ تقریر منقطع ہوا تھا۔

”لکھو..... مائیکل پھر گر جا“ دنیا کی اقوام کی تاریخ فتوحات اور سلطنتوں کے قیام اور ملکوں کی آباد کاری سے عبارت ہے۔ میرے ہاں تاریخ کا تسلسل شدید ترین مظالم اور تکلیفوں کی داستان کی طویل کڑی ہے۔ تیرھویں صدی میں مجھے انگلستان سے نکالا گیا۔ چودھویں میں فرانس سے پندرھویں میں اسپین کا قہر شروع ہوا۔ سارا زمانہ میں نے یورپ کے شہروں میں اچھوتوں کی طرح زندہ رہ کر گزرا مگر میں خانہ بدوش، دنیا کی لعنت کا شکار، مشرق اور مغرب دونوں جگہ میں نے آنسوؤں کے چراغ جلا کر علم کی روشنی پھیلائی۔ میں نے بوعلی سینا اور ابن خلدون اور امام غزالی اور الفارابی اور خوارزمی کے نظریوں کو یورپ میں رائج کیا۔ میں نے.....

”تھہرو..... تم بھولتے ہو کہ..... نام نے بخشا شروع کیا۔“

لیا! بھاسکرگاتی رہی مال نچلے ڈیک پر اتر آیا جہاں برآمدے میں موسیقی بج رہی تھی۔ نگہات خوبصورت ساریاں اور شلواریں پہنے ایک حلقے میں بیٹھی تھیں ایک میز پر برج ہو رہا تھا۔

دوسری طرف سینما دکھایا جا رہا تھا۔ مال ایک کھمبے سے لگ کر اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ سامنے اسکرین کے پیچھے عمیق بکراں اندھیرا تھا۔ اسکرین پر ایک غنڈہ صفت لوغروں کی سی شکل والا مشرقی برلین کا کمیونسٹ جاسوس امریکن ہیروئن کو اڑالے جانے کی فکر میں دبے پاؤں ایک گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے، پھر ہیروئن موزہ اتار کر چھت پر چڑھ گئی۔ دوسری طرف سے ہیرو، جو شاید رابرٹ ٹیلر تھا، کود کر سامنے آیا اور کمیونسٹ ولین کو چاروں شانے چت گرا کر ہیروئن کو بچانے کے لیے لپکا۔

”آئیے، آئیے، بیٹھے مال صاحب۔“ مس خان نے کرسی کھینچتے ہوئے کہا۔  
”جی نہیں، اب میں چل دوں۔ میں یہ فلم پہلے دیکھ چکا ہوں دراصل۔“

لڑکیوں کو کھس پس کرتا چھوڑ کر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جہاں کراچی اور کلکتے کے چند ملک التجار پلیس پگال کا تذکرہ کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کی بیویاں اس وقت باہر سینما دیکھنے میں مچھلیں۔ ان کے قریب سے گزرتا ہوا وہ ایک درتپے میں جا کھڑا ہوا۔

کیوں جی، اب کے سے مری ڈیز خرید کر خشکی کے راستے واپس آیا جائے کراچی۔ کیا خیال ہے؟ وہ فورڈ کونسل تو میں نے اپنے بھائی کو دے دی۔ درتپے کے نیچے برآمدے میں باتین ہو رہی تھیں۔ ”اچھا جی میں اپریل میں یو۔ این۔

سیشن کے لیے نیویارک جا رہی ہوں۔ مجھے اپنی بھابھی کا پتا ضرور دے دیجئے گا۔

شیو تو اب میں ۵۶ء کا موڈل بنی لاؤں گی۔“

”کیا کیا جائے، پاؤں نہیں ملتے۔“

”میری بڑی لڑکی نے لاہور سے ایم۔ اے کر لیا ہے کہیں اس کی شادی

کرائیے۔“

”کیسا لڑکا چاہیے۔“

”کم از کم سی ایس پی تو ہو۔“

”کہیں کام کر رہی ہے بچی۔“

”جی ہاں۔ کنڈرگارٹن اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ویسے اس کو تو امریکہ کا اسکالر

شپ بھی مل گیا ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ شادی.....“

”ہاں جی۔ یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ یہ بیگ روم سے لیا؟“

”جی..... آپ..... اب کے امریکہ سے بہت جغادری فریجڈیر

لے آئیں۔“

”جی کیا بتاؤں..... ضروریات زندگی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں۔“

”یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔“

کمال درتچے سے ہٹ آیا۔ میٹریاں اتر کر ٹورسٹ کلاس کا چکر لگانے میں

مصروف ہو گیا۔ ڈیک پر سردار صاحبان دری بچھائے بیہر گانے میں محو تھے۔

دوسری طرف رقص ہو رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں تاش کھیلے جا رہے تھے۔ کمال

مائیکل کے کیمین کے سامنے سے گزرا اور اسے یکنخت خیال آیا کہ کل صبح مائیکل

جبرائیل پر اتر جائے گا اور اس کے عین بعد ممکن ہے کہ ساری عمر، مرتے دم تک اس سے دوبارہ ملاقات نہ ہو۔ کیسی عجیب بات تھی۔ سردار صاحبان کے گانے کی آواز مدھم پڑ گئی۔ وہ مائیکل کے کیبن کے باہر ریلنگ پر جھکا کھڑا رہا۔ سامنے پورنماشیا کا چاندانی پر طلوع ہو رہا تھا۔ سمندر بے حد پرسکون تھے۔ جہاز لہروں کو چیرتا ہوا وقار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ڈیک کے اس حصے میں مکمل تنہائی تھی۔ صرف فرانسیسی بھکشو ایک سرے پر مال کی طرف سے پشت کیے بیٹھا تھا۔

کمال کا دل دھڑکتا رہا۔ سناٹا اتنے زور سے گر جاساے محسوس ہوا کہ اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ اسے نام اور برطانوی شاعر کی باتیں یاد آئیں۔ اس کا جی بیٹھنے سا لگا، وہ ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”میں اسٹیٹ لیس ہوں، میں اسٹیٹ لیس ہوں۔“ اس نے پہلی مرتبہ اپنے آپ سے کہا۔ سمندر کی لہروں کے سفید جھاگ چاندنی میں چمکتے رہے۔ دور دور دنیا کے چاروں کھونٹ چاندنی کی اس وسیع نیلگوں چادر پر مسافروں سے بھرے ہوئے جہاز چل رہے تھے۔ کانسٹی ٹیوشن اور کونین الزبتھ۔ امراء کے یاٹ۔ تجارتی اور جنگی بیڑے۔ ان کشتیوں سے موسیقی کے سر بلند ہو رہے تھے۔ دور دراز کے ملکوں کے انسان ان کشتیوں میں سوار تھے۔ یورپ اور انگلستان کے عالم۔ اٹلی کے راہب۔ امریکن سیاح میکسیکو کے نقاش۔ ہندوستان کے رقاص۔ دنیا میں فی الحال امن قائم تھا۔ ولی میں پنڈت نہرو حکومت کرتے تھے۔ زندگی میں بظاہر بڑی گہما گہمی تھی۔

”خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں دل کا چین نصیب ہے بھائی۔ مجھے شامتی

چاہیے۔“ کمال نے آہستہ سے کہا۔

فرانسیسی بھکشو نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کامل سکون تھا اور لازوال مسرت ایسی ہی پورنماش کی رات، ڈھائی ہزار سال ادھر، اس سمندر کے اس پار ایک ملک میں شاکیہ منی پیدا ہوئے تھے۔ چودھویں کا چاند سمندر کی لہروں پر ادھر ادھر تیرا کیا۔ اس کی تیز اور ٹھنڈی کرنیں کمال کے اور بھکشو کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔

”مجھے میرے خیال سے نجات دلاؤ۔“ کمال نے کہا۔

بھکشو اپنی پراسرار نیلی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ ”خیال۔ خیال خود کو نہیں جان سکتا۔ خیال اپنے آپ سے باہر نہیں جاسکتا۔ کائنات سے باہر کوئی خدا نہیں ہے۔ اور خدا سے باہر کوئی کائنات نہیں۔ حق و باطل میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان سب سے بالاتر ذات مطلق ہے جو سنا ہے۔“ اس نے فرانسیسی میں کہا۔

”مجھے اس سنائے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔“ کمال نے کہا۔

”شو نیا..... سنا..... شو نینا..... سونا جو ذات مطلق ہے، جو صفر کا تصور ہے۔“

”مجھے اس تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔“ اس سنائے میں میں اکیلا کدھر جاؤں گا۔ تم بھی میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس نے مہایان مذہب کے اس فرانسیسی بھکشو کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا جو سوربون یونیورسٹی کا ڈاکٹر آف فلاسفی تھا۔

”میں اسٹیٹ لیس ہوں اور یہ تمہاری سکھوتی نہیں ہے۔“ اس نے دل میں کہا



اور بھاری بھاری قدم رکھتا اپنے ڈیک پر واپس آ گیا۔ رات گزر گئی۔  
جہاز اپنا سفر طے کرتا رہا۔ منزلیں گویا قریب تر آتی گئیں۔

۹۷

ہندوستان کا ساحل! بمبئی!!! گھر؟؟؟

سمال لکھنؤ پہنچا۔ گلشن شاہ کے پھانک میں داخل ہوا۔ اسے دنیا بدلتی ہوئی نظر  
آئی۔ باغ کے درخت جل چکے تھے۔ پودے سوکھ گئے تھے۔ گھاس کی جگہ جھاڑ  
جھکاڑ اگا ہوا تھا۔ موٹر خانہ اور اسٹبل گودام بنے ہوئے تھے۔ (جتنے عزیز پاکستان  
ہجرت کر کے جاتے ہیں اپنا اپنا سامان لا کر یہاں ڈمپ کر دیتے ہیں، خالد بیگم  
نے کہا) شاگرد پیشہ سنسان پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں نے انگادین کو ڈھونڈا۔ قدیر  
اور قمرن کی تلاش کی۔ حسینی کی بی بی اور رام اوتا را اور چھٹی کو آوازیں دی۔

آخر وہ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر گیا اور چپکے چپکے رونے لگا۔ دنیا وہی  
تھی۔ گلشن شاہ، لکھنؤ، عزیز رشتے دار۔ سب کچھ وہی تھا۔ کیا صرف وہ خود بدل گیا  
تھا؟ کیا وہ اپنے باپ کی تنگ دستی دیکھ کر جذباتی طور پر مضطرب تھا؟ وہ جس کی  
ساری عمر زمینداروں کے خلاف نعرے لگاتے گزری تھی۔ زمینداری کے خاتمے  
کی صوبہ سے اب اتنا بڑا زوال آیا تھا کہ گلشن شاہ والوں کے یہاں دو وقت کی روٹی  
بھی مشکل سے چلتی تھی۔ (بہت انقلاب انقلاب کرتے تھے۔ لو بوڑھے باپ کو

ایکے پر بیٹھا دیکھ کر اب تو خوش ہو لو، نواب صاحب بہادر نے کہا (بڑی بڑی ریاستیں تباہ ہو گئیں تم ہم کسی گنتی میں ہیں، شام کو اپنی نے اس سے کہا جو اس سے ملنے کی خاطر جھانسی سے آئی ہوئی تھیں۔ مانپارہ کی کراکری بک رہی ہے۔ راجہ سورج سنگھ کے پاس ایک دھیلہ نہیں رہا۔ امی نے اپنے آدھے زیور بیچ ڈالے۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“ کمال نے اپنے بابا سے پوچھا۔ ”کر بلا ہجرت کیجئے گا پاکستان؟“

”یہیں رہوں گا۔“ انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”کوئی ہم بھگوڑے ہیں۔“

کمال ہکا بکارہ گیا۔ ”مگر بابا آپ تو بڑی دھوم دھام سے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔“

”ہاں ہاں تو پھر؟“ پاکستان بن گیا، ٹھیک ہوا۔ اب اس کا یہ مطلب چھوڑا ہی ہے کہ ہم بھی بھاگ جائیں جہاں سے۔

”آپ پاکستان کو اپنا جائز وطن سمجھنے کے باوجود ہجرت نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ سوچتے ہیں کہ اس بڑھاپے میں کہاں در بدر مارے پھریں گے یا اس لے کہ ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں اور اس سے محبت کی بناء پر اسے نہس چھوڑ سکتے۔“ کمال آج قطعی طور پر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے باپ اور اس کے باپ کی نسل کے لوگوں کی نفسیات آخر کیا تھی۔ ان کے آئیڈیلز، ان کی منطق، ان کی بہادی یا بزدلی۔

”اب تم سے جرح کون کرے۔ تمہاری کھوپڑی ہمیشہ کی انی ہے۔“ نواب

صاحب نے جواب دیا اور گھڑی دیکھی۔ ان کو آج عدالت سے جا کر معاوضے کی قسط کے دوسروے پے لانے تھے جن سے مہینے کا خرچ چلتا تھا۔

”اب میں عامر بھیا کی دہن کے در پر تو جا کر پڑنے سے رہی کراچی میں۔ یہاں کم از کم اپنا گھر تو نہیں چھنا ہے۔ اگر چلے گئے تو یہ بھی گیا اور معاوضہ بھی ختم، وہاں کون کلیم ولیم کرتا پھرے گا۔ ویسے میرا دل نہیں لگتا اب یہاں۔“ امی بیگم نے کہا۔

”مگر یہ تو آپ کا گھر ہے، آپ کا شہر، آپ کا وطن، جہنم جہنم کا دیس۔“  
”مسلمان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ سارا جہاں وطن ہے۔“ چھوٹے پھوپھانے کہا جو حال ہی میں ہجرت کر کے کراچی گئے تھے اور ان دنوں سامان کا تیاپا نچہ کرنے آئے ہوئے تھے۔

کمال نے مزی تبادلہ خیالات اس موضوع پر لا حاصل سمجھا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔

چند روز بعد اس نے کمز کس کر ملازمت کی تلاش شروع کی۔ اس کے پاس ان گنت ڈگریاں تھیں۔ ٹرنٹی کالج، کیمبرج۔ امپریل کالج آف سائنس، لندن اور کئی سال اس نے انگلستان کی ایک مشہور لیبارٹری میں نوکری کی تھی۔ برطانیہ کی ملازمت چھوڑ کر وہ وطن کی خدمت کے جذبے سے واپس آیا تھا۔ یونیورسٹی میں جس جگہ کے لیے وہ کوشاں تھا وہ ایک معمولی ایم۔ ایس سی کو دے دی گئی چونکہ وہ ہندو تھا۔

چھ مہینے گزر گئے، وہ دلی کے چکر لگا کر دیوانہ ہو گیا۔

”میاں کسی سے سفارش کروالو۔“ نواب صاحب نے کہا۔

”سفارش تو میں قیامت تک نہیں کرواؤں گا۔ کیا مجھے اپنی اہلیت پر بھروسہ نہیں جو سفارشیں کرواتا پھروں۔“

”یہی تو تمہارے دماغ میں خناس ہے۔“

اب وہ سارا سارا دن گلکشاں میں چپ چاپ پڑا رہتا یا طلعت کو خط لکھتا: انڈیا ہرگز مت آنا۔ جہاں تک ہو سکے وہیں رہے جاؤ۔ یہاں آؤ گی تو وہی حشر ہو گیا جو میرا ہو رہا ہے۔

تم کو کیا ہو گیا ہے۔ طلعت جواب دیتی۔ ”اتنے ڈی مورا لڑاؤ کیوں ہو گئے۔ جدوجہد کی ہمت ہار بیٹھے۔ یہی تو وقت ہے آزمائش کا۔ ڈٹے رہو، مزدوری کرو، بل چلاؤ۔ آخر انقلاب کا سامان کرنا اسی کو تو کہتے ہیں۔ مگر کیا تم عیش کے خواب دیکھ رہے ہو؟“

کیا لڑکیوں میں ہمت زیادہ ہوتی ہے؟ وہ سوچتا یا وہ آئیڈیلسٹ پرلے درجے کی ہوتی ہیں۔ بہر حال طلعت کے خطوط سے اس کو بڑا سہارا مل جاتا۔

گوتم نے اسے متواتر نیویارک سے خط لکھے۔ اس نے کسی کا جواب نہ دیا، وہ لکھتا کیا آخر؟ ہری شنکر امریکہ سے لوٹ چکا تھا۔ اور بنگلور میں تعینات تھا۔ سال نے اسے بھی کوئی خط نہ لکھا۔

بھیا صاحب نے کراچی سے ڈاک بٹھادی: فوراً یہاں آ جاؤ۔ ایک سے ایک بڑھیا عہدے یہاں موجود ہیں۔ بس تمہارے آنے کی کسر ہے۔ ضد چھوڑ دو۔ وہ دوبارہ تبدیل ہو کر برازیل کے سفارت خانے جانے والے تھے اور برابر لکھا

کرتے: آ جاؤ..... آ جاؤ..... آ جاؤ.....

نوبت یہ آئی کہ اب کمال نے ان کے خط کھولنے بھی چھوڑ دیے۔ چند روز بعد اسے بارہ بنکی کے کالج میں لیکچرر شپ مل گئی مگر چونکہ بھیا صاحب پاکستانی تھے اور ”گلنشاس“ اور موروثی جائیداد میں ان کا بھی حصہ تھا لہذا کسٹوڈین کا قبضہ شروع ہو گیا۔ نواب صاحب نے عدالت میں کسٹوڈین کے فیصلے کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اب دن بھر کمال اس چکر میں مارا مارا پھرتا۔ اس کے لہجے میں اب تلخی آ گئی تھی۔ وہ بہت کم ہنستا تھا۔ او دھم مچانا وہ کب کا بھول چکا تھا۔

”پورٹوالا انتہائی تھے حضرت۔ جب اصلیت کا سامنا کرنا پڑا تو بیٹا چپیں بول گئے۔“ کافی ہاؤس میں کامریڈز نے کہا۔

حسینی اور ان کی بی بی بی بھیا صاحب کی دلہن کے ساتھ کراچی جا چکے تھے۔ قدیر اور قمرن مدتی گزریں، موٹر بکنے کے بعد، مرزا پور واپس چل گئے۔

ایک روز وہ حسب معمول دلی میں اج کے یہاں جمناروڈ پر ٹھہرا تھا اور ایک درخواست لکھ کر میڈنز ہوٹل کے ڈاک خانے میں پوسٹ کرنے کے لیے جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ٹامس ائیکنزل گیا جو جہاز پر اس کا ہم سفر رہ چکا تھا۔

”ہلو۔ تم، یہاں کہاں؟“ کمال نے پوچھا۔

”میں سارے ملک کا چکر لگاتا پھر رہا ہوں۔ جنوب، بنگال اور آسام اور

اڑیسہ۔ اب راجستھان کا قصد ہے۔“

”تم نے دلی کی سیر کرنی؟“

”ابھی نہیں۔“

”تم نے ہمارا راشٹر پتی بھون دیکھا۔“ کمال نے فخر سے کہا۔ ”اور براڈ کاسٹنگ ہاؤس اور نئی دلی کی عمارات جو نئے ہندوستان کی سبیل ہیں اور پونا انسٹیٹیوٹ اور راج گھاٹ اور..... اور.....“ وہ دفعتاً پرانا کمال بن گیا۔ فکر معاش سے آزاد۔ ہندوستان کا جوشیا فرزند۔ وہ دلی کی ایک ایک چیز نام کو دکھاتا پھرا۔ شام کو اس نے سپرد ہال میں کونسرت سنانے کا پروگرام بنایا۔

”آج کل تم کیا کر رہے ہو؟“ اپس میں بیٹھ کر قہوہ پیتے ہوئے نام نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ نوکری ڈھونڈ رہا ہوں۔“ اس نے بے فکری سے جواب دیا۔

”بے روزگاری بڑا زبردست پرالیم ہے۔“ نام نے کہا۔

”سب کے لیے ہے۔ اس میں میری کیا تخصیص ہے۔ جب خوشحالی آئے گی تو سارے ملک کے لئے آئے گی۔ یہ تھوڑا ہی دیکھتی پھرے گی کہ یہ ہندو کا دوار ہے یہ مسلمان کا۔ ہم سب اکٹھے ڈوبیں گے اکٹھے ابھریں گے۔“

”لیکن تم نواب زادے ہو۔ تم مزدوری نہیں کرو گے۔“ گلشن نے کہا جسے انہوں نے براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے ساتھ لے لیا تھا۔ تم اپنے آپ کو ڈی کلاس نہیں کر سکتے۔

”بالکل غلط ہے۔“

”اچھا تو آؤ میرے ساتھ چلاؤ ٹریکٹر۔“

”اگر میں نے ٹریکٹر چلانے کی ٹریننگ لی ہوتی تو ضرور چلاتا مگر افسوس کہ میں آٹھ سال نیوکلر فزکس میں برباد کر کے آیا ہوں۔“

”سنا ہے پاکستان میں بڑا قحط الرجال ہے، وہاں جاؤ۔ یہاں کیوں جھک مار رہے ہو۔“ گلشن نے رائے دی۔

”تم بھی یہی کہتے ہو؟“

”بالکل“

رات کی ٹرین سے وہ لکھنؤ لوٹ رہا تھا۔ اسٹیشن پر اسے ہمراز بھائی ملے، وہ بھی لندن سے کراچی آ چکے تھے اور اب اپنی والدہ سے ملنے فیض آباد جا رہے تھے۔

”کہو مال میاں کیا حال ہے؟ انہوں نے پوچھا۔

”بہت اچھا حال ہے ہمراز بھائی۔

”اچھا تو نہیں دکھتا مجھے۔ کیا قصہ ہے۔ ایس؟

”کچھ بھی تو نہیں ہمراز بھائی۔“ اس نے جلدی سے ان کو آداب کیا اور آگے

بڑھ گیا۔

آخر وہ دن بھی آن پہنچا جب کمال نے وہی جا کرویرا کی درخواست دی۔

اس فیصلے پر پہنچنے سے پہلے اس نے کئی راتیں جاگ کر گزاری تھیں، وہ دنیا کی

نظروں سے پتتا پھرا تھا۔ بھائیں بھائیں کرتی گلکشاں میں صرف سائے ڈالتے

نظر آتے۔ دروازے بند ہوتے۔ ہوا سے خالی کمروں کے پردے پھٹھکتے۔

اندر کی خواب گاہ سے بوڑھے نواب صاحب کے کھانسنے کی آواز آتی۔ امی بیگم

پچھلے دروازے میں تخت پر بیٹھ وٹلنے پر وٹلنے کئے جاتیں۔ ہزاروں غمتیں انہوں

نے مان ڈالیں۔ جناب عباس کی درگاہ پر نذرانے چڑھائے۔ سبطین آباد کے امام

بار میں جا کر جمعرات کی جمعرات جناب علی اکبر کے نام کی مجلسیں کروائیں کہ یا  
 مولا کمین بھیا کام پر لگ جائیں، یا مولا کمین بھیا کی مدد کر۔ (بارہ بنکی کی لیکچرر  
 شپ ختم ہو چکی تھی)۔ وہ متواتر اپنے آپ سے مکالمہ کہتی ہے۔ گھاس کھودو، مل  
 چلاؤ۔ اعنت ہو تم پر۔ موقع پرست، بے ایمان، ڈھٹیل یقین کہیں کے۔ اب جامعہ  
 ملیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی دو جگہ کا آسرا رہ گیا تھا مگر فی الحال وہاں بھی اس کے لائق  
 کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ اس نے بہر حال طے کر رکھا تھا کہ بھوکا مر جائے گا مگر ترک  
 وطن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب ایک روز عدالت نے فیصلہ سنا دیا۔ گلکشاں مال کے بڑے ابا یعنی  
 بڑے نواب صاحب مرحوم کے نام سے رجسٹرڈ تھی۔ عامر رضا ان کا اکلوتا وارث  
 پاکستانی تھا۔ گلکشاں متروکہ جائیداد قرار دے دی گئی۔ دوسرے روز صبح جب مال  
 کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو لکھنؤ میں پایا۔ تیسرے دن پولیس کے افسر کوٹھی میں  
 تالے ڈالنے کے لیے آگئے۔ چوتھے روز کمال رضا نے ویزا بنوایا اور اپنے بوڑھے  
 والدین کو لے کر ٹرین میں بیٹھا۔ پانچویں دن ٹرین دلی پہنچی۔ چھٹے دن ٹرین نے  
 بارڈر کراس کیا۔ ساتویں روز کمال رضا کراچی میں تھا۔  
 ساتویں روز یوم سبت تھا اور انسان اپنا خون پی رہا تھا



”کراچی۔ مملکت خداداد پاکستان، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت اور دنیا کے پانچویں بڑے ملک کا دارالحکومت۔ جہاں کے سلعز اور پناہ گزینوں کے جھونپڑے عجائبات عالم میں شمار کیے جاتے ہیں۔ خصوصاً وہ غلیظ ترین بھیانک ”جنگلیاں“ جو قائد اعظم کے آس پاس پھیلی ہیں۔ اس شہر میں سفید فام غیر مکملیوں بالخصوص امریکنوں کی بہت بڑی نو آبادی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں بے انتہا خوبصورت کوٹھیاں بنی ہیں جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان متوسط طبقے نے اپنی ساری تاریخ میں آج تک اس قدر زبردست خوشحالی حاصل نہیں کی تھی۔ یہاں نئے دولت مند متوسط طبقے کی حکومت ہے۔ ان کا نیا سماج۔ ان کے نئے اصول۔ کراچی بے حد موڈرن شہر ہے یہاں روز رات کو اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں اور کلبوں میں ایک جگمگاتی کائنات آباد ہوتی ہے۔ ماہرین عمرانیات کے لیے یہ مسئلہ انتہائی دلچسپی کا باعث ہونا چاہیے کہ پچھلے نو سال میں کس طرح ایک نئے معاشرے نے اس ملک میں جنم لیا ہے۔ اس معاشرے کی بنیاد روپیہ ہے اور روپیہ بناؤ اور دولت حاصل کرو۔ آج بہتی گنگا میں ڈبکیاں لگا لو، کل جانے گنگا خشک ہو جائے یا اپنا رخ بدل لے۔ تیسرا عنصر شدید ترین فرسٹریشن کا احساس ہے۔ بلیک مارکیٹنے کو فرسٹریشن ہے کہ مزید بلیک مارکیٹ کیوں نہیں کر سکتا۔ بائیں بازو کا اٹھکچول روتا ہے کہ اب انقلاب کی کوئی امید نہیں۔ جماعت اسلامی والا چلا رہا ہے کہ مسلمان عورتیں بے پردہ گھوم رہی ہیں اور بال روم میں ناچتی ہیں۔ متوسط طبقے والے کی جان کو ہزاروں فکریں کھا رہی ہیں۔ سفارشوں کے بغیر نہ ملازمت ملتی ہے نہ بچوں کا اسکول اور کالج میں داخلہ ہو سکتا ہے نہ عہدوں میں ترقی ہوتی

ہے۔ اوپر سے بنگالی اور پنجابی مہاجر اور مقامی آبادی کی کش مکش اعصاب پر سوار ہے۔ یہ کش مکش اتنی ہی شدید ہے جتنی غیر منقسم ہندوستان میں ہندو مسلمان کی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں آخر امید اب فوجی انقلاب میں باقی ہے۔“

ایک جماعت مہاجرین کی کہلاتی ہے۔ یہ پاکستان کی عجیب ترین مخلوق ہے اور ہندوستان سے آئی ہے اور ملک کے ہر شہر، قصبے اور قریے میں پائی جاتی ہے۔ کراچی میں اس کا ہیڈ کوارٹرز ہے۔ اس جماعت کا خاص ریکٹ کلچر ہے۔

تقسیم کے بعد معلوم ہوا کہ اب ہندو کہتا ہے کہ جب تمہارے کلچر اور تمہارے نظریے علیحدہ ہیں تو جاؤ پاکستان۔ اب ہمارے سر پر کیڑے سوار ہو؟ چنانچہ یہ قوم ”مہاجر“ بن کر پاکستان آئی۔ یہاں انکشاف ہوا کہ ہندو سے تو چھٹکارا ملا مگر ایک مصیبت کا سامنا درپیش تھا۔ لاہور میں پنجابی تھا، ڈھاکے میں بنگالی۔ دونوں جگہ مہاجرین کو بڑا فرسٹریشن ہوا۔ لہذا ہر مہاجر نے ابد اکر کراچی کا رخ کیا۔ اب کراچی گویا مہاجرین کا گڑھ ہے۔ بڑی تعجب خیز چیز یہ ہے کہ اتر پردیش کی اس آبادی نے کس خوش اسلوبی سے اپنے آپ کو ٹرانس پلانٹ کر لیا۔ اب یہاں جگہ جگہ ان کی ”کولونیاں“ قائم ہیں۔ یہاں آگرے والے رہتے ہیں۔ ادھر رپوریوں کا جتھا ہے، وہ حیدر آباد دکن کے جانبازوں کا محلہ ہے۔ اس طرف گڑھ والے، لکھنؤ والے، دلی والے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے چھوٹے چھوٹے مکان قرضہ لے کر بنائے گئے ہیں۔ زیادہ تر ناظم آباد کا علاقہ ہے۔ لارنس روڈ، الہی بخش کالونی، جہانگیر روڈ، مارشن روڈ کے سرکاری کوارٹروں میں ایک پوری دنیا آباد ہے۔ یہ خالص، ٹھوس، مسلمان متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی دنیا ہے اور مہاجرین

کی سماجی زندگی کی گویا ریڑھ کی ہڈی۔ ان کی لڑکیاں برقعے پہن کر بسوں میں بیٹھ کر اسکول اور کالج اور یونیورسٹی جاتی ہیں، بندر روڈ پر خریداری کرتی ہیں، ریڈیو پر عورتوں کے پروگرام میں حصہ لیتی ہیں، ویمنز نیشنل گارڈ میں پریڈ کرتی ہیں۔ یہ طبقہ اب کراچی میں اس طرح رہتا ہے گویا صدیوں سے یہیں رہتا آیا ہے۔ یہ لوگ جنگ اور انجام اور ڈان پڑھتے ہیں کشمیر حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ سال میں ای مرتبہ ویزا بنوا کر خاندان کے بچے کچے افراد سے ملنے ہندوستان جاتے رہتے ہیں جس کو اب تک یہ ”گھر“ کہتے ہیں۔ یعنی گھر دراصل سندیلہ یا مراد آباد ہے، ملک پاکستان ہے۔

انسانیت کا وہ حصہ، جو برصغیر ہندو پاکستان کی مسلمان قوم کہلاتا ہے، اس کی نفسیات سمجھنا کوئی آسان بات نہیں!

دوسرا طبقہ اعلیٰ طبقہ کہلاتا ہے پچھلے نو سال میں بے حد مستحکم ہو چکا ہے۔ اور محتاج تعارف نہیں۔ اس طبقے کی زندگی اس قدر الف لیلاوی ہے کہ اب ”قصہ سوتے جاگتے کا“ اس کے مقابلے میں بالکل ہیچ سمجھو..... یعنی کل جو صاحب بالکل گمنام اور ہاشما قسم کے آدمی تھے آج وہ مرکزی وزیر ہیں یا کروڑ پتی یا بہت مشہور ایڈر۔ پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ نہایت ادق بین الاقوامی سیاسی مسائل پر اس فرائلے سے اخباروں میں بیان دیتے ہیں کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ انتہائی معمولی قابلیت کے حضرات اقوام متحدہ اور دوسرے بڑے بڑے عالمگیر اداروں میں ملک کی نمائندگی فرماتے ہیں اور ہاؤلرز کرتے ہیں مگر کوئی برا نہیں مانتا۔

ان گنت خواتین و حضرات اندھوں میں کانے رجبہ بنے بیٹھے ہیں۔

اور خواتین! پاکستان کی بیگمات بھی دنیا کی عجائبات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی ساریاں، ان کے زیورات، ان کے ڈنر اور پارٹیاں، بیرونی ممالک میں ان کے سفر۔ ان کی زندگی کا عکاس اور گویا ان کا اوپنشل آرگن ماہنامہ مرر ہے جس میں ان کی دعوتوں کی تصویریں چھپتی ہیں۔ تب اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان دراصل کس قدر ترقی یافتہ اور دولت مند ملک ہے جس کی آدمی آبادی صرف ڈنر اور ایٹ ہوم کھاتی ہے اور سمباناچی ہے۔

ہندوستان پوری کوشش کر کے یہ ثابت کرنے میں مصروف ہے کہ تقسیم غلط تھی اور ملک دراصل ایک ہے اور اس کی تہذیب ناقابل تقسیم۔ پاکستان یہ ثابت کرتا ہے تقسیم بالکل جائز اور صحیح تھی اور یہاں کی کلچر بے حد مختلف ہے اور اسی علیحدہ قومیت کی بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا گیا ہے۔

ادھر ہندوستان کہاتا ہے کہ سارے مشرق کی تہذیب کا منبع اس کا کلچر ہے۔ ادھر گپتا پیریڈ پر روشنی ڈالی جاتی ہے ادھر خلافت راشدہ اور عباسیوں اور مغلوں کے زمانے کے راگ الاپے جاتے ہیں۔ ان دونوں ممالک کا پریوینگنڈہ غرضیکہ بڑے زوروں میں چالو ہے۔ اور اس چاند ماری کا نشانہ مغربی ممالک۔

ایک اور عجیب و غریب چیز یہ ہے کہ ملک کے حالات سے لوگ حد سے زیادہ نالاں ہیں۔ اقتصادی مشکلات، گرانی، رشوت ستانی، اقرباء پروری، بے ایمانی، چار سو بیسی، سیاسی غنڈہ گردی وغیرہ وغیرہ کا ذکر روانہ بلا نامہ اخباروں کے اڈیٹوریل میں ہوتا ہے۔ لوگوں کے پاس بھی سوائے اس کے اور کوئی موضوع نہیں

مگر اس کے باوجود کوئی ان حالات کا مداوا کرنے کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ پنسلین اور وائرس کی بلک مارکیٹ ہوتی ہے، ان کو پتا ہے کہ ناممکن سے ناممکن کام ذاتی رسوخ یا سفارش کے ذریعے چمکی بجاتے ہیں پورا کر لیا جاتا ہے، وہ جانتے ہیں کہ شروع سے آخر تک اوپر سے نیچے تک بے ایمانی کا دور دورہ ہے مگر اس کے لئے کوئی کچھ بھی تو نہیں کرتا۔ عوام جانتے ہیں کہ ان کے لیڈر کتنے پانی میں ہیں۔ لیکن لیڈر کو بھی چند ایسے گریاد ہیں جن کے ذریعے عوام کو قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں اتنے پیانے پر مسلمانوں نے اتنے گرے ہوئے کروار کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ بار بار میں نے اپنے نئے دوستوں سے (جن کا تعارف میں تم سے آگے چل کر کروں گا) پوچھا کہ جب مسلمان کو آزادی اور اقتدار ملا تو اس نے من حیث القوم اتنے گھٹیا پن کا مظاہرہ کیوں کیا۔ مجھے بتلایا گیا کہ شروع کے دو تین سالوں میں جس قدر جوش و خروش یہاں طاری تھا اب اس سے چوگنی مایوسی کی عملداری ہے۔ اب تو لوگ کہتے ہیں کہ یار ہمیں بیرونی ممالک میں خود کو پاکستانی کہتے شرم آتی ہے۔ یہی احساس کمتری زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔

کراچی میں شام کو لوگوں کو کوئی کام نہیں سوائے پارٹیوں میں جانے یا سینما دیکھنے کے۔ نہ یہاں تھیٹر ہیں نہ کانسرٹ نہ سیمینار نہ دوسری تہذیبی سرگرمیاں۔ تھوڑی بہت دلچسپی غیر ملکی سفارت خانوں کے دم قدم سے قائم ہے۔ کسی روز برٹش کنسل نے ایلینٹ پر ایک لیکچر کر دیا یا تصویروں کی نمائش منعقد کر لی گئی، کسی

روز امریکن اطلاعات کے دفتر میں کوئی پروگرام ہو گیا، کبھی ایران یا انڈونیزیا  
فرانس والوں نے کوئی تقریب کر لی، کبھی جرمن سفارت خانے میں فلم شو منعقد کر  
لیا۔

ویسے بس پارٹیوں کا بڑا زور ہے جن میں یہ خم پہ خم لٹھکائے جاتے ہیں۔  
پارٹیوں کے ذریعے لوگ اپنا اپنا مستقبل بناتے ہیں۔ موٹروں کا لین دین ہوتا  
ہے۔ اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کی ٹپس لڑائی جاتی ہے۔ مکانات اور زمینوں کے  
ایڈمنٹ کا کاروبار ہوتا ہے۔

یہاں مجموعی طور پر جنگل کا قانون نافذ ہے۔

اعلیٰ طبقہ، جو بڑے بڑے تاجروں، اعلیٰ حکام پر مشتمل ہے، اس کی علیحدہ  
برادری ہے۔ اتوار یہ لوگ سمندر کے کنارے گزارتے ہیں۔ چھٹیاں لے کر  
یورپ اور امریکہ جاتے ہیں۔ ان کی اولاد بھی مغربی ممالک میں پڑھ رہی ہے۔  
انہوں نے لاکھوں روپیہ سویٹرز لینڈ کے بنکوں میں جمع کر لیا ہے۔ بڑے مزے کی  
بات یہ ہے کہ لوگ، جو بات بات پر دوسروں کو نندار اور وطن فروش کے نام سے  
نوازتے ہیں اور حب وطن کا سارا ٹھیکہ انہوں نے خود لے رکھا ہے، یہی سب لوگ  
خود انگلستان یا کینیڈا میں سکونت اختیار کرنے کے پروگرام بنا رہے ہیں۔

پاکستانی اٹھکچو لڑکودیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ ان ذہین لوگوں کا وقت کس بھیا نک  
خلاء میں برباد ہو رہا ہے۔ ان کے سامنے کوئی پروگرام نہیں ہے، کوئی راستہ، کوئی  
مقاصد، یہ سب بھی جنگل کے قانون میں گرفتار ہیں۔ محض تلخی اور بیزاری اور مایوسی  
کا فلسفہ ہے، میں ان کا مقابلہ اپنے ساتھیوں سے کرتا ہوں جو ان ہی کی نسل کے

نوجوان ہیں اور پچھلے نو سال میں بالکل مختلف راہوں پر چلتے ہوئے ارتقاء کی منزلوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ اکثر میرے نئے دوست مجھ سے پوچھتے ہیں انڈیا میں ہر مہینے اہم، ٹھوس موضوعات پر کتنی ان گنت کتابیں چھپتی ہیں، مختلف شعبوں میں کس قدر زبردست ریسرچ اختیار کی جا رہی ہے، کیسے کیسے رسالے نکل رہے ہیں، کیا کچھ سوچا اور لکھا جا رہا ہے، حکومت فنون لطیفہ اور ادب اور علم کی کتنی سرپرستی کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک اکثر مجھ سے کہتا ہے: ”یار! قسم خدا کی، باہر کے اخبار پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ بڑا فرسٹریشن ہوتا ہے۔“

فرسٹریشن..... یہ لفظ یہاں کی ساری ذہنی زندگی کا سہل ہے۔

دوسرا لفظ ریکٹ ہے۔ سیاست، ادب، کلچر، مذہب۔ ہر چیز کا نہایت اعلیٰ پیمانے پر ریکٹ چلایا جا رہا ہے۔ میرے ذہن پرست دوست جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بڑے بے نیاز انداز میں سوال کرتے ہیں: ”کہو، بھی آج کل کون سا ریکٹ چلا رہے ہو۔“

جب میں ان لوگوں کو اپنی عمر کا بہترین حصہ اس خلاء میں ضائع کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے کس قدر صدمہ ہوتا ہے۔ صبح ہوتی ہے، یہ لوگ اپنے اپنے کام پر نکلتے ہیں، دوپہر کو ایک نیم تارک اور غیر دلچسپ کافی ہاؤس میں جمع ہو کر کھانا کھاتے ہیں اور شام کو جا کر کوئی انگریزی فلم دیکھ لیتے ہیں۔ منگل کے منگل کسی ایک کے یہاں جمع ہو کر پھر وہی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ ان سب کو اپنے اپنے خمیر کا بڑا احساس ہے مگر زندہ بہر حال رہنا ہے، روزی بہر حال ممانا ہے، اگر بھوکوں ہی مرنا ہوتا تو ہندوستان سے ادھر کیوں آتے (ان میں سے اکثر حضرات ”مہاجر“

ہیں)۔ جرنلسٹ ایمانداری سے رپورٹنگ نہیں کر سکتے کیونکہ اپنے اپنے اخباروں سے نکال باہر کیے جائیں گے۔ ادیبوں کے پاس لکھنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا (گو بے شمار رسالے نکل رہے ہیں)۔ ترقی پسندی آؤٹ آف فیشن ہو چکی حتیٰ کہ ادب میں جمود کا نعرہ بھی پرانا ہو گیا۔

اسلام..... اس لفظ کی جو گت بنی ہے (کرکٹ میچ میں پاکستانی ٹیم ہارنے لگے تو سمجھو اسلام خطرے میں ہے)۔ دنیا کے ہر مسئلے کی تان آخر میں آکر اسی لفظ پر ٹوٹتی ہے۔ دوسرے مسلمان ملک اس بات پر خوب چڑتے ہیں۔ ساری دنیا کی طرف سے اسلام کا ٹھیکہ اس وقت ان لوگوں نے لے رکھا ہے۔ ہر چیز پر تنگ نظری کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ موسیقی، آرٹ، تہذیب، علم و ادب..... سب کو ”ملا“ کے نقطہ نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اسلام، جو ایک چڑھتے ہوئے دریا کی طرح ان گنت معاون ندی نالوں کو اپنے دھارے میں سمیٹ کر ایک عظیم الشان آبشار کی صورت میں رواں ہوا تھا، اب وہ سمٹ کر ایک مٹیالے نالے میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ نالہ ایک وسیع بھیڑ میں کہہ رہا ہے جس میں چاروں طرف سے بند باندھے جا رہے ہیں۔

لطیفہ یہ ہے کہ اسلام کا نعرہ لگانے والوں کا فلسفہ مذہب سے قطعی کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان کو صرف اتنا معلوم ہے کہ مسلمانوں نے آٹھ سو سال عیسائی اسپین پر حکومت کی، ایک ہزار سال ہندو بھارت پر۔ عورتوں نے صدیوں تک مشرقی یورپ کو تابع رکھا۔ امپیریلزم کے علاوہ اسلام کی جو عظیم انسان پرستی کی روایات ہیں ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ عرب حکماء، ایرانی شعراء اور ہندوستانی صوفیائے



کرام کی وسیع الفلکی کا چرچا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ علی اور حسینی کے فلسفے سے کوئی غرض نہیں۔ اسلام کو ایک نہایت جارحانہ مذہب اور طرز زندگی بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔

علاوہ ازیں اپنے ملکی اور اشد اہمیت کے مسائل نظر انداز کر کے کلچر کو غیر ملکیوں کے سامنے پیش کرنے کا رجحان بھی زروں پر ہے۔ یعنی یہ کہ شاید ہماری یہ کتاب انگلستان یا امریکہ سے چھپ جائے، کوئی امریکن فلم کمپنی ہمیں اپنے مووی میں لے، ہم کسی بین الاقوامی کانفرنس میں بھیج دیے جائیں۔

انگریزی جرنلزم کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مسلمانوں کے پاس پہلے ہی کون سے اخبار تھے اور کون سی ان کو صحافت کی ٹریننگ ملی تھی اور ۴۷ء کے بعد سے اب تک جو کھیپ یونیورسٹیوں سے باہر نکلی اس میں اچھ لکھنے والے نمودار ہونے چاہئیں تھے۔ ان گنت خواتین و حضرات یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں لے کر لوٹے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کوئی اکاڈمک خوش نصیب ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے سمندر پار جاتا تھا۔ جانے آج کل لوگوں کو ڈگریاں اور ڈاکٹریٹ کیسے مل جاتے ہیں اور یہ لوگ پڑھ لکھ کر کہاں لاد دیتے ہیں، یہ اسرار آج تک میری سمجھ میں نہ آیا۔

مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ پاکستانی لڑکیاں بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ (کم از کم شہروں میں کیونکہ متوسط طبقہ موڈرن ہو چکا ہے)۔ ان گنت لڑکیاں ڈاکٹر، نرس اور لیکچرر بن رہی ہیں ملازمتیں کر رہی ہیں۔ لگیوں کی ملازمت کو اب معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ مجموعی طور پر پاکستانی خواتین نے فی الواقعہ بہت

ترقی کی ہے اور یہ ایک بہت ہی اچھا شگون ہے۔

رات گزرتی جا رہی ہے۔ جو کچھ میرے ذہن میں آتا جا رہا ہے لکھتا جا رہا ہوں۔ اسی وجہ سے شاید تم کو خط بے ربط معلوم ہوگا مگر اتنی بہت سے باتیں تم سے کرنا ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ تم میری آنکھوں سے میرے نئے ملک کو دیکھ لو، میری ہمت بڑھاؤ تاکہ میں اس ملک کے لیے اپنے بھرپور اجملا کچھ کر سکوں۔

مغربی پاکستان کی سوسائٹی کا ڈھانچہ اب تک فیوڈل رہا ہے لہذا یہاں سیاسی شعور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عوام مڈل ایسٹ کے بادشاہوں کے جلوس دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ جہانگیر پارک میں جمع ہو کر وزیراعظم کی تقریر سننے کے بعد زندہ باد اور مخالف پارٹی کے لیڈروں کی تقریروں کے بعد مردہ باد کے نعرے لگاتے ہنستے بولتے خوش خوش گھر لوٹتے ہیں۔ عام طور پر سرکاری اور غیر سرکاری جلے جلوسوں کے لیے کرائے کے آدمی بلوائے جاتے ہیں نعرہ بازی کے بعد ان کو پیسے دے کر رخصت کیا جاتا ہے۔ سیاسی لیڈر شپ بڑے بڑے کاروباریوں وار سیٹھوں کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔

عوام کی نفسیات اور سٹیئر یا کی عجیب و غریب مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ چند سال قبل پنڈت جی یہاں آئے تو عوام کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے پولیس کورڈن توڑ دیے اور زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھایا۔ پنڈت جی خود ایک نمبر کے جذباتی آدمی، ان پر خوب رقت طاری ہوئی۔ خوش آمدید کے پھاٹک بنائے گئے۔ تقریبات ہوئیں، یہی عوام وقتاً فوقتاً مخالفین کی ارتھی کے جلوس نکالتے ہیں اور ان کے پتلے سڑکوں پر جلاتے ہیں۔

اس کے علاوہ کرکٹ میچ بھی اس ہسٹریا کا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ انڈیا پاکستان کا میچ ہوا تو چند روز کے لئے گمان ہوتا تھا پنجاب تقسیم نہیں ہوا اور لاہور اور امرتسر حسب سابق ایک ہی صوبے کے دو شہر ہیں۔ ہزاروں سکھ اور ہندو جوق در جوق سائیکلوں پر بیٹھ کر لاہور آئے۔ لاہور کے طلوائیوں نے ان کو مفت مٹھائی کھلائی۔ تانگے والوں نے ان سے کرایہ نہیں لیا۔ قیامت کی چہل پہل رہی۔ آئیڈیلٹ قسم کے کالم نگاروں نے اخباروں میں عظمت انسان کے گن گائے، بڑے دلخراش واقعات بھی ہوئے۔ ایک بوڑھا اندھا سکھ مشرقی پنجاب سے آیا اور اپنے سابق شہر کے گلی کوچوں کے درو دیوار چھوٹا پھرا۔ اس نے کہا مجھے میرے پرانے مکان لے چلو جو کہیں شاہ عالمی میں تھا۔ لوگوں نے اسے وہاں تک پہنچایا اور وہ اپنے گھر کی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر رویا۔

میں اس نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ اسٹریو ٹائپ کے متعلق ہم نے سوشیولوجی میں بہت کچھ پڑھا ہے مگر جب اصلیت میں اس سے دو چار ہوتے ہیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔

مہاجرین کا ایک اور مسئلہ ہے، یہاں ہنوز روز اول ہے۔ ۴۷ء کے ہندوستان میں جو حالت شرما تھیوں کی تھی وہ آج اٹھ سال گزرنے کے بعد مہاجرین کی ہے اور روز بروز ہولناک تر ہوتی جا رہی ہے۔

چونکہ میں ٹیکنیکل طور پر خود ”مہاجر“ ہوں لہذا اس پر اہم میں نے بہت غور کیا۔ دیکھو بیٹا، بات ساری یہ ہے کہ ہندوستان میں متوسط طبقے کے مسلمان کے قدم اکھڑ چکے ہیں، وہی اسٹریو ٹائپ کا حوالہ یہاں پھر دینا پڑے گا۔ سکیورٹی کی

تلاش میں یہاں کے ناگفتہ بہ حالات جانتے ہوئے بھی ہندی مسلمان یہاں آ جانا چاہتا ہے۔

جب مسلمان لڑکے یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں تو ہندی دفاعی افواج میں اس لیے نہیں جاتے کہ ان کی وفاداریاں مشکوک ہیں۔ سارے خاندان ہٹ چکے ہیں۔ ایک بھائی پاکستان آرمی میں ہے دوسرا نیوی میں، تیسرا آزاد کشمیر ریڈیو میں نوکر ہے، اس کا چوتھا بھائی، جو ابھی پٹنہ میں بی ایس سی کر رہا ہے، انڈین ایئر فورس میں درخواست بھیجنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا لہذا وہ یہاں پہنچ کر جٹ پائلٹ بن جاتا ہے، پٹنہ میں شاید کلرک بھی نہ بن سکتا۔ دوسرا عنصر یہ ہے کہ اسے یہ خیال رہتا ہے کہ اگر وہ ملازمتوں کے کمپی ٹیشن میں بیٹھا بھی تو ہندو سے، جو زیادہ محنتی ہوتا ہے، نہیں جیت سکے گا، اگر جیت بھی گیا تو تعصب کی وجہ سے اسے سلیکٹ نہیں کیا جائے گا، ہندوستان وطن نہیں ایک قسم کا عارضی پڑاؤ کا کمپ ہے۔

علی گڑھ میں کہاوت ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی سڑک نئی دلی کے بجائے سیدھی کراچی جاتی ہے۔ برطانوی دور حکومت میں مسلمانوں کی دوسری اقلیتوں کی مانند ملازمتوں میں نشستیں مخصوص تھیں، نامزدگی کا دستور تھا اور ہندوستان میں ملازمتوں کے سلسلے میں مسلمانوں سے جو تعصب برتا جا رہا ہے اس کا اندازہ مجھ سے بہتر کس کو ہوگا۔

مسلمان کے اشعور میں ہجرت کا فسوس بسا ہوا ہے۔ پچھلی صدی میں ایشیاء میں سیاسی بیداری کے پھیلتے ہی یہ قوم متضاد مخالف وفاداریوں کی کش مکش کا شکار ہو گئی۔ رہا ہند میں لیکن ’میرے موالا بلا لے مدینے مجھے‘ اس کا محبوب نغمہ تھا۔ پان

اسلام موزم کی تحریک نے اس تصور کو اور دل آویز بنایا اور مسلمان کے یہاں نیشنلزم اور وطن پرستی کا تصور ہی بدل گیا۔ اب ہندوستانیت اور اسلام ہم معنی نہیں تھے کیونکہ اول الذکر میں ہندو ازم بھی شامل تھی اور اس میں انگریزوں نے فرقہ پرست عناصر کے ذریعے الگ ہندویت کی تحریک چلا رکھی تھی۔ ایرانیہ اور اسلام، عربیت اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں تھا جس طرح ہر فرانسیزی لامحالہ عیسائی بھی ہے مگر ہندی مسلمان کو اس ملک میں اکثریت کی ایک بڑی رنگین تہذیب اور مضبوط معاشرے سے مقابلہ کرنا تھا لہذا وہ اس ماحول میں شامل ہو کر اس سے مدافعت کرتا رہا، مگر یہ مدافعت کب پیدا ہوئی؟ سارے غیر ملکی مبصرین کا، جو مغلوں کے زوال کے وقت ہندوستان میں آئے اور جن کو اس وقت جدا کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کا علم نہ تھا جو انیسویں صدی میں تیار کی گئی، یہ کہنا کہ اس طوائف الملوکی کے باوجود ملک میں ہندو مسلم سوال کا وجود نہیں تھا۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سوال کس طرح پیدا ہوا۔ انیسویں صدی میں جب ملک کی اقتصادی تباہی کی وجہ سے یہ کھنچاؤ شدید تر ہو گیا، ہندو اکثریت کے ہاتھوں پٹ جانے کے خوف کی نفسیات کا تذکرہ پنڈت نہرو اور سردار پانیکر دونوں نے کیا ہے، یہ سوال تاریخ کا بہت بڑا ”مگر“ ہے کہ اس خوف کا مدراک کیا جاسکتا، جو کہ کانگریس کر سکتی تھی، تو آج حالات کیا ہوتے۔

خیر۔ تو ہندی مسلمانوں کا صہیون، حجاز تھا۔ یورپین یہودیوں اور ہندی مسلمانوں کے علاوہ دنیا کی کسی اور قوم نے وفاداریوں کے اس تصادم کا سامنا نہیں کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے علیحدہ ملک بنائے ہیں اور دونوں اب ان مزید

مسائل سے دوچار ہو رہے ہیں۔

پاکستان میں جو نفسا نفسی کا عالم اور حب وطن کی کمی نظر آتی ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ مسلمان کو اس سرزمین سے کوئی بے اختیار جذباتی اور روحانی شگاف نہیں، وہ موقع اور سیکیورٹی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں جس طرح یورپین اقوام امریکہ پہنچی تھیں۔ نیویارک میں رہنے والا پولش بوڑھا وارسا کو یاد کر کے آہیں بھرتا ہے مگر پولینڈ کے اس دھندلے تصور سے اس کی اولاد کو کوئی غرض نہیں جو نئے ملک میں امریکن کی حیثیت سے پروان چڑھتی ہے۔ اسی طرح یہاں پر جو لوگ گوشتی کے خربوزوں اور پریاگ کے میلے اور ساون کی گھٹاؤں کو یاد کر کے روتے ہیں ان کی اولاد جو یہاں بڑی ہو رہی ہے، اس کے لیے یہ سارے تصورات بے معنی اور مضحکہ خیز ہیں، یہ نسل خالص پاکستانی ہو گی اور اس طرح ان متضاد وفاداریوں کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

زبان کا مسئلہ ہماری کتنی بڑی بد قسمتی رہی ہے۔ ہندوستان سے ٹڈل کا اس مسلمان کے قدم اکھڑنے کی دوسری وجہ سنسکرت آمیز ہندی زبان کا تسلط ہے۔ اپنی زبان کی تباہی کسی قوم کے لیے سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ انسان اپنی دولت لٹتے دیکھ سکتا ہے مگر اپنی زبان اور تہذیب کی حج کئی برداشت نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں ہندی مسلمان کو غیر شعوری اور شعوری طور پر اپنی مخصوص تہذیب کی برتری کا ناز بھی رہا ہے چنانچہ یہ اس کی دوسری بڑی زبردست نفسیاتی شکست ہے۔ مسلمان بچے اسکولوں میں ہندی پڑھ رہے ہیں (جبکہ ان کے باپوں کی نسل کے ہندو انہی اسکولوں میں اردو پڑھتے تھے) یہ بچے اگر ہندوستان میں رہ گئے تو

اس نئے تمدنی سانچے میں کھپ جائیں گے، اور اسی میں ان کی عافیت ہے، اگر وہ اسے بھی resist کرنا چاہتے ہیں تو لامحالہ ان کو ادھر آنا پڑے گا۔

زبان کا مسئلہ زیادہ تر شہروں کے مسلمانوں کے لیے ہے کیونکہ پورب کے مسلمان کسانوں کی زبان وہی ہے جس میں ملک محمد جاکسی نے پدموت، کبیر داس نے اپنے دو ہے اور تلخی داس نے رمان لکھی تھی۔

دیہاتوں میں مسلمانوں کو ایک مختلف مذہبی فرقے کی بجائے محض ایک اور جات سمجھا جاتا رہا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اتر پردیش کا وہ مسلمان، جو مسلمانوں کی ٹڈل کلاس سیاست اور تہذیب کا علمبردار تھا، نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا، اس کی حالت قابل رحم ہے۔

اب میں پھر یہاں کے حالات کی طرف واپس آتا ہوں۔

کل میں بھیا صاحب کے دفتر میں بیٹھان کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت گزرنے کے لیے میں نے پلمسی کے لٹریچر کی ورق گردانی شروع کی اور بہت سی کتابیں گھر اٹھتا لایا۔ رات کو میں نے کچھلے برسوں کے وزرائے اعظم کی اہم ترین تقاریر نکال کر پڑھیں۔ طلعت! وعدوں کا ایک سمندر ہے کہ ٹھانجھیں مار رہا ہے۔ اٹکیموں کا ایک ریلہ ہے جو آٹھ سال سے اب تک بہتا چلا آ رہا ہے۔

مسلمان سیاست ہمیشہ سے ٹڈل کلاس، شہروں کی سیاست رہی ہے لہذا دیہاتوں کی طرف کوئی بھولے سے بھی توجہ نہیں دیتا۔ مسلمانوں کے پروگرام میں تفہیم سے پہلے زرعی اصلاحات وغیرہ کا دور دور کہیں ذکر نہ تھا، وہی روایت اب بھی باقی ہے۔ زمینداری کے خاتمے کا فی الحال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اسی

حقیقۃ کی حکومت ہے۔

آج جمعہ کی رات ہے اور میں ایک اٹلکچول محفل سے لوٹ کر آ رہا ہوں۔ وہاں گھاس پر، قالینوں پر، صوفوں پر بیٹھے گروپ بنائے مغربی ادب اور عالمگیر سیاست کی موشگافیاں کرتے ہوئے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھ کر میں سوچا کیا کہ کاش تم ان سب کی باتیں سنیں۔ (اس محفل میں دیسی لڑکیاں صرف دو تین ہی ہوتی ہیں، میں نے یہاں کی مسلمان لڑکیوں میں ان کی اعلیٰ تعلیم کے باوجود بنیادی سنجیدہ مسائل کے متعلق سوچنے کی طرف سے حیرت انگیز بے اعتنائی دیکھی)۔

اس محفل کے غیر ملکی اراکین بھی بہت دلچسپ ہیں۔ انفریڈ ایک انگریز لڑکا ہے جو لندن اسٹیج پر رہ چکا ہے۔ جولین ایک اور انگریز لڑکا ہے، رومن کیتھولک اٹلکچول، اس کا ساتھی رولنڈ ہے، یہ بھی اوکسفرڈ سے آیا ہے۔

اس محفل میں دنیا جہاں کے مسائل پر زور شور سے بحثیں ہوتی ہیں۔ دراصل یہ ایک قسم کا ہائیڈ پارک کورنر ہے جہاں لوگ باگ آ کر اپنے اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

آج شام وہاں ایک طرف کیتھولک عقیدے پر بحث ہو رہی تھیں اور دوسری طرف مغرب کے رجعت پسند ادیبوں پر تبرا بھیجا جا رہا تھا۔ ایک فرانسیسی پرائیمری اسکول کے سلسلے میں اعنت ملامت ہو رہی تھی۔ امریکن انداز کے بارے میں میری رچرڈز کی لوگ جان کھارہے تھے۔ میں دوسری طرف مڑا۔ قالین کے ایک سرے پر اجلا کا گروپ فرانسیسی اٹلکچول سے الجھ رہا تھا۔ کانگریس آف کلچرل فریڈم کا تذکرہ



تھا۔

”فرانس کی موجودہ دگرگوں حالت سے مغربی دانشوروں کی حالت غیر ہے۔  
فرانس، جو یورپ کی کلچر اور ذہن کا تہل تھا، اس کے موجودہ رویے نے مغربی  
اٹھکچو لڑکوں کو ہڑادیا ہے۔ مغرب کا اب واقعی زوال ہو گیا ہے۔ اب اس کے پاس  
اپنے جواز میں کوئی دلیل نہیں۔“ تنویر گرج رہا تھا۔ ”اب اگر کل کو سارتر دوبارہ  
تائب ہو جائے تو میں متعجب نہ ہوں گا۔ مغربی تہذیب کے نلمبرداروں کے پاؤں  
تلے سے زمین نکل گئی ہے۔“

”برطانوی دانشوروں کی کیا مضحکہ خیز حالت ہے۔ امریکہ سے روپیہ کھاتے  
ہیں.....“

یوجین دوسری طرف گوہر افشانی کرنے میں مصروف تھا۔ میں ٹہلتا ہوا جا کر  
امریکنوں کے پاس بیٹھ گیا۔ ”میری..... ذرا امریکن ایڈ دینا۔“ رونلڈ نے  
سگریٹ لینے کے لیے میری رچرڈز کی طرف ہاتھ بڑھایا، وہ قہقہہ لگا کر ہنسی، بری  
خوش اخلاق لڑکی ہے۔

دوسرے گروپ میں چن بین الاقوامی شہرت کے مورخ بیٹھے تھے جو چند روز  
کے لیے کے کراچی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

”اگر امریکہ خانہ جنگی کے بعد دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تو ہم لوگوں کا آج تک  
جانے کیا حشر ہوا ہوتا۔“ امریکن مورخ نے کہا۔ ”تم اپنی تھیوری مت دہرانا کہ  
تقسیم کی وجہ اقتصادي تھی۔“ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ملایا۔ ”اس کے علاوہ کیا تھا،  
میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں تو یہ جانتا چاہتی ہوں کہ مشرق کے ڈاؤن فال کی اصل وجہ کیا ہے؟“  
فرنی نے کہا۔

”میں نے ٹونہنی سے بھی یہ پوچھا، وہ حیران ہیں ہندوستان کا اٹھارہویں  
صدی میں کیوں زوال ہوا۔“

”ہندوستان کی نہری آبپاشی کا انتظام ناقص تھا۔“ جیکب مورین نے کہا۔  
”یہ مسئلہ خالص زرعی ہے۔“ اب رونلڈ اور یوجین اور میری رچرڈز ایک اور بحث  
کر رہے تھے۔

”مشرق کے ڈاؤن فال کی وجہ اسلام ہے۔“  
”ایں؟“

ریفریشن کے بعد عیسائی یورپ نے انتقاد کی اسپرٹ پیدا کی، وہ اسلام میں  
آج تک موجود نہیں۔ تم اعلان یہ اپنے مذہب پر اعتراض کر سکتی ہو؟ تمہارا جینا دو بھر  
کر دیا جائے گا۔

”واہ، اسلام میں بھی بدعتی اور باغی پیدا ہوتے رہے ہیں۔“ فرنی نے کہا۔  
”ہاں، مگر اپنے رسول یا خدا کے تصور یا قرآن..... کسی چیز پر بھی تنقید کر  
سکتی ہو؟ عیسائیوں کے یہاں ان گنت چرچ ہیں اور ملحدوں کی فوج کی فوج موجود  
ہے۔ عیسائی بڑے اطمینان سے شکایت اور روجن میری کے تصور کا مذاق اڑاتے  
ہیں کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ مسلمان سائنٹفک طریقے سے سوچنے کا اہل نہیں۔“  
”جی ٹونہنی نے کہا ہے کہ انڈک سوسائٹی اسلامک سوسائٹی کے مقابلے میں

زیادہ روادار ہے۔“

”بدھ ازم اور.....“

ڈیڑھ بجے کے قریب ہم لوگ وہاں سے اٹھے۔ ایئر پورٹ جا کر قہوہ پیا۔ جب میں واپس گھر پہنچا اس وقت میں تھک کر چور چور ہو چکا تھا۔ سامنے نام کی کوٹھی ہے۔ اس میں روشنیاں بجھ گئی ہیں۔ نام بھی کسی پارٹی سے لوٹ کر سونے جا چکا ہے، یہ لڑکا میرے ہمراہ جہاز پر بمبئی آیا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے اخبار نویس ہے، کچھ عرصے ہندوستان میں گھومتا پھرا۔ اب محکمہ فشریز یعنی مچھلیوں کا ایڈوائزر ہو کر یہاں آ گیا ہے۔ فشریز کے علاوہ براڈ کاسٹنگ کو بھی ایڈوائز کرتا ہے۔

ایڈوائزرز کی ہر طرف ریل پیل ہے۔ ہر محکمے میں ان گنت ایڈوائزر منسلک ہیں جو جانے کیا جادو سکھاتے ہیں مگر اب تک کوئی ترقی کہیں نظر نہیں آتی۔ چہارسوا سکندرز کا بازار گرم ہے۔ رشوت کے اسکندل، دھاندلی اور سیاسی غنڈہ گردی کے اسکندل۔

آج سب سے بڑا واقعہ، طلعت میری چھتتی بہن، یہ ہے کہ میں لکھنؤ کا انقلابی، کانگریس کا سرگرم کارکن، متحدہ ہندوستان کی عظمت کا جوشیا انقیب، آج صبح میں بارہ سو روپے ماہوار کے ایک عہدے پر لے لیا گیا۔ ایک پوری لیبارٹری مجھے سٹاپ کرنا ہے۔ اس کے لیے ساز و سامان خریدنے میں شاید جلد امریکہ بھیج دیا جاؤں۔ فی الحال اسی کام کے سلسلے میں اگلے ہفتے مشرقی پاکستان جا رہا ہوں۔ اگلا خط تم کو ڈھاکے سے لکھوں گا۔

اب صبح ہو رہی ہے۔ ساری رات میں نے تم کو خط لکھنے میں گزار دی، حد

ہے۔ میں نے جانے کتنے صفحے سیاہ کر دیے ہوں گے۔ ابھی میں نے دریچوں کے پردے ہٹائے اور باہر جھانکا۔ کراچی جگ اٹھا ہے۔ کراچی اپنے کام پر جا رہا ہے۔ سینکڑوں ہزاروں انسان سائیکلوں، چھکڑا ایسی بسوں، سائیکل رکشاؤں پر سوار کارخانوں اور دفتر کی طرف رواں ہیں، یہ وہی لوگ ہیں بٹیا جن کو عرف عام میں جتنا کہا جاتا ہے۔ طلعت! ان لوگوں نے تو کوئی قصور نہیں کیا، کوئی جرم۔ ان کو تعلیم نہیں دی گئی۔ ان کو بھوکا رکھا گیا۔ ان کو جس لاشی سے ہانک دو ہنک جائیں گے، یہ سب امن سے زندہ رہنے، پیٹ بھر روٹی کھانے، آرام سے سونے کے مستحق ہیں۔ طلعت جس وقت صبح سویرے ہزاروں انسانوں کا ریل پائی آئی ڈی سی کے نئے ڈاک یا رڈ کی طرف بڑھتا ہے اس وقت، قسم خدا کی، وہ نظارہ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ مجھے پاکستان کے مستقبل سے امیدیں سی بندھ جاتی ہیں، یہ بڑے معصوم بے ضرر انسان ہیں، یہ لوگ جو اس جید، بے ہودہ، بد شکل بوم ماؤن کی پندرہ لاکھ آبادی ہیں، یہ مکرانی اونٹ گاڑی والے، رنگ برنگے لہنگے پہنے راجستھانی اور کاٹھیاواڑی مزدور نہیں، عود آ باد کولونی میں رہنے والے بنارس کے جوا ہے (جن کے پر کھبیر کے ساتھ بیچ گنگا گھاٹ پر دو تارہ بجاتے پھرتے ہوں گے، لالو کھیت اور لیاری کی لرزہ خیز مہاجر بستیوں کے باسی، مغربی یو۔ پی۔ کے کاری گر، دلی کے بساطی، بمبئی کے ٹیکسی ڈرائیور اور چاء خانے والے، فٹ پاتھ پر دکانیں رکھنے والے چھوٹے چھوٹے کاروباری، انجام کولونی اور آگرہ تاج کولونی کے باشندے جو ہا کس بے کے راستے پر ہندوؤں کے سابقہ شمشان گھاٹ کی دلدل میں جھونپڑے ڈالے پڑے ہیں اور اپنی اپنی جھگیوں پر چاؤ سے چاند تارے

کا جھنڈا ہراتے ہیں۔ ہر سال بارش آتی ہے تو ان کی جھونپڑیاں بہہ جاتی ہیں۔  
 اپوا کی بیگمات آ کر امریکن دودھ کے ڈبے اور کمبل ان کو تقسیم کرتی ہیں اور ان کی  
 جھونپڑیاں اگلی برسات تک کے لئے پھر آباد ہو جاتی ہیں۔ رات میری رچرڈ مجھ  
 سے پوچھ رہی تھی کہ بحیثیت سوشیولوجسٹ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اس قدر  
 ناقابل یقین تکالیف کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے باوجود کراچی کی یہ مخلوق اس  
 قدر امن پسند کس طرح ہے، یہ انقلاب کیوں نہیں پیا کرتی۔ تشدد پہ کیوں نہیں اتر  
 آتی۔ مال ہے کہ اس کا جواب میری رچرڈ کو بھی معلوم نہیں۔ مجھے بڑی ناامیدی  
 ہوئی۔

نہیں طلعت! یہ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ان سے اس لیے متنفر نہ ہو کہ  
 انہوں نے ہلہ کر کے تمہاری دنیا تقسیم کروادی، یہ بڑے معصوم انسان ہیں۔ ان کو  
 ان مباحثوں، تاریخ کی ان موٹا گائیوں اور تجزیوں سے کوئی غرض نہیں جو کل رات  
 میں نے اس محفل میں سنیں۔ جو کچھ رونلڈ کہہ رہا تھا، جو کچھ تنویر کہہ رہا تھا، میری  
 رچرڈ کہہ رہی تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ سندھ انڈسٹریل اسٹیٹ میں کارخانے  
 کھل گئے ہیں اور ان کی مشینیں یہ انسان چلا رہے ہیں اور جس ملک میں وہ رہ  
 رہے ہیں اس کا نام پاکستان ہے۔ اب ماضی پر رونے اور ماضی کی غلطیوں پر  
 پچھتاوا مضحکہ خیز ہے کیونکہ مستقبل ابھی باقی ہے، یہ سوچنا حماقت ہے کہ دونوں  
 ملک پھر متحد ہو جائیں۔ دنیا کا نقشہ ہر جنگ عظیم کے بعد بدلتا ہے۔ ۴۵ء کے بعد  
 بھی بدل گیا۔ جب میں ماضی کے متعلق سوچتا ہوں میرا دل کٹتا ہے مگر دل کہاں  
 تک کٹے گا۔ زندگی آدھی گزر گئی، تھوڑی سی باقی ہے۔ اب بھی موقع ہے کہ ہم اس

بچے کچے وقت کو سوار کر لیں۔

اس ملک نے مجھے اپنی حفاظت میں لیا ہے۔ مجھے پناہ دی ہے۔ اس کا بنانا یا  
بگاڑنا اب میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے جو عمر بھر تخریب کے بجائے تعمیر کے  
خواب دیکھے ہیں کیا تمہارا خیال ہے یہاں کے ذہن پرستوں کے خلاف میں داخل  
ہو کر میں اپنے آپ کو کھودوں گا؟ نہیں طلعت میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔  
میں تعمیر کروں گا۔

بی۔ ایس:

تعمیر پر یاد آیا کہ بھیا صاحب کی کوٹھی، جس میں میں مقیم ہوں، بے حد شاندار  
ہے۔ ایک اطالوی آرکیٹیکٹ نے بنائی ہے خالص جدید ترین کیلی فورنیا وضع  
کی۔

بھیا صاحب کی دلہن خاصی بد ذات ہیں۔ میں سوچ سوچ کر محظوظ ہو رہا ہوں  
کہ تم ان کو کس قدر ناپسند کرو گی، وہ اپوا کی بڑی سرگرم کارکن ہیں اور کراچی کی  
مشہور میزبان خواتین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ دلہن بھابھی میری آباد کاری کے  
بے حد کوشاں ہیں۔ ابھی انہوں نے میرے لیے ایک ہزار گز زمین خریدوائی اور  
اپنے ایک ہا اثر چچا کے ذریعے مکان کی تعمیر کی غرض سے پچاس ہزار روپیہ قرضہ دلوا  
دیا۔ کل جب ان کا اطالوی آرکیٹیکٹ مکان کا نقشہ لے کر میرے پاس آیا تو میرا  
دل چاہا دھڑکیں مار مار کر روؤں۔ (دلہن بھابھی کی چھوٹی بہن منی تال کا نوٹ  
میں پڑھ رہی ہے۔) عنقریب بھیا صاحب اور دلہن بھابھی برازیل جانے والے  
ہیں۔ کوٹھی غیر ملکیوں کو پندرہ سو روپے ماہوار کرائے پر اٹھا دی جائے گی۔ بابا اور

امی اس کانگج میں رہیں گے جو بھیا صاحب نے احاطے میں بنوائی ہے۔ بابا سارا دن اخبار پڑھنے میں گزارتے ہیں۔ امی کسی سے ملتی جلتی نہیں حالانکہ کراچی میں لکھنؤ کے بہت سے خاندان براجرہے ہیں۔ بابا اور امی کی حالت دیکھ کر میرا کلیجہ غم سے پھٹتا ہے۔

اب میں پھر جذباتی ہو رہا ہوں۔ لہذا خدا حافظ

تمہارا

کمسن

مزید پئی۔ ایس:

پچھلے ہفتے گورنمنٹ ہاؤس کے ایک ڈنر میں روشن آراء سے ملاقات ہوئی تھی۔ خاصی موٹی ہو گئی ہے۔ اس کے شوہر کو میں نے نہیں دیکھا، وہ کسی مشن پر امریکہ گیا ہوا ہے۔ روشن نے تم لوگوں میں سے کسی کی بھی خیریت نہیں پوچھی۔ مجھ سے دو چار رسمی باتیں کرنے کے بعد دوسرے گروہ میں شامل ہو گئی۔

ازمنہ وسطی کا ہندوستان گھاس پھوس جس کی دیواروں سے اگ رہا ہے۔ پرانی دلی کی عمارتیں، اتمیر، خاندیش، بنگال اور مالوہ کی مسجدیں۔ گوڈا کا داخل دروازہ، تانقی پاڑا، فیروز مینار، گن منت مسجد، احمد آباد اور گجرات، چندری اور

جودھ پور کی مساجد، رانی سپاری کی مسجد، چمپانیز، دھروار، مانڈزکا ہنڈوا محل، باز  
بہادر محل، کالپی کا چوراسی گنبد، جو پور کی اتالا دیوی کی مسجد، دولت آباد کے قلعے،  
بہمنی بادشاہوں کی عمارتیں، سری نگر کی گکوٹ ایسی چوٹی مساجد، چندیری کا بادل محل،  
بیدار اور گاجر گہ، دکھن، دکھن۔

اتر پردیش میں لکھنؤ پور تھا اور کالپی اور شکوہ آباد اور بدایوں اور جو پور۔  
مغلوں سے پہلے کا ہندوستان۔

اڑیسہ، مدراس، کرناٹک آندھرا پردیش، حیدر آباد کا دلفریب، پر شکوہ، شاندار  
شہر، اجنٹا، ایلورا، نیلگری کے پہاڑ، بنگلور، کیرالا، ٹراونکور، سرل گھوم پھر کر دوبارہ  
ازمنہ وسطی کی عمارتوں میں پہنچ جاتا۔ ان گنت نام، ان گنت زمانے، وقت کے  
پیٹرن، وہ، جو یورپ کے قدیم کیتھڈرلوں کی محرابوں کے نیچے گھومتا تھا اب خانہ  
بدوشوں کی طرح سارے ملک میں چکر لگاتا پھرا۔ ان عمارتوں کے پتھروں پر وہ  
ہاتھ رکھتا۔ کنول کے پھول، ہاتھی، گندھرو، حوض۔ میٹھیاں، مینار، طاق، کسی  
تاریک اجاڑ محراب کے نیچے سے کوئی دیہاتی لڑکی بکریاں چراتی نکل جاتی۔ کوئی  
لڑکا پھیل کی شاخ پر سے باؤلی میں کود جاتا۔ کوئی فقیر راستہ ٹٹولتا محل کے ایک شکستہ  
کونے میں بیٹھ کر چلم سلگانے میں مصروف ہو جاتا۔ اوپر ٹوٹے ہوئے گنبدوں اور  
وسیع صحنوں پر جھکا ہوا نیلا آسمان سنسناتا رہتا۔ بادل کی مغربی گھاٹ سے جھوم کر  
اٹھتے اور دھروار اور چتوڑ پر چھا جاتے۔ خلیج بنگال سے کھٹائیں بڑھتیں اور راج  
شاہی اور گوڑ پر پھیل جاتیں ازمنہ وسطی کا اداس، خاموش، اجاڑ ہندوستان بارش  
میں نہاتا، گھاس کے پودے ہوا میں اہراتے۔



یہ پتھر ماضی اور حال دونوں میں شامل تھے اور اس کے ذہن پر اس طرح برستے تھے کہ اسے لگتا تھا کہ اب اس کا دماغ قطعاً معاذف ہو جائے گی، وہ بھاگ کر حال میں پناہ لیتا۔

سارے ہندوستان میں مارے مارے پھرنے کے بعد (وہ کس کا متلاشی تھا؟ اس نے کئی مرتبہ جھنجھلا کر خود سے سوال کیا)، وہ پھر کلمتہ پہنچتا، پھر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر مشرقی پاکستان کی سرزمین پر اترتا۔ ڈھا کہ کلب کی بار میں متواتر بیئر پیتے رہنے کے بعد پھر سلہٹ جانے والی ٹرین میں بیٹھ کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جاتا۔

منزل مقصود بالآخر یہ تھی۔

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر دھچکے سے ٹرین رکی۔ طرح طرح کی آوازیں نیند میں تڑتی ہوئی اس تک پہنچیں۔ ڈیم (انڈے) بوائے ڈیم..... سا (چاء) گرم..... سا گرم..... سا گرم..... ڈیم بوائے ڈیم..... اس نے کھڑکی کا پٹ چڑھا کر پھر باہر دیکھا۔ اس منزل میں کس قدر بے پناہ اداسی تھی۔ اندھیرا چھا رہا تھا، باہر فضا میں پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو وسیع ہرے تر و تازہ کھیتوں پر سے بہتی ہوئی آئی تھی ایک بوڑھا پھوس ہندو بے شمار گھڑیاں اور اسباب اٹھائے جھکا جھکا، تیز تیز قدم اٹھائے جا رہا تھا، وہ دیر تک بوڑھے کی دیکھا کیا حتی کہ وہ اسٹیشن کے مجمع میں نظروں سے اوجھل ہو گیا افواہ، یہاں کسی قدر آبادی تھی۔ عورتیں جن کے ماتھوں پر بڑی بڑی سرخ بندیاں اور مانگ میں گہرا سرخ سیندور رچا تھا۔ رنگ برنگی سوتی ساریاں پہنے، بچیاں، دھوتیوں کے کنارے سنبھالے

ہندو۔ چار خانہ تہہ باندھے مسلمان جن کی زیادہ تر داڑھیاں تھیں فاقہ کش کالے کالے لڑکے۔ حکام، اینگلو انڈین گارڈ، پاکی برادر (یہاں اب تک پاکیاں چل رہی تھیں)۔ پھر رڑین چلی، بنگالی آوازیں اندھیرے میں معدوم ہو گئیں۔ رڑین دوبارہ تالابوں کے کنارے کنارے دوڑنے لگی جن میں کنول کے پھول کھلے تھے۔ کسی پھولوں کی ٹیل سے ڈھکے جھونپڑے کے دروازے پر کوئی عورت اودی ساری پہنے کھڑی نظر آ جاتی۔ چند عورتیں گھونگھٹ نکالے بانسوں کے جھنڈ کے نیچے نیچے چل رہی تھیں۔ ان کے نام کیا ہوں گے؟ آمنہ، سکینہ، ربیاء، رادھا۔ ان کی زندگیوں کی کہانیاں کیا ہوں گی بھلا! ان کا نظریہ کائنات، ان کا فلسفہ!! زندہ رہنے سے مر جانے تک کی داستان: تکالیف، افلاس، قحط، قحط، قحط۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اللہ کو پڑ دے۔ پانی دے بھات دے دے.....

اللہ بھات دے..... اس کے کانوں میں اس کورس کے الفاظ گونجے جو اس نے کئی بار ڈھاکہ کی محفلوں میں طالب علموں سے سنا تھا۔ اللہ بھات دے..... اللہ بھات دے، یہ یہاں کا قومی ترانہ ہونا چاہیے، اس نے سوچا اور بنگال کے متعلق اس نے ہمیشہ سے کتنے رومانی تصورات باندھ رکھے تھے۔ شنیل دہی نے اسے یگور پر کیا کیا لیکچر پلائے تھے اور ساری کتابیں جو اس نے پڑھی تھیں: ڈی۔ سی۔ سین اور جسیم الدین اور لیلا رائے۔ لوک گیت جمع کرنے والوں کی ٹولیاں، ادبی کانفرنسیں، کلمتہ کے تھیٹر اور تہذیبی سرگرمیوں اور یونیورسٹی لائبریری اور اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا پس منظر اور کمپنی کے زمانے کی بنی

ہوئی کوٹھیاں، کلائیو روڈ جواب سبھاش چندریوس روڈ تھی اور علی پور اور دھرم تلہ، مگر وہ سرحد عبور کر چکا تھا۔ کلکتہ اور اس کی طلسماتی فضائیں دوسری طرف رہ گئیں۔  
 ٹرین ایک اور اسٹیشن پر رکی۔ اللہ بھات دے۔ بھات دے..... بھات دے۔  
 چند پور بنیں گٹھڑیاں اور بچے اٹھائے دھکا پیل میں لڑھکتی پڑھکتی تھرڈ کلاس کے ڈبوں کے طرف بڑھ گئیں۔ اس کے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ڈاکنگ کار کے پیرے کا سفید براق صافہ اندر داخل ہوا۔

”ڈنر صاحب؟“

”ہاں۔“

اس نے کمبل ٹانگوں پر ڈال لیا اور دوبارہ آرام سے لیٹ گیا۔

سلہٹ میں چاء کے بانگات میں سینکڑوں پوربی مزدور کام کرتے تھے۔ رام دائی، رام اوتار، کچھن اور سینتا۔ ترلوچن اور چنیلیا۔ پوریوں کے یہاں یہ دو نام مقبول تھے: رام اور سینتا۔ ہند کا عہد غلیظ زریں زمانہ، پاٹلی پتر، اندر پرستھ، ایودھیا، لکشن وتی، ڈگ و بے رام چندر اور مٹھو کی جنگ کماری سینتا۔ ارے واہ رے تاریخ دانو۔

”ڈنر صاحب..... کافی لاؤں.....“ پیرے نے ٹرے لا کر سامنے

رکھ دی اور سرگوشی کے لہجے میں اس طرح سے مخاطب کیا گویا وہ دیوتا تھا۔

وہ پھر ہال میں واپس آ گیا۔ اسے یاد آیا کہ اسے ابھی سری منگل پہنچنا ہے اور

رنگامانی اور بندر بن۔ اسے مزید روپیہ مانا ہے۔

دوسرے روز ٹرین سلہٹ پہنچی۔ اسٹیشن پر اس کا منیجر پیٹر جیکسن حسب معمول

کار لیے اس کے استقبال کو موجود تھا، وہ شہر سے نکل کر سری منگل کی سمت روانہ ہوئے۔

سرماندی کے کنارے پہنچ کر اس نے کار روکی۔ اب شام کی تاریکی چھا رہی تھی۔ الٹین لیے بوڑھے اور عورتیں کشتیوں پر سوار ہو رہے تھے۔ یا اتر رہے تھے۔ بوٹ گھر گھر کرتی دوسرے کنارے سے لوٹ آئی تھی۔ ساحل پر شکستہ لاریوں میں لوگ مرغیوں کی طرح ٹھنسنے بیٹھے تھے۔ ایک اندھا فقیر قرآن کی آیتیں پڑھ کر بھیک مانگ رہا تھا، اندھیرے میں اس کی آواز بڑی ہولناک لگی۔ دو اندھے ایک نوکے میں جا بیٹھے تھے، ایک اندھی عورت درخت کے نیچے بیٹھی تھی۔

یہاں کتنے اندھے تھے۔ کتنے بے شمار اندھے۔

بوٹ سے تختے جوڑ کر اس کی کار کشتی پر چڑھائی گئی۔ کشتی مسافروں سے لد گئی۔

”بڑا گندا مجمع ہے، چلو ہم لوگ نوکے میں چلے چلیں۔“ پیٹر نے کہا اس نے مزاحمت نہیں کی، وہ تو خود کشتی کی طرح سطح پر بہے جا رہا تھا۔

وہ دونوں کود کر ایک نوکے میں سوار ہو گئے۔ نوکا بوٹ کے پیچھے چلنے لگا۔ ساحل دور رہ گیا جس پر مٹی کے تیل کے چراغ ٹٹمارہے تھے اور جس کے عتب میں جھونپڑوں پر پان کی بلیں چڑھی تھیں۔ ایک چاء خانے کے آگے لوگ الٹین کے سامنے جھکے اخبار پڑھ رہے تھے۔ دریا پر کشتیاں چل رہی تھیں۔ افق پر سپاری کے درخت ہوا میں جھومتے تھے۔ کس قدر سکون تھا، امٹ سکون۔

دفعتاً زور کی ہوا چلی۔ نوکا ہچکولے کھانے لگا۔

بہت بوڑھا مانجھی اپنا زور لگا کر نوکا کھیتا رہا اور پھر گانے میں مصروف ہو گیا۔

اور اس نے دیکھا کہ اس کے بوڑھے ملال کا نوکا لہروں پر ڈولتا جا رہا ہے۔ آگے جدھر گھپ اندھیرا ہے اور فضاؤں طوفان لڑ رہے ہیں اور تاریک دھاراؤں میں مہیب نا کے منہ پھاڑے بیٹھے ہیں اور ہوائیں بہت تیز ہیں مگر اس فاقہ زدہ ملال کی کشتی بڑے مزے میں عناصر کا مقابلہ کر رہی ہے کیونکہ عناصر کی بے رحمی اور موت سے اس کی پرانی دوستی ہے۔

آخر جب ہوا کا زور زیادہ بڑھا اور کشتی بار بار ڈولنے لگی تو سرل نے لالین اٹھا کر گھبراہٹ کے ساتھ چاروں طرف نظر ڈالی۔ ”پیٹر ہم طوفان میں تو نہیں پھنس گئے؟“ اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

”نہیں یہ تو معمولی سی ہوا ہے۔ پریشان مت ہو۔“ پیٹر نے جواب دیا۔ ”مگر ذرا اس کا لے سوڑ سے کہو کہ اپنا بھونڈا گانا اپنے کے بجائے چواری کی طرف زیادہ توجہ کرے ورنہ اس طرح ہم گھاٹ پر صبح تک نہ پہنچ پائیں گے۔“

”بے چارہ بوڑھا۔“ سرل نے چٹائی کی چھت پر جھک کر دوسری اور جھانکتے ہوئے کہا۔ مانجھی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور صبر کے ساتھ چواری چلانے میں مصروف رہا۔

”یہ بڑے ذلیل لوگ ہیں۔ چستی ان میں نام کو نہیں۔“ پیٹر نے کہا۔

سرل نے چھت پر جھکے جھکے آواز دی: ”او آدمی..... کیا نام ہے تمہارا؟“

”ابوالمونشور..... صاحب۔“

”ابوالمونشور.....“سرل نے دہرایا۔

”جب صاحب.....“ وہ پھر پتیار پر جھک گیا۔ نوکا اب سرعت سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کنارے پر دونوں طرف انناس اور کیلے کے جھنڈ تھے اور گاؤں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ سرل نے نوکے کے اندر جھانکا جہاں ابوالمونشور کا مٹی کا دیا اور چٹائی اور جامنا ز اور دوکانسی کے برتن رکھے تھے۔ دیوار پر ناریل آویزاں تھا، یہ اس بوڑھے پھونس سفید واڑھی والے کی ساری کائنات تھی جو دریا کے طوفانی پانیوں پر ڈولتی تھی۔ دفعتاً سرل کو بڑا عجیب سا لگا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور خود کو یقین دلانا چاہا کہ یہ سب صحیح ہے، یہ صحیح ہے کہ قسمت کے ایک انوکھے دائرے نے اسے کیمرج کی گلیوں سے نکال کر یہاں اس نوکے میں لا بٹھایا ہے۔ اس عجیب و غریب، حسین ملک میں جسے مشرقی بنگال کہتے ہیں، جسے مشرقی پاکستان کہتے ہیں۔

لاٹین اٹھا کر اس نے دوبارہ چاروں اور نظر ڈالی۔ روشنی سے لہروں پر راستہ سا بن گیا۔ برابر سے ایک شہپان گزر گیا۔ چاند بید کے درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ انتہائی کاہلی کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔

یہاں بیٹا باپ کی، بی بی شوہر کی عزت نہیں کرتی۔

لوگ سبھاؤں میں جمع نہیں ہوتے۔

خوبصورت باغ اور عبادت خانے تعمیر نہیں کیے جاتے۔

یہاں امیروں کی دولت محفوظ ہے لیکن چرواہے اور کسان دروازوں کی چٹخنی  
چڑھا کر سوتے ہیں۔

بغیر پانی کی ندی۔ بغیر گھاس کا جنگل۔ بغیر چرواہے کا گلہ۔

پڑھتے پڑھتے کمال نے رامائن بند کر دی۔

”یہ کہاں کا ذکر ہے۔“ سرل نے پوچھا۔

”کہیں کا بھی نہیں۔ میں تو رامائن دیکھ رہا تھا۔ یہاں الماری میں پڑی مل گئی۔

مدتوں پرانی۔ اس پر ۱۹۶۷ء کی تاریخ پڑی ہے۔“ وہ اداسی سے کتاب کے سرورق

پر لکھے ہوئے نام کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا جس کی سیاہی دھندلی ہو چکی تھی۔

”تم تو اس عقیدت سے پڑھ رہے ہو گویا تاسی داس جی کمیونسٹ تھے۔“ سرل

نے کہا۔

”ہاں۔ بھگت ویاس بھی پارٹی ممبر تھے۔“ کمال نے اسی بنجیدگی سے جواب

دیا۔ ”انہوں نے لکھا ہے مہا بھارت میں کہ اگر بادشاہ ظالم ہو تو اس کے خلاف

بغاوت کرو۔ ایسا بادشاہ بادشاہ نہیں۔ اسے پاگل کتے کی موت مارنا چاہئے۔“

”واہ پنڈت جی۔“ سرل نے ہنس کر کہا۔ ”کیا بات ہے مگر یہ بتا دوں کہ اب

تم یہ رامائن مہا بھارت بھول جاؤ ورنہ آفت میں پھنسو گے۔“

”ہاں۔ یہ میں نے بڑی بے وقت کی راگنی چھیڑ دی۔“ کمال نے کہا۔

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ گزرے ہوئے برس بیسز کے گلاسوں میں ہلبلوں کی طرح تیرا کیے۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ سرل چپ چاپ بیٹھنا نیلی پھاڑیوں کو دیکھتا رہا جن کے اس پار برسات تھا۔

”کیوں بھائی، کیا سوچتے ہو؟“ کمال نے اسی الم سے پوچھا۔  
”کچھ نہیں..... سوچ رہا تھا کہ برسات اگر یہاں سے پاؤں پاؤں جلا جائے تو کتنی دور ہوگا۔“

”بس..... یہی سوچ رہے تھے؟“  
ایک آوارہ فاقہ زدہ کتا نیچے سے کود کر برآمدے میں آ گیا۔  
”دیکھو یہ بھی برسات سے آ رہا ہے۔“  
”یا برسات چاہتا ہے۔“ کمال نے کینے پن سے کہا۔  
کتا دم ہلاتا رہا۔

”ہلو..... ہلو..... لوکٹ کھاؤ۔“ سرل نے کتے کی خاطر کی۔  
”یار یہ تو ریڈ چائنا سے بھاگ کر آیا ہے۔“ کمال نے اسے غور سے دیکھ کر  
بڑی متانت سے کہا۔ ”ایٹنی کمیونسٹ کتا ہے۔ آزاوی کی تلاش میں یہاں پہنچا  
ہے۔“

سرل نے منہ لٹکا کر کمال کو دیکھا۔ ”تم اب بھی کالج کے زمانے کی سی باتیں  
کرتے ہو۔“

”اب بھی..... کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔“  
میز پر چائے کا سامان رکھا تھا۔ کمال نے ایک سینڈویچ کتے کے سامنے پھینکا اور



بولاً: ”نہیں سرل..... میں اب مشرف بہ اسلام ہو چکا ہوں۔ دیکھو میرا پاسپورٹ۔“ اس نے جیب سے سبز رنگ کا نیا نو بیڈا پاسپورٹ نکالا۔

”ریلے برادرز میں تو میں تم کو اس سے اچھی نوکری دلوادیتا۔“ سرل نے کہا۔  
”کیا کرنٹلی مل کی پلاننگ کرنے اے ہو تم؟ یہاں اکثر لوگ اس سلسلے میں آتے ہیں۔“

”میں جھک مارنے آیا ہوں۔ تم سے مطلب؟ تم بنگالی مزدوروں کا خون چوسنے کے لیے نہیں آن موجود ہوئے۔ سوپ بولے تو بولے چھلنی بھی بولی جس میں باون چھید۔ میں تو ہوں ہی زمانے بھر کا نمبر ایک کا بھگوڑا رجعت پسند۔“  
اب اس پر پھر اپنے ضمیر کا دورہ پڑنے والا ہے۔ سرل نے بڑے دکھ سے دوسری طرف منہ کر لیا۔

سرل ہاورڈ اسٹیلے ندیوں، پیراڑیوں اور گھنے جنگلوں میں سے گزرتا کلی صبح ہی یہاں پہنچا تھا، وہ سری منگل سے کاروبار کے سلسلے میں چا ”گام“ آیا تھا جہاں سے اس کی چاء ایکسپورٹ کی جاتی تھی۔

چا ”گام“ میں پھرول کی وحشت نے زور باندھا اور پیٹر پر کام کی دیکھ بھال چھوڑ کر اس نے پیراڑیوں کا رخ کیا، وہ دو ہزاری اور بندر بن اور چندر گونا کے جنگلوں میں مارا مارا پھرا دار رانگا مائی کے ڈاک خانے سے اپنے بھائی کو اس نے فرمانبرداری سے اپنی خیریت کا خط بھی بھیجا جس میں آسام اور سلہٹ اور چا ”گام“ کے علاقوں کی خوبصورتی پر اس نے روشنی ڈالی اور لکھا کہ امید ہے کہ اگلی کرسمس وہ اس کے ساتھ سلہٹ میں منائیں گے۔

یہ خبر سن کر سرل نے روز میری کو طلاق دے دی (اس کی وجہ کسی کو معلوم نہ تھی)۔ اس کے بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر گیا تھا۔ ان کو محسوس ہوا تھا کہ بوجھ میرا سے نکل کر ان کا چھوٹا بھائی بالآخر اپنی دنیا کو واپس لوٹ آئے گا۔ لارڈ موصوف نے نکلنے سے اپنا کاروبار سمیٹ کر اب بڑے پیانے پر مشرقی پاکستان میں روپیہ لگایا تھا جہاں ان کے چاء کے باغات بھی تھے۔ سرل، جواب کیمبرج سے نکلنے کے بعد روزگار کی تلاش میں لندن میں مارا مارا پھر رہا تھا، اسے ایک روز انہوں نے اپنے کلب میں بلایا اور بغیر تمہید اس سے کہا:

”میں تم کو پاکستان بھیج رہا ہوں۔“

”بہت اچھا۔“ سرل نے اسی انداز میں جواب دیا۔ اب زندگی میں مزید جھگڑا کرنے کی گنجائش کہاں تھی!

پچھلے چھ مہینے سے وہ پاکستان میں تھا۔ اسے لندن چھوڑنے کا زیادہ رنج نہیں ہوا۔ گوتم نیلمبر، ہری شنکر، کمال، مائیکل، سریکھا، سب لوگ پہلے ہی انگلستان کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے شنیلا دینی کوفون کیا اور طلعت کو بھی مگر طلعت گھر پر موجود نہ تھی۔

اب وہ سری منگل میں ایک بے حد خوبصورت بنگلے میں رہتا تھا۔ کام سے فرصت ملتا ہی ہندوستان کا چکر لگاتا تھا۔ دارجلنگ، شیانگ، کلکتہ، بمبئی، حیدر آباد کن، عمارتیں، کھنڈر، مکانات اسے طرح طرح کی کہانیاں سناتے۔

کل شام جب وہ ایک گکوڈا کے باغ میں گھنٹہ بھر چپ چاپ بیٹھے رہنے کے بعد سرکٹ ہاؤس واپس پہنچا تو ایک نوجوان کی پشت پر اس کی نظر پڑی جو پچھلے

برآمدے کی رینگ پر جھکا نیچے کرنا فلی ندی کو دیکھ رہا تھا۔

اس کے قدموں کے آہٹ پر اس نوجوان نے پیٹ کر سرل کو دیکھا۔

یہ نوجوان مال رضا تھا۔

کمال نے اسے اپنی داستان سنائی اور اسے مطلع کیا کہ وہ ایک لیبارٹری قائم کرنے کراچی سے ادھر آیا ہے اور سارے صوبے کا دورہ کرتا پھر رہا ہے۔

اب وہ صبح سے برآمدے میں بیٹھے تھے اور زندگی کا غم ان کے گلڑے گلڑے کیے ڈال رہا تھا۔

شام کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ ملازمین نے سرکٹ ہاؤس میں لیمپ روشن کر دیئے۔

چند روز قبل کھیدا ختم ہوا تھا۔ برابر کے کمروں میں ہاتھیوں کا ٹھیکہ دار ایک اینگلو انڈین مع اپنے اینگلو انڈین عملے کے ٹھہرا ہوا تھا جو شراب پینے کے بعد بے حد فلسفیانہ بات کرتا۔

رات کو نوجوان خوش مزاج افسروں کی ایک ٹولی شور مچاتی ہوئی آئی۔ ان میں سے دو ایک لڑکے علی گڑھ کے تھے۔ کمال کی ان سے علیک سلیک ہوئی۔ کھانے کی میز پر وہ بنگال کے مسئلے کا تذکرہ کرنے لگے۔

”بہت سے لوگ تو بس نام کے مسلمان ہیں۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”اچھا! میرا تو خیال تھا کہ اسلام کا یہاں بڑا زور ہے جتنا سارے برصغیر میں نہیں ہے۔ مثلاً اتنے نمازی اور اتنے سخت پردہ میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔“ کمال نے کہا۔

”.....سارا روپیہ یہاں کلکتے کی کمیونسٹ پارٹی سے آتا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”بنگلہ کا مسئلہ ہے.....نازک.....“

کمال چپ چاپ بیٹھا ان سب کو دیکھتا رہا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ سب اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔ سرل اور کمال پھر پچھلے برآمدے میں آ بیٹھے جس پر نارنجی پھولوں کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ سارے میں خاموشی چھا گئی۔ ندی جہاں مڑتی تھی وہاں پھاڑی پر پاؤں ہاؤس تھا۔ رات کے سنائے میں اس کی گھر گھر اہٹ بڑی صاف سنائی دیتی تھی۔ اس کے قریب بانس کا سینما ہاؤس تھا جس میں سے ”بیجو باورا“ کے گانوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ لتا کی آواز ندی کی سطح پر تیرتی ہوئی سرکٹ ہاؤس تک آ رہی تھی۔ کمال جنگلے پر سر رکھے اس آواز کو سنتا رہا۔ لتا کی آواز ایک ایسا مضبوط پل ہے جس نے دو دشمن ملکوں کو ایک دوسرے سے ملا رکھا ہے، اس نے سوچا۔

”تم نے لتا کو سنا ہے؟“ اس نے باواز بلند سرل کو مخاطب کیا۔

”وہ کون ہے؟“ سرل نے چونک کر کہا۔

کمال بوریٹ کے دریا میں غوطہ زن رہا۔

خانسا ماں کافی کی کشتی لے کر نمودار ہوا۔

کمال کی اس خانسا ماں سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔ کئی بار ان دونوں کا مختلف مسائل پر تبادلہ خیالات ہو چکا تھا۔

”کہئے خانسا ماں جی، کیا حال چال ہے؟“ کمال نے کہا۔

”مہربانی ہے حضور۔ آپ لوگوں کے آنے سے رونق لگتی رہتی ہے ورنہ اس جنگل بیابان میں کیا رکھا ہے۔“

”تم بڑی صاف اردو بولتے ہو۔ ڈھکیا ہو کیا؟“

”جی نہیں سرکار، ہم تو کلکتہ ہیں۔“

”اچھا۔ ہم بھی تھوڑے سے کلکتہ تھے ایک زمانے میں۔“

”جی حضور۔“

کمال نے ایک اور جمائی لی۔ خانساں جھک کر کافی بنانے لگا۔ سرل حسب معمول آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔

گورنر جنرل اور ان کی پارٹی کھیدا کے بعد بندر بن سے لوٹ کر کراچی واپس جا چکی تھی۔ ان کی آمد کے لیے باشاکا سرکٹ ہاؤس خاص طور پر آراستہ کر دیا گیا تھا۔ گورنر جنرل کی شان و شوکت دیکھ کر خانساں کو سر فریڈرک کا زمانہ یاد آ گیا جو بنگال کے گورنر تھے اور جب شکار کے لیے آتے تھے تو اسی طرح جنگل میں منگل لگ جاتا تھا اور خوب بخشیش ملتی تھی۔

”پچھلے دنوں تو یہاں بڑی چہل پھل رہی ہوگی۔“ کمال نے کہا۔

”جی حضور۔ آپ کو اس زمانے میں آنا چاہیے۔ دور دور سے صاحب لوگ آیا تھا۔ اب خوشی کی بات یہ ہے کہ بڑے لاٹ صاحب انگریز کے بجائے مسلمان ہیں مگر شان میں انگریزوں سے کم نہیں۔ اسی پر تو غیر لوگ جلتے ہیں۔ اسلام کی شان دیکھ کر حاسدوں کے آگ لگتی ہے۔“

”کون جلتے ہیں؟“ کمال نے پوچھا۔

”ارے صاحب“ اس نے چاروں طرف دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ”یہاں بڑا بڑا مفسد پڑا ہوا ہے۔“

”یہاں کہاں؟“ مال کو اس کے رازدرا نہ لہجے سے ایسا لگا جیسے ان گھنے جنگلوں میں بڑے جید کمیونسٹوں کی کمین گاہیں ہیں۔ ابھی ان کے گوریلا دستے اندھیرے سے نکل کر سرکٹ ہاؤس پر دھاوا بول دیں گے اور وہ بے چارا اپنا فرض منصبی انجام دیتا ہوا شہید ہو جائے گا۔

سرل کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ خانسا ماں نے کافی کے برتن اٹھا لیے، پھر خاموشی چھا گئی، کچھ دیر بعد ایک امریکن ڈرائنگ روم میں سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا بے تکلفی سے آن کے مال کے پاس بیٹھ گیا۔

”ہاؤ ڈی.....“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”ار..... ہاؤ ڈو یو ڈو.....“ مال نے ہاتھ ملایا۔

”میں جان مانی ٹس اہل جوئیر ہوں۔ مجھے جوئی کہو۔“

”ہلو جوئی۔ یہاں کیسے آنا ہوا؟“ پھر دفعتاً مال کو خیال آیا کہ یہ کیسا غیر ضروری سوال تھا۔

”میں چکر قبائل کے متعلق ایک ڈوکومنٹری فلم بنا رہا ہوں۔“

”او..... ہاؤ اکسا ٹینگ!“ مال اور مائیں پھیلا کر آرام کرسی پر لیٹ

رہا۔ ”سگریٹ؟“

”تھینکس۔“

دوسرے لمحے جوئی بھی فضا کے اس سحر میں کھو گھیا، وہ جنگے پر بازو رکھ کر ندی کو دیکھتا رہا۔ جوئی کی ہش ٹرٹ پر جو اخبار چھپے تھے سال آنکھیں کھول کر برآمدے کے مدھم اجالے میں ان کے الفاظ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا، پھر اس سے بھی اکتا گیا۔ دریا پر مکمل سکوست کے ساتھ کشتیاں گزر رہی تھیں۔ کبھی کسی ملحق کے گانے کی آواز بلند ہوتی تھی۔ ان کشتیوں میں چراغ جل رہے تھے۔ اب گھپ اندھیرا سامنے واوی پر چھا گیا تھا۔

پھر جوئی نے بڑے دوستانہ اور بھولے انداز میں سال سے باتیں شروع کر دیں۔ سال ہوں ہاں کرتا رہا۔ سرل نے ڈرینگ گارڈن پہن کر اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانکا اور سال کو امریکن کے ساتھ سرکھپاتا دیکھ کر چپکے سے غسل خانے کے راستے باہر نکل کر پہلو کے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے بھی دریا بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا اور کشتیوں کی روشنیاں لرز رہی تھیں۔ اندھیارا چکر کاٹتا سارے میں چھایا جا رہا تھا۔ برآمدے میں جوئی اپنی یکساں آواز میں سال کو بتا رہا تھا کہ وہ کچھ عرصہ قبل ہی مشرقی پاکستان آیا ہے لیکن انڈر ڈیولپڈ ممالک کا اسے خاصہ تجربہ ہے کیونکہ اس سے پہلے وہ ویت نام میں رہ چکا ہے۔ اس کی بیوی نیویارک میں پریس فوٹر گرافر ہے۔ ان کے دو بچے ہیں۔ اس نے جیب سے اپنے بیوی بچوں کی تصویر نکال کر دکھائی اور دیر تک اپنے چھوٹے بچے کا تذکرہ کرتا رہا۔ جو دو سال کا تھا، پھر اس نے ایشیا میں کمیونزم کے خطرے پر روشنی ڈالی اور سال کو بتایا کہ مسلم ممالک اپنی مذہبی اور روحانی طاقت کے ذریعے کمیونزم کے خلاف جہاد میں امریکہ کی بڑی مدد کر سکتے ہیں۔

”اب تو کافی پی لو۔“ کمال نے جمائی لے کر کہا۔

”نہیں۔ اب میں کھانا کھاؤں گا۔“ اس نے مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات پر گفتگو شروع کی۔ مال کو بڑا تعجب ہوا کہ مشرقی پاکستان کے متعلق ہماری تفصیلات، اعداد و شمار، ہر چیز اسے نوک زبان تھی اور اسے یہاں آئے صرف ایک ماہ ہوا تھا۔

اتنے میں دو اور امریکن رنگین بش شرٹ پہنے ڈرائنگ روم عبور کرتے ہوئے  
برآمد میں آ گئے۔ ایک دفعہ پھر تعارف کا سلسلہ شروع ہوا اور بہت اخلاق کی باتیں  
کی گئیں۔ یہ دونوں یو۔ ایس۔ آئی۔ ایس ڈھاکے کے افراد تھے اور اسی جونی کے  
ہمراہ رانگا مانی آئے تھے۔ لوکیشن ڈھونڈنے کے لیے وہ سارا دن چکمہ گاؤں میں  
گھومتے پھرے تھے۔ ان کے پاؤں گرد آلود تھے اور بہت تھکے ہوئے تھے۔  
بچوں کے ایسے جوش و خروش سے وہ کمال کو اپنے ایڈوچر سناتے رہے۔

”تم کو معلوم ہے۔ ریڈ چائنا یہاں سے کس قدر قریب ہے..... ان پھاڑیوں سے ذرا ہی آگے بڑھ کر.....“ جوینی نے ایک اور انکشاف کیا۔

سرکٹ ہاؤس کے خدمت گار نے آن کرا طایع دی کہ غسل کے لیے پانی لگا دیا گیا ہے، وہ سب اسی طرح باتیں کرتے اٹھ کر اندر چلے گئے۔

سرل نے منڈیا نکال کر پھر کھڑکی میں سے جھانکا۔

”گفتے تمہارے پیار دوست۔“

”آ جاؤ۔ اب میدان صاف ہے۔“ مال نے جواب دیا۔

سرل باہر آ کر اپنی آرام کرسی پر لیٹ گیا، وہ دونوں پھر اپنے اپنے مراتبے



میں ڈوب گئے۔ کمال اور سرل پانچ چھ دن وہاں رہے۔

سرکٹ ہاؤس کے نیچے کرناٹلی رواں تھی جس پر لکڑی کے بڑے بڑے گٹھے بہا کر چند رگونا کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر اینگلو انڈین ڈپٹی کمشنر کا بگلہ تھا۔ اس کی آرٹسٹ لڑکی جین سیفد ساری پہنے پہاڑیوں پر بیٹھی خاموشی سے تصویریں بناتی نظر آتی۔ بل کھاتے راستوں پر منگول شکلوں والے پہاڑی بوجھ پیٹھ پر اداے گزرا کرتے۔ سرکاری جیپ گاڑیاں زن سے نکل جاتیں۔ صبح شام مندروں میں گھنٹے بجتے۔ ہاٹ میں وادی سے آئی ہوئی چیزیں بکتیں۔ رنگ برنگے سوتی کپڑے، مونگے اور فیروزے کے ہار، چاندی کے زیور۔ لمبے لمبے پاپ پتی ہوئی ہنس مکھ پہاڑی عورتیں دکانیں لیے بیٹھی رہتیں۔ ہندو، مسلمان، بدھ۔ سب سکون اور قناعت سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اناس کے کھیتوں میں کٹائی کر رہے تھے۔ چاول اگا رہے تھے۔ عمیق خطرناک جنگلوں سے بانس کاٹ کاٹ کر نیچے لارہے تھے۔ اکثر کسی انتہائی ویران اور غیر آباد جنگل کی اونچی پگڈنڈی پر مال کو ایک بوڑھا تہہ باندھے ہر پر بانسوں کا بھاری گٹھا اٹھائے اپنا راستہ طے کرتا دکھائی دے جاتا۔ اس گٹھے کو بیچ کر وہ چند آنے کمائے گا۔ صدیوں سے وہ یہی کرتا آ رہا تھا۔ آج بھی اس کی حالت میں ذرا برابر فرق نہیں آیا تھا۔ جنگلوں میں چمکہ اور ماگھ اور مونگ قبیلے اپنے بانس کے جھونپڑوں میں زندہ تھے۔ میسوں میل کا فاصلہ طے کر کے ہاٹ کے لیے رانگا مائی آتے تھے۔ یہاں سڑکیں نہیں تھیں۔ یاریل گاڑیاں یا ہوائی جہاز کی سروس۔ یہ حسین ترین، پرامن علاقہ، وحشیوں کا ملک، کہلاتا تھا۔ یہ جگہ آنکھر و پولو جسٹ

کے لیے جنت ہے، جوئی کہتا اور ان کو اپنے ساتھ لوکیشن پر گھسیٹ کر لے جاتا۔ یا دونوں خود ہی جیپ پر بیٹھ کر ساگوان کے جھرمٹوں میں گھس جاتے اور پرندوں کی چہکار سنتے پھرتے۔ پہاڑی لڑکیاں سیاہ دھاری دار سیرنگ باندھے، گلریاں اٹھائے ان جنگلوں میں سے گزر جاتیں۔ کسی بھکشو کے مانجی لباس کی جھلک دکھائی دے جاتی۔ کرناٹکی کے دھارے پر انہوں نے دور دور تک کشتی رانی کی۔ بندر بن جا کر موگہ ریلوے سے ملے اور اس کا محل دیکھا اور وہ گھنے جنگل جن میں ہاتھی رہتے ہیں۔

”آسام میں اس سال جو سیلاب آیا تو بے شمار ہاتھی ہجرت کر کے یہاں آ گئے۔ ویسے بھی ان جنگلوں کی سرحد کا صحیح تعین کرنا بڑا مشکل ہے۔“ ایک افسر نے کمال کو بتایا۔

”تو گویا ان پاکستانی ہاتھیوں میں، جن کا کھیدا ہوا، مہاجر ہاتھی بھی شامل تھے؟“ کمال نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

انہوں نے بندر بن کے سارے علاقے کی سیر کی۔ انسانوں کو دیکھا۔ کمال ان کی زبان نہ سمجھتا تھا، وہ کمال کی زبان سے ناواقف تھے۔ یہ بھولے، معصوم لوگ جواب تک تقریباً پتھر کے زمانے میں رہ رہے تھے۔

ان جنگلوں میں خوبصورت جانور بھاگے پھر رہے تھے۔ چیتے اور گلدار اور بارہ سنگھے۔

یہ کیسی صاف ستھری، پاکیزہ دنیا تھی۔

ایک روز شام کو وہ رانگا مائی سے کرناٹکی کے اس پار راج باڑی گئے جہاں چکمرہ

رلبہ رہاتا تھا۔ یہاں گویا ہندوستانی ریاستوں کے دم واپسیں کا بڑا موثر منظرِ مال کو دکھائی دیا۔ باغ میں ایک چھوٹی موٹی توپ رکھی تھی۔ ایک مندر تھا۔ آم کے درختوں پر شام کی اداسی میں کونکلیں چلا رہی تھیں۔ سامنے معمولی سے محل میں مدھم بلب روشن تھے کیونکہ رائگا مائی کا پاور ہاؤس بے حد کمزور تھا۔

ہال میں رلبہ کے پرکھوں کی قد آدم روغنی تصاویر آویزاں تھیں۔ ”ان پرکھوں میں بنگال اور آسام کے مغل گورنر بھی شامل تھے۔“ سرل نے فوراً اس علاقے کی ہسٹری کی اس کرم خوردہ کتاب کا حوالہ دیا جو سرکٹ ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں رکھی تھی۔

انگلستان کے پڑھے ہوئے نوجوان رلبہ اور اس کی ماں نے سرل اور مال کا استقبال کیا۔

ڈرائنگ روم میں پیانو کے اوپر سادھنا بوس کی تصویر رکھی تھی۔ کیشپ چندر سمین کی تصویر آتش دان پر موجود تھی۔ راج ماتا کیشپ چندر سمین کی توتی اور سادھنا بوس کی بڑی بہن تھیں۔ ”کیشپ چندر سمین نے جب اپنی کمسن لڑکی کی شادی مہارلبہ کوچ بہار سے کر دی تو برہموتماج میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔“ مال نے سرل کے گوش گزار کیا۔

”ہاں۔ میں نے سچی دیوی، مہارانی کوچ بہار کی خود نوشت سوانح حیات پڑھی ہے۔ شنیلادہبی نے پڑھنے کو دی تھی جب وہ برہموتماج پر لپکھڑتی تھیں۔“ سرل نے آہستہ سے جواب دیا۔

”آپ پاکستان سے آئے ہیں؟“ راج ماتا نے پوچھا۔

کمال ایک لمحے کے لیے ہڑبڑا گیا۔ یہ بھی تو پاکستان ہے، پھر دوسرے لمحے اس نے صورت حال پر غور کیا۔ کیا یہ پاکستان نہیں ہے؟ کسی ملک کا تصور دراصل کیا ہے؟ یہ راج باڑی اب کس ملک میں شامل ہے؟ کیشپ چندر سین اب کدھر کھپتے ہیں؟

رانی صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں جو ایک خوبصورت سی سترہ سالہ لڑکی تھی جس نے ساری عمر دارجلنگ کے کاننٹ اسکول میں گزاری تھی، وہ دونوں فوراً تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے۔ کمال کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اب راجہ، جو کافی خوش شکل تھا، اوکسفرڈ کے لہجے میں سرل سے کہہ رہا تھا: ”حکومت کرنا فلی میں بند باندھ کر سارے صوبے کے کارخانوں کے لیے ہائیڈرو الیکٹرک کا ذخیرہ بنانے والی ہے۔ میرے قبیلے کے لوگوں کا علاقہ بھی زیر آب ہوگا۔ ان کو حکومت معاوضے دے کر کہیں اور بسا دے گی۔ یہ میرا مکان مع رانگامائی کے غرقاب ہو جائے گا۔“

”تغیر کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔“ کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

”ہاں۔“ راجہ نے کہا۔

راج ماما کلکتے کی باتیں کرنے لگیں۔ کمال کا ذہن پھر دور دور بھٹک گیا۔ بنگال کے راجپوتوں کا ماحول، بردوان، کوچ بہار، میمن سنگھ۔ یہ اس الف لیوی سلسلے کی ایک چھوٹی سی گمنام کڑی تھی جو اب ہائیڈرو الیکٹرک کے پانی کے ذخیرے میں غرق ہونے والی تھی۔

کمال اور سرل نے کچھ دیر بعد اجازت چاہی۔ راجہ اور راج ماما دروازے تک

پہنچانے آئے.....

”پھر کبھی ضرور تشریف لائے گا۔“ راج ماما نے مال سے کہا۔

”ضرور۔ خدا حافظ۔“

وہ باہر آ گئے۔ راج باڑی کی روشنیاں ٹٹمٹماتیں۔ کرناٹلی پر کشتیوں کا ٹریف  
اب کم ہو چلا تھا۔ رات بھیکتی جا رہی تھی۔

دوسری صبح وہ رائگا مائی کو خیر باد کہہ کر نیچے میدانوں میں اتر آئے۔

چٹا گانگ سے وہ ٹرین میں بیٹھ کر سینٹا کنڈ روانہ ہوئے۔

راستے میں نوجوان ٹکٹ چیکر کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور ٹکٹ دیکھنے کے بعد  
دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

تشریف رکھئے۔ سگریٹ لیجئے گا؟ مال نے کہا۔

اس نے ذرا بھونچکا ہو کر مال کو دیکھا اور پھر بھگتے ہوئے سیٹ کے کنارے پر  
ٹک گیا۔

”آپ یہیں کے رہنے والے ہیں؟“ مال نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ سپاری کے اس جھنڈ کے ادھر میرا گاؤں ہے۔“ ٹکٹ چیکر نے

جواب دیا۔

مال کو اور بہت سی باتیں معلوم ہوئیں: اس کو ٹی بی ہو چکی ہے۔ اس کی تنخواہ  
بہت کم ہے اور گھر کا خرچ بہت زیادہ ہے۔ پانچ بہنوں کی شادی کرنا ہے، وہ  
موجودہ وزارت سے مطمئن نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس کی سیاسی معلومات حیرت انگیز  
تھیں، وہ یونیورسٹی کے کسی جوشیلے طالب علم کی طرح مدلل گفتگو کر رہا تھا حالانکہ وہ

محض ایک مدقوق ٹکٹ چیکر تھا جس کی زندگی چھوٹی لائن کی ٹرین پر سفر کرتے گزرتی تھی۔

”پاکستان بننے سے پہلے فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبوں میں کوئی مسلمان نظر نہ آتا تھا۔ بنگالی مسلمان سماجی اور اقتصادی طور پر اس حد تک پس ماندہ تھے۔ آج آپ لوگوں کو فرسٹ کلاس میں سفر کرتے دیکھ کر میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔“ اس نے مال سے کہا۔

اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار مدھم ہونا شروع ہوئی۔

”آپ کو پتا ہے“ ٹکٹ چیکر نے کھڑے ہوتے ہوئے معاً مال کو مخاطب کیا، ”۷۴ء سے آج تک اس لائن پر چیکنگ کرتے مجھے اتنے برس بیت گئے۔ آپ پہلے بڑے افسر ہیں جنہوں نے مجھ سے اخلاق سے بات کی اور مجھے ایک باعزت انسان سمجھا۔ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

دوسرے لمحے وہ سرعت سے ڈبے کے باہر نکل گیا۔

کمال اور سرل اسٹیشن پر اترے۔ شام ہو رہی تھی۔ ہوا میں پھولوں کی خوشبو تھی۔

”ہم سیتا کے مندر جانا چاہتے ہیں۔“ کمال نے ایک آدمی سے پوچھا۔

”اب اس وقت نہ جائیے۔ پھاڑی کی چوٹی بہت اونچی اور پر خطر ہے۔ لوٹتے لوٹتے رات ہو جائے گی۔“ اسٹیشن ماسٹر نے آگے بڑھ کر کہا۔

”ہم ضرور جائیں گے۔“ سرل نے ضد کی۔

اسٹیشن ماسٹر نے ذرا ملاحظہ ہو کر اسے غور سے دیکھا۔ دس پندرہ لوگ جھکتے

ہوئے ان کے آس پاس جمع ہو گئے۔ یہ ایک بڑا سا خاندان تھا۔ اسٹیشن کا عملہ۔ پولیس کانسٹیبل۔ چاء کے اسٹال والا۔ گاؤں کے باشندے۔ مندروں کے سادھو۔ ان کی اس مکمل پرسکون دنیا میں یہ دو انوکھے اجنبی کہاں سے آن ٹپکے۔

فوراً بستی میں خبر پھیل گئی: دو یاتری آئے ہیں اور ان میں سے ایک انگریز ہے۔ (انگریز بھی یاتری ہی ہو گا ورنہ اس کا دماغ خراب ہوا تھا کہ جان جو کھم میں ڈال کر اتنی دور سیتاجی کی مقدس آگ کے درشن کرنے آتا؟) ایک پالکی لا کر پلیٹ فارم پر رکھی گئی۔ اس کے پردے ہٹا کر ساری کے گھونگھٹ میں سے ایک لڑکی نے بھی ان دونوں اجنبیوں کو حیرت سے دیکھا۔

سرل پالکی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔

”یہ ہمارے بڑے مولوی صاحب کی بیٹا ہے۔ اپنے سسرال واپس جا رہی ہے۔“ کاٹابڈ لٹنے والے نے بتایا۔

کانسٹیبل آگے بڑھا۔ ”آئیے آپ کو گاؤں تک پہنچا دوں۔“ اس نے کہا۔ گاؤں کے راستے میں اس نے بھی سیاسی گفتگو شروع کر دی۔ گرائی۔ مسلم لیگ کی سیاست۔ مصنوعی قحط۔ عوامی لیگ۔ اے۔ کے۔ فضل الحق۔ مال کا سرچکرا گیا۔ اس صوبے کا بچہ بچہ کتنے زبردست سیاسی شعور کا مالک تھا۔ گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں ایک لڑکا مال کے پیچھے چلنے لگا، وہ کانسٹیبل سے چٹا گانگ کی علاقائی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔

”پر فلا کہتا ہے کہ آپ کو کنڈ تک لے جائے گا۔“ کانسٹیبل نے کہا۔

”ہلو پر فلا۔“ سرل نے اس سے مصافحہ کیا۔

”تمہارا پورا نام کیا ہے؟“

کمال نے اس سے کلکتے کی بنگالی میں پوچھا۔

”پر فلا مار سو اس۔“

”اسکول میں پڑھتے ہو؟“

”جی نہیں۔ بھیتنی کرتا ہوں۔“

”یہاں آرام سے رہتے ہو؟“

”آرام سے کیوں نہیں رہوں گا؟“ پر فلا نے حیرت سے پوچھا۔

کمال خاموش ہو گیا۔

بازار کی کچی سڑک پر تازہ تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں پر لوگ جمع تھے۔ سب کی نظریں ان دونوں کی طرف تھیں۔ سفید دیو کی طرح سرل آگے آگے اس ننھے سے بازار میں داخل ہوا۔ کمال ایک چاء خانے کے سامنے رک گیا۔ صاف ستھرے بانس کی ٹیوں سے بنے ہوئے چاء خانے میں بلر نہیں تھا اور نہ غنڈہ پن کا ماحول اس پر طاری تھا۔ چند آدمی چادریں لپیٹے بچوں پر بیٹھے بنگالی اخبار پڑھ رہے تھے۔ کونے میں گراموفون بچ رہا تھا۔ دیواروں پر بنگالی فلموں کے اشتہار لگے تھے۔ یہ بالکل ایک دوسری دنیا تھی۔ ”ہمارے لیے خوب گرم چاء بنانا۔ ہم ابھی پیٹری پر سے واپس آتے ہیں۔“ کمال نے چاء خانے کے مالک سے کہا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے کیلے اور پھل لے کر خاطر کے لیے آن موجود ہوئے۔

”آپ یا تری ہیں۔ بڑی دور سے آئے ہیں۔ آپ کی خدمت ہمارا فرض



ہے۔“ ایک داڑھی والے مسلمان نے کہا۔

کمال حیرت سے یہ سب سنتا رہا۔ کیا ان ہی انسانوں نے نوا کھالی اور بہار میں ایک دوسرے کو ذبح کیا تھا؟ اس کا سر پھر چکرا گیا۔

پرغلا کی معیت میں انہوں نے پیماڑی کی اور بڑھنا شروع کیا۔ راستے میں خوبصورت جھونپڑے تھے اور سرسبز کنج۔ جگہ جگہ سرسوتی پوجا کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ گھاس پر اور مکانوں کے سامنے سرسوتی کی بے حد خوبصورت اور سب مورتیاں رکھی تھیں جن کو کمہاروں نے خشک ہونے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ مال ایک مورتی کے قریب زمین پر بیٹھ گیا۔ ”علم کی دیوی۔“ کنج پر سوار ہو کر ستار بجانے والی برہما کی بی بی۔ مادر کائنات۔“ اس نے کہا۔ ”ہم انسانوں نے تیرا کیا حشر کیا۔“

سرل بھی گھاس پر دوڑا نو بیٹھ گیا۔ ”تمہارے گاؤں کے مار کس قدر زبردست ماہر فن ہیں۔“ اس نے مورتی کو بغور دیکھ کر کہا۔

”ہاں۔“ کمال نے فخریہ جواب دیا۔

پھر وہ بانسوں کے جھنڈ میں سے نکل کر پیماڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ سامنے سرخ پتھر کا تالاب تھا جس کے چاروں اور سرخ مندر تھے اور سنگ سرخ کی چوڑی سیڑھیوں پر برگد کی شاخیں جھکی تھیں۔ چاروں اور ہو کا عالم طاری تھا۔

تالاب کا چکر کاٹ کر وہ ایک اور کنج میں داخل ہوئے۔ یہاں لڑکیاں ننھی ننھی جھیلوں کے کنارے بیٹھی تھیں۔ جھونپڑوں اور مکانوں پر ترگی کے زرد پھولوں میں بلیں پھیلی تھیں۔ درختوں سے معطر پھول گر رہے تھے۔

”یار یہ تو بالکل کسی ترقی پسند بنگالی فلم کا سیٹ معلوم دے رہا ہے۔“ کمال نے

کہا۔

”بنگل کے گاؤں سے زیادہ حسین مناظر اور کہاں ہوں گے۔ بنگالی استادوں کے ناول انہی خطوں کے عکاس تھے۔“ سرل نے جواب دیا۔

وہ پیارٹی کی سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔ اب ان کے دونوں طرف بے حد گھنے ٹروپیکل جنگل تھے اور عمیق غار اور کھڈ۔ جگہ جگہ سینکڑوں برس پرانے مٹھے درختوں میں چھپے کھڑے تھے۔ بھورے رنگ کے لرزہ خیز ڈراؤ نے معبد جن کی مقفل کوٹھڑیوں میں مہنت و فن تھے۔ مکمل خاموشی طاری تھی۔ عقیدتمندوں کے روپے سے بنائی ہوئی ہزار ہا شکستہ سیڑھیاں پیچ در پیچ خطرناک موڑوں سے گزرتی چوٹی تک چلی گئی تھیں جہاں گندھک کے ذخیرے میں ہزاروں برس سے آگ روشن تھی۔

”سیتا مہارانی کو راون نے لنکا سے لا کر یہاں چھوڑ دیا تھا۔“ پر فلا نے بڑے تحقیق اور عقیدت کے ساتھ میٹر آف فیکٹ انداز میں اس طرح مطلع کیا گویا یہ کل کا واقعہ ہے۔

چند سادہ ونشیب میں مندروں کے ایک جھنڈ کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ سرل اوپر پہنچ کر ایک درخت سے ٹک گیا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا۔ شکستہ سیڑھیوں کے نیچے جھرمٹا گر رہا تھا۔ شام کے گہرے سنائے میں پرندوں کی سیٹیاں، پتوں کی سرسراہٹ، پانی کی آواز اور شعلوں کی سنسناہٹ پجاریوں کے منتروں کی مدھم صداؤں میں گھل مل کر بلند ہوتی گئی۔ بہت دور، ونشیب کے گاؤں میں روشنیاں اندھی اندھی ٹمٹما رہی تھیں۔ پر فلا اطمینان

سے اچک کر درخت کی شاخ سے لٹک گیا۔ ”صاحب! ذرا دھیان رکھیے گا یہاں  
اڑو دھے اور کچھو بہت ہیں۔“

”اچھا۔“ سرل نے کہا، مگر ان دونوں نے بالکل دھیان نہ رکھا اور مزید  
سیڑھیاں طے کر کے ایک اور مٹھ تک پہنچ گئے۔

اب سورج ڈوب چکا تھا۔ اس کی کرنیں، جو اب تک پہاڑی کے جنگل پر  
طرح طرح کے رنگ بکھیر رہی تھیں، تاریکی میں گم ہو گئیں۔ اب واپس چلو، ہمیں  
دس بجے کی ٹرین پکڑنا ہے۔ کمال نے یاد دلایا۔

انہوں نے پہاڑی سے اترنا شروع کیا۔ آخری سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے ان کو  
ایک گھنٹہ لگ گیا کیونکہ تاریکی بہت گہری تھی اور ان کے پاس مارچ تک نہیں تھی۔  
گاؤں کے چاء خانے میں ان کا انتظار ہو رہا تھا، وہ اندر جا کر ایک صاف  
ستھرے بچہ پر بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے چاء اور دو دو پیسے والے لاسکٹ رکھے گئے۔  
میزبان لوگ ذرا شرمائے شرمائے، سہے سہے، مہمانوں سے ہٹ کر ایک طرف  
کھڑے ہو گئے۔

”سرل۔“

”ہاں۔“

”دنیا میں اس چاء خانے سے زیادہ خوبصورت جگہ تم نے کوئی اور دیکھی  
ہے؟“

”نہیں۔“ سرل نے آہستہ سے جواب دیا۔

پھر وہ باہر نکلے۔ بہت سے لوگ ان کو انٹیمیشن تک پہنچانے آئے۔ پر فلا پرانے

دوستوں کی طرح چپ چاپ ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گاؤں کے بچوں نے ان سے بخشش کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ پر فلا نے بھی انعام لینے سے انکار کر دیا۔ ایسا لگا جیسے روپے کی پیش کش کر کے مال نے اس کی دل شکنی کی ہے۔

”میں بھکاریوں کی دنیا کا رہنے والا ہوں۔ اگر کوئی بھیک مستر دکر دے تو مجھے متعجب نہ ہونا چاہیے؟“ مال نے کہا۔

”ہاں۔“ سرل نے جواب دیا۔

راستے میں ایک جھونپڑی کے برآمدے میں چراغ جل رہا تھا۔ مال ٹھٹھک گیا۔ دیکھوں یہاں کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے اندر جھانکا۔ ایک بوڑھا پھونس ہندو سفید براق دھوئی اور چادر لپیٹے مٹی کے دیے کی روشنی میں چند بچوں کو بنگالی قاعدہ پڑھا رہا تھا۔ بچے زمین پر بیٹھے تھے۔ گرد کے لیے انہوں نے ایک بوسیدہ چٹائی بچھا رکھی تھی۔ اجنبیوں کو دیکھ کر بوڑھا گھبرا کر باہر نکل آیا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”تم یہ منظر کبھی بھول سکو گئے۔“ سرل نے کہا۔

”نہیں“ مال نے جواب دیا۔

وہ اسٹیشن پہنچے۔ ٹرین آئی، وہ چٹا گانگ واپس پہنچ گئے۔ جہاں جگمگاتے کلب میں پیٹر جیکسن بار روم میں ان کا منتظر تھا۔

”آپ سینا کنڈ ہو کر آ رہے ہیں۔“ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ ”غضب خدا کا۔“ معلوم ہے وہ پساڑی، اثر دھوں، چیتوں اور خطرناک ترین بچھوؤں کا مسکن ہے، وہاں تو دن کے وقت بھی سمجھ داری آدمی بندوق لیے بغیر نہیں جاتے۔“

”مگر وہاں جو اتنے انسان بستے ہیں وہ؟“ مال نے اعتراض کیا۔

”اجی وہ آئے دن سانپ بچھو کے کالے سے مرتے رہتے ہیں اور پھر ان کا کیا ہے، وہ تو ہیں ہی جنگلی، وحشی، بن مانس لوگ۔“

دوسرے دن انہوں نے سلہٹ کا رخ کیا، وہاں سے سرل مال کو راج شاہی لے جا کر پھاڑ پور کے گپتا عہد کی سنگتراشی کے شاہکار دکھانا چاہتا تھا۔ سارے ملک میں چپے چپے پر جو پرانے مندر، مٹھ، مسجدیں اور درگاہیں بنی تھیں سرل کسی ماہر آرکیالوجسٹ کی طرح ان کے متعلق مال کو بتاتا رہا۔

”تم کو آرکیالوجی میں کب سے دخل ہو گیا۔“ ایک روز باریال جاتے ہوئے مال نے اداسی کے ساتھ اس سے پوچھا۔

”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔“ سرل نے اسٹیمر کی ریلنگ پر جھک کر سمندر کے ایسے وسیع دریا کی پر شور لہروں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا، ”کہ میرے پاس ماضی ہی ایسی چیز ہے جو محفوظ ہے، جسے دوسرے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے، جو وقت کی دسترس سے باہر ہے، میں خود اب ماضی ہوں تمہاری طرح اور ہندو پاکستان کے یہ پرانے کھنڈر ہی میرے دوست ہیں، میں ان کی زبان سمجھتا ہوں۔ اس دیوانے برصغیر میں صرف وہ ہی میرے ہم نوا ہیں۔ مورخین کے متضاد نظریوں کو مسٹر ذکر کے یہ اپنی رام کہانی مجھے الگ سے سنار ہے ہیں۔ میں ان کا واحد، تنہا آڈینس ہوں۔ یہ پتھر میرے دوست رہیں گے۔ مال، خدا را یہ نہ کہنا کہ میں ایک اور مغربی یورپین برطانوی ڈی جزیٹ ڈیکریٹنٹ انٹیکلچرل بن گیا ہوں۔ مجھے اب ان لیبلوں کی پروا نہیں رہی۔ میں اب سمجھ سکتا ہوں کہ لوگ روم اور بازنطیم میں پناہ کیوں ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں نے کائنات سے جو یہ نیا رشتہ قائم کیا ہے اپنی تلخی

جذبات کے ذریعے اسے توڑنے کی کوشش نہ کرنا۔“

سلہٹ میں وہ خوبصورت بل کھاتے پہاڑی راستوں پر سے گزرتے ایک روز سرحد تک گئے۔ سامنے لکڑی کا بڑے شہیر کا پھاٹک تھا جس کے اوھر پاکستانی سپاہی مستعد کھڑا تھا۔ شہیر کے دوسری طرف چند آسامی کاہلی سے کھڑے پان چبا رہے تھے۔ چند قدم پر آسام کی سرسبز پہاڑیاں تھیں جن پر خوبصورت مکان بنے تھے۔ مال لکڑی کے شہیر پر کہنیاں ٹیکے دیر تک خاموش کھڑا رہا۔

سلہٹ سے اگلے روز انہوں نے سری منگل کا رخ کیا، یہ بہت لمبا سفر تھا ندیاں اور گھنے جنگل اور موٹی بازار کا خوبصورت علاقہ عبور کر کے وہ سرل کے مستقر پر پہنچے۔ ایک نیچے سے ٹیلے پر سرل کا بنگلہ تھا جس کی روشنیاں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ اب رات ہو چکی تھی۔

یک لخت مال نے محسوس کیا کہ اس کا جانا پچھانا سرل کسی پراسرار طریقے سے پل کی پل میں بڑے صاحب میں تبدیل ہو گیا ہے۔ کار روک کر وہ سراٹھائے سامنے کی اور دیکھتا برساتی کی سیڑھیاں چڑھا۔ اس کے ملازمین کی پلٹن استقبال کے لیے لپک کر آگے بڑھی۔ برآمدے کے نیچے کھڑے ہوئے چند مزدوروں نے جھک جھک کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ اس نے آواز دی: ”عبدالرحمن، غسل کا پانی لگاؤ۔“ پھر وہ مال کو ساتھ لیے گیٹ روم کی طرف بڑھا۔

”یہ تمہارا کمرہ ہے۔“ اس نے کہا

بنگلہ شیر کی کھالوں اور جیتے اور بارہ سنگھے کے سروں اور بیش قیمت سا گوان کے فرنیچر سے مزین تھا۔ مال کو محسوس ہوا وہ ۱۹۲۸ء کے ہندوستان میں داخل ہو

گیا ہے اسے گل فشاں شدت سے یاد آئی اور اس کا دوسرا مکان خیابان جو وہ رہا  
دون میں تھا۔ عبدالرحمن کو دیکھ کر اسے امیر خان کا خیال آیا۔ سرل نے ڈرائیور کو  
پکارا تو سال نے محسوس کیا شاید میاں قدیر لپکے ہوئے آئیں گے۔

جلا وطنی..... جلا وطنی..... خداوند! تو نے مجھے کیوں جلا وطن ہونے  
دیا سال نے آرام کرسی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ڈرامنگ روم میں بیرے نے کھانا لگانا شروع کیا۔ سمارے ملازمین اپنی اپنی  
جگہوں پر کام میں سرعت سے مصروف ہو گئے۔

بنگالی منشی جی مزدوروں کا حساب کتاب لے کر برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔  
ٹریڈ یونین کا ایک فرد بہت دیر سے سرل کے انتظار میں برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھا  
تھا۔ ملازمین کا دستہ سرل کے غسل خانے سے برآمد ہونے کا منتظر تھا: بیرہ،  
خانسا ماں، خدمتگار، بوائے، اس کا یوریشین کلرک رالف جوزف برآمدے میں  
کافذات لیے کھڑا تھا۔ سرل صاحب کئی دن بعد لوٹے تھے اور بہت سے ضروری  
کافذات پر ان کے دستخط درکار تھے۔ کئی چہرے اسی ادھر ادھر موجود تھے۔ ایک تن تنہا  
سرل اور اس کے ذاتی عملے میں ان گنت آدمی شامل تھے: مالی اور گراس کٹ اور  
سائیکس اور ہشتی، چوکیدار۔ دریا پر اس کی اپنی موٹر لانچ تھی۔ اس سلطنت کا، جو  
سری منگل میں دور دور تک پھیلی تھی، سرل اپنے بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ کی  
شرکت کے ساتھ مالک تھا، وہ چاہتا تو ان سب کو الٹا لٹکا کر پٹوا سکتا تھا، وہی سرل  
جو کچھ عرصہ قبل کیمبرج میں بودیئر اور ایلپیٹ کی کتابیں لیے گھومنا کرتا اور کوہ نور میں  
مائیکل کے ساتھ جا کر آلو کھاتا تھا۔

صبح سات بجے چوکیدار نے بنگلے کے ہال کا دروازہ کھولا۔ دھوپ جھلملیوں میں سے چھن چھن کر اندر آنے لگی تو سرل اپنی مسہری سے اٹھا۔ مال اپنے کمرے سے نکل آیا تھا اور ڈرائیونگ گاؤن پہنے برآمدے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ ”یادِ صبح وطن دے رہی تھی ہوا..... داغ دل پھول بن بن کر کھلنے لگے.....“

میری پلکوں پہ بدرِ مال آ گیا۔“ اس نے زیر لب کہا اور لمبا سانس بھر کر ڈرائیونگ روم میں داخل ہوا جس کی دیواریں مکمل ڈے، اٹل بوس، ابانی سمین، رضا اور حسین کی پینٹنگز سے مزین تھیں۔ کونوں میں تانبے کے مجسمے رکھے تھے۔ الماریوں میں کتابیں چپی تھیں۔ بریک فاسٹ کے بعد وہ سرل کے ساتھ باہر نکلا۔ سرل نے سولہ سیٹ پہنی، وہ دونوں کاریں سوار ہوئے۔ پیٹر جیکسن اور رالف جوزف کی قیادت میں منشیوں اور کارکنوں کا جلوبس جیپ گاڑیوں میں پیچھے پیچھے چلا۔ سرل نے مال کو اپنی فیکٹری دکھائی جہاں چاء کی پیتیاں تیار کی جا رہی تھیں۔

دوپہر کوچ کے لیے وہ کلب گئے اور چند ساتھی پلانٹرز سے مارائن گنج کی شیئر مارکیٹ کے اس روز کے نرخ پر سرل نے تبادلہ خیالات کیا۔ سٹیٹس مین اور امرت بازار پتریکا اور ڈھاکے کے مارننگ نیوز پر نظر ڈالی۔ ابھی کھانے سے قبل بیسز کا دور چل رہا تھا کہ دفعتاً مال غائب ہو گیا۔

”مسٹر رضا کہاں گئے؟“ برآمدے میں آ کر سرل نے پیٹر سے پوچھا۔

”پتا نہیں۔ ابھی میں نے ان کو نورا الاسلام چودھری کے ہمراہ باغوں کی طرف جاتے دیکھا ہے۔“

”نورا الاسلام چودھری؟“ سرل خاموش ہو گیا۔



چودھری مزدوروں کا نمائندہ تھا اور رات سرل سے ملنے آیا تھا مگر سرل نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ صبح دفتر میں آئے۔

سرل کار میں بیٹھ کر مال کو ڈھونڈنے کے لیے نکلا۔ اپنی ٹی اسٹیٹ میں پہنچ کر وہ خاموش سایہ دار سڑکوں پر چکر لگاتا پھر اگلے مال کا کہیں پتا نہیں تھا۔ آخر اکتا کر اس نے ایک جگہ کاروک لی اور بے دھیانی سے جھاڑیوں کی طرف چلنا شروع کیا۔ موسم بے حد سہانا تھا۔ پرندے درختوں میں چہچہا رہے تھے۔ شاخوں میں سے چھنکتی ہوئی دھوپ نے چاء کی جھاڑیوں پر طرح طرح کے پیٹرن بنا دیئے تھے۔ چوڑیوں کی جھنکار پر اس نے معاً نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ ایک پوربن لڑکی بڑے ماہرانہ انداز میں پیتاں توڑ رہی تھی۔ بڑے صاحب کو دیکھ کر اس نے جلدی سے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ سرل مسکرایا۔ اس نے خیالات کے دھارے میں بہتے بہتے ایک لمٹے کے لیے ساحل پر آ کر سوال کیا:

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ہمرا نام؟ چمپا۔“

”چمپا۔“ اس نے طرح دہرایا گویا یہ نام آج پہلی مرتبہ سنا ہے۔  
”چمپا..... اچھا نام ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا پھر کار کی طرف لوٹ آیا۔

لڑکی ذرا تعجب سے اسے درختوں کی دھوپ چھاؤں میں اوجھل ہوتا دیکھتی رہی۔ وہ اور اس کی پچھلی نسلیں ہر طرح کے انگریزوں کو دیکھتی آئی تھیں۔ سکی، بد دماغ، بیہودہ، بے حد دارو پینے والے۔

یہ والا بڑا صاحب سبکی تھا۔

کلب واپس آ کر وہ دھڑام سے ایک آرام کرسی پر گر گیا۔ سامنے دیوار پر ملکہ الزبتھ کی تصویر آویزاں تھی۔ ایک تصویر میں شیر کے شکار کا سین تھا۔ ایک میم سفید ٹوپ پہنے احمقوں کی طرح بندوق سنبھالے ہوئے پر بیٹھی تھی۔ برابر میں مہاراجہ کوچ بہار رونق افروز تھے۔ میم کی شکل میں اسے اپنی وادی لیڈی بارن فیلڈ کی جھلک نظر آئی جو پچاس برس قبل اکثر ہندوستان آ کر مہاراجاؤں کے ساتھ ٹائیگر شوٹ سے شغل کیا کرتی تھیں۔ گڈ مارنگ! گرینی۔ آج کی صبح تم کیسی ہو؟ اس نے دل میں کہا اور پھر سوچنے میں مصروف ہو گیا کہ مال اس وقت کہاں ہوگا۔

شام کو سرل سے مال کے اعزاز میں ایک مخصوص سے ڈنر کا انتظام کیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔

”آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟“

”کہیں نہیں۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔“

”مزدوروں کی بہتی گئے تھے؟“

”ہاں“

”میرا یہی خیال تھا۔“

”تم ناراض ہو؟“

”نہیں تو۔ تم بھی اس نظام میں اتنی ہی حد تک شامل ہو جتنا میں۔ ناراضگی کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”یہاں مزدوروں کو صرف ایک روپیہ چار آنے نے مزدوری ملتی ہے؟“

”ہاں“

”کوئی ٹریڈ یونین نہیں ہے؟“

”نہیں“

”کوئی کمیونسٹ عناصر؟“

”پتا نہیں“

”بکواس مت کرو، تم کو سب پتا ہے۔“

”کمال کائنات کی ذمہ داری کا بوجھ میں نے بھی دنوں اٹھائے رکھا۔ آخر اسے اتار پھینکا تم بھی اس بوجھ سے سبکدوش ہو چکے ہو۔ پھر اس ہٹ دھرم کا کیا فائدہ۔ اس طرح کیا تم اپنے ضمیر کو تسکین دینا چاہتے ہو کہ تم مجرم نہیں ہو؟ تم بہت بڑے مجرم ہو کمال رضا، مجھ سے کہیں بڑے مجرم۔“

کمال خاموش رہا۔ سرل نے اٹھ کر اس کے لیے وہسکی اور گلاس نکالا۔

”پھر میں تمہارے جیسے ایک نہایت چغدا انسان سے ملا، وہ بھی تمہارے ساتھی پلانٹر ہیں شری نہار رنجن داس گپتا۔“ کمال نے کہا۔

”داس گپتا۔ اس سے تم کہاں ملے۔ واپس کلب گئے تھے؟“

”نہیں میں پیدل ایک پگڈنڈی پر سے آ رہا تھا۔ میرا سوٹ بوٹ دیکھ کر انہوں نے لفٹ دینے کے لیے کارروک لی، وہ ہی مجھے تمہارے مکان تک چھوڑ گئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تمہاری رح کے رئیس ابن رئیس ہیں۔“

سرل نے وہسکی دو گلاسوں میں انڈیلی۔ کمال کہتا رہا، ”میں نے ان سے پوچھا آپ ترک وطن کا ارادہ نہیں رکھتے۔ قہقہہ لگا کر ہنسے فرمایا، آپ بھی حد کرتے

ہیں۔ انڈیا گورنمنٹ ہر چیز کو قومی ملکیت بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ سرمایہ داروں پر  
دھڑا دھڑ بھاری بھاری انکم ٹیکس لگائے جا رہے ہیں وہ الگ۔ میرا دماغ خراب ہوا  
ہے جو ترک وطن کروں گا؟ یہ صاف گوئی قابل تعریف تھی۔“

سرل خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا: ”میں تم کو پھر یہی رائے دوں گا،  
دنیا بھر کی ہر چیز میں ناک ڈوبنے کی جو تمہاری عادت ہے اسے خدا را اب چھوڑ  
دو۔ ورنہ آفت میں پھنسو گے۔“

کمال وہسکی کے ہلبلوں کو دیکھتا رہا۔

دوسرے روز صبح وہ راج شاہی روانہ ہو گئے۔ کئی دن تک اس خوبصورت ضلع  
کی وسعتوں میں خاک چھانٹتے پھرے۔ دو رات دن سنہتال گاؤں میں پہنچے جہاں  
راستے اتنے خراب تھے کہ کئی بار ان کی جیب الٹے الٹے پگی۔ سنہتالوں نے کمال کو  
اور زیادہ مغموم کر دیا۔

”ان چاروں کے لیے تو میں ذہن میں بڑا رو میٹک تصور لیے بیٹھا تھا۔ لوک  
ناج اور زین العابدین کی مشہور معروف آبی رنگوں کی تصویر اور جانے کیا کیا۔“  
”اور اصلیت میں بوجہ اپنے افلاس یہ درختوں کی جڑیں کھاتے ہیں اور جنگلی  
جانوروں کی طرح زندہ ہیں۔ ہے نا؟“ سرل نے جیب چلاتے چلاتے مڑ کر کہا۔  
”میرا بھی شروع میں قدم قدم پر یونہی دل ٹوٹا تھا۔“

”جونی یہاں نہیں آیا اپنی مووی بنانے کے لیے۔“ کمال نے کہا۔

”یہاں بھی آجائے گا۔“ سرل نے اطمینان سے جواب دیا۔

سنہتالوں سے بھی ان دونوں کا بڑا دوستانہ ہو گیا۔ جس روز وہ لوگ واپس

لوٹ رہے تھے ایک گاؤں میں سارے سنتھال ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ ایک سیاہ فام بے حد دلکش لڑکی نے آگے بڑھ کر گیندے کے ہار ان کے گلے میں ڈالے اور ہاتھ جوڑ کر ان کے آگے جھکی۔ ان کا کھیا، جس کی مانگ کئی ہوئی تھی، جس سے اس نے لاٹھی باندھ رکھی تھی، ان کے اعزاز میں اپنی اکلوتی تار تار قمیض پہن کر ان کو رخصت کرنے بہتی کے موڑ تک آیا۔ ایک نوجوان نے تالاب میں سے سرخ کنول نکال کر سرل کو پیش کیا۔

رات کو وہ راج شاہی کے سرکٹ ہاؤس واپس پہنچے تو ڈرائنگ روم میں چند امریکنوں کی آوازیں آئیں۔

جونہی سنتھالوں کے متعلق ایسٹ میں کلر میں ڈاکو منتری بنانے کے لیے پہنچ چکا تھا۔

سرکٹ ہاؤس کے پہلو میں گنگا بہتی تھی۔ دوسرے کنارے پر مرشد آباد تھا۔ مرشد آباد؟ سراج الدولہ؟ کرنل کلائیو؟ کیا بے کار کی باتیں ہیں، وہ سنو۔ زن سے گولی چلی۔ کوئی اور اسمگلر مارا گیا، وہ دونوں گھپ اندھیری رات میں گنگا کے کنارے کنارے خاموش سڑک پر ٹہا کرتے اور آگے بڑھ کر ضلع کے اعلیٰ حکام کی کوٹھیاں تھیں اس کے بعد بازار چھوٹے چھوٹے چوراہے۔ گلیاں۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے اداس مکانات۔

”مکان کیسی کیسی کہانیاں سناتے ہیں۔“ سرل نے پھر دہرایا۔

سایہ دار کنجوں میں بڑے بڑے ہندو زمینداروں کی حویلیاں اور کوٹھیاں چھپی ہوئی تھیں جن میں سے بیشتر سمنان پڑی تھیں۔

”سنا ہے زمینداری ختم کر دی گئی ہے۔“ کمال نے کہا۔

سرل نے اسے پھر دیکھا۔ ”اب تم نے پھر ناک ڈھونا شروع کی۔“ اس نے ڈانٹا۔

وہ انٹیشن واپس جا رہے تھے۔

ڈھاکے واپسی میں پھر ٹرین دریا کے کھاٹ پر رکی۔ مسافر اتار کر اسٹیمر پر سوار ہوئے۔ ٹرین کا تجارتی مال اتار کر اسٹیمر پر چڑھایا گیا۔ یہاں کرین نہیں تھے۔ سینکڑوں قلیوں نے آواں یں لگا لگا کر سامان ڈھونا شروع کیا۔ اس طرح کی صداؤں کو مال نے IPTA والوں کے ساتھ خود کورس میں گایا تھا اور ترقی پسند فلموں میں اس طرح کے گیت سنے تھے مگر اب اسے معلوم ہو چکا تھا کہ سارا مشرقی بنگال ایک نہایت شدید حقیقت پرست، ترقی پسند فلم کے مناظر کا بہت بڑا Sequence ہے۔

جہاز پر داڑھیوں والے چند بوڑھے اور برقعہ پوش عورتیں آ کر قہر ڈکاس کے فرش پر بیٹھ گئیں، یہ بھی بڑا ترقی پسند فلموں والا منظر تھا۔ بے شمار بوڑھے ہندو اور مسلمان، شالیں اوڑھے، ان کی لڑکیاں اور بہوئیں گود میں بچے اٹھائے گینگ وے پر سے گزرتی سینڈ کلاس میں ٹخنس رہی تھیں۔

اب فرسٹ کلاس میں لوگ آ آ کر بیٹھنا شروع ہوئے۔ کیبن میں گئے، ٹیک پر بکھر گئے، دور بینیں اور کیمرے نکالے گئے، اخبار کھولے گئے۔ دواسمارٹ بیگمات نے ننگ شروع کر دی۔ چند امریکن، جو کسی دور افتادہ ضلعے میں ہو۔ ایس۔ آئی۔ ایس کی شاخ کھولنے جا رہے تھے، ایک نوجوان طالب علم سے

مصروف گفتگو ہو گئے، جو تعطیلات کے بعد ڈھاکہ واپس جا رہا تھا۔ ایک طرف دو بنگالی مولانا عوامی لیگ کی سیاست پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ ڈھاکہ کا ایک اردو اخبار نویس۔ یو۔ ایس۔ آئی۔ ایس والوں کی دعوت پر بحیثیت ان کے مہمان ان کا ہم سفر تھا۔ ایک اعلیٰ افسر کیمن میں بیٹھے تھے۔

کمال جہاز کے اس منظر کو دیکھتا رہا۔

یہ کیسا جھمیلنا تھا؟ یہ کیسی دنیا تھی جو وجود میں آگئی تھی؟ یہ کتنی کس نہج پر سلجھ گئی؟ اور اس سارے گھیلے میں کتنی لاکھوں جانیں تلف ہوئیں، کتنے گھر لٹے، کتنے لاکھوں انسان خانماں برباد اور جلا وطن ہوئے اور کتنے کروڑوں انسان جو پہلے بھوکے مرتے تھے اب بھی بھوکے مرتے ہیں۔

کمال ریلنگ پر جھک کر افق کو دیکھتا رہا جہاں تک صرف پانی ہی پانی تھا..... عظیم دریا، عظیم ملک، عظیم انسان۔ کیا یہ سارے انسان عظیم نہیں جو سلاخوں کے ادھر مرغیوں کی طرح ٹھنڈے بیٹھے تھے؟

اردو اخبار نویس ٹہلتے ہوئے کمال کے پاس آئے اور اپنا تعارف کر لیا۔

”آپ بھی مغربی پاکستان سے تشریف لائے ہیں؟“ انہوں نے پان کی ڈبیا نکالتے ہوئے دریافت کیا۔

”جی“ کمال نے مختصر جواب دیا۔

”کراچی؟“

”جی“

انہوں نے دوبارہ کمال سے ہاتھ ملایا۔ ”صاحب ہم تو یہاں یوں سمجھے کہ

کالے پانی میں پڑے ہیں۔ اپنے ہم جنسوں کے لیے بے اوقات آنکھیں ترس جاتی ہیں (یہ مغربی یو۔ پی کے رہنے والے تھے) سچ عرض کرتا ہوں قبلہ، اس خطے کو تو علیحدہ کر دینا ہی مناسب ہے۔ بالکل تھنوں میں دم کر رکھا ہے ہمارا ان لوگوں نے۔“

ایک نوجوان سرل سے باتیں کرتا قریب سے گزرا۔ اخبار نویس ایک ذرا کی ذرا رکے۔ جب وہ آگے چلا گیا تو بولے: دیکھا آپ نے انگریزی کیا جواب بولتے ہیں۔ بات کرنے کی تمیز نہیں۔ بس آگے جوٹ کونا میں۔  
 ”جوٹ کونا۔“ کمال نے حیرت سے دہرایا۔ اس نے یہ اصطلاح آج ہی سنی تھی۔

”جی ہاں صاحب۔ آپ کا قیام ڈھاکے میں ہے؟ شاہ باغ؟ اچھا کہیں اور ٹھہرے ہیں۔“

اب اعلیٰ افسر بھی کیبن سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے مال کو سگریٹ پیش کیا۔ دریا کا پانی سورج کی کرنوں میں سونے کے رنگ کا ہو گیا تھا۔ برابر سے ایک جوٹ کی بار برداری کرنے والی سیاہ رنگ کی مہیب کار گوبوٹ بڑی تمکنت سے تیرتی ہوئی نکل گئی مال مسحور ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

”کس قدر حسین منظر ہے۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

”جی ہاں،“ اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”ان مناظر کی پہلٹی کرنے کے علاوہ آپ کی مرکزی حکومت کو اور کوئی کام بھائی نہیں دیتا۔ مگر بس دور ہی سے یہ نظارے سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں رہنا پڑے آپ کو تو اصل حقیقت کھلے۔ ہم کو



”کچھ تین سال سے اس وحشی علاقے میں گویا قید تنہائی کی سزا بھگت رہے ہیں۔“  
”قید تنہائی؟“

”جی ہاں اور کیا۔ بالکل بیک ورڈ ملک ہے یہ ذرا یہاں کے باشندوں سے  
آپ کو سابقہ پڑے تو آٹے دال کا بھاد معلوم ہوگا۔ ایک سے ایک کاہل، سازشی،  
متعصب اور بے ایمان۔ ان پر حکومت کرنا اور ان کو قابو میں رکھنا بڑا دل گردے کا  
کام ہے۔“

کمال کو یاد آیا: اٹھارہویں انیسویں صدی کے انگریزی سفر ناموں میں اہل  
بنگالہ اور عموماً سارے نیٹوز کے لیے یہی الفاظ پڑھے تھے۔ اسے لگا گویا وہ  
اٹھارہویں صدی کے کسی انگریز کلکٹر کی معیت میں سفر کر رہا ہے۔

”یقین فرمائیے،“ اعلیٰ افسر نے بات جاری رکھی، ”جس روز یہ خطہ پاکستان  
سے علیحدہ ہوگا میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گا اور خوشی کے مارے سات روز  
تک ڈرنک رہوں گا۔ ان کی ہر شے ہم سے مختلف ہے۔ غیر اسلامی زبان بولتے  
ہیں۔ وزیراعظم کو پر دھان منتری اور امن کو شانتی کہتے ہیں۔ سنسکرت سے اپنا نام  
جوڑ رکھا ہے۔“

بیرے نے چاء لاکر میز پر رکھی۔ ”جہاں جگن ناتھ گھاٹ کو بے پہنچے۔“  
کمال نے اس سے پوچھا: ”امراؤنی کھن دھورے جہا جے روئے چھی۔“  
اخبار نویس اور اعلیٰ افسر دونوں نے اسے چونک کر دیکھا۔

”معاف کیجیے گا، آپ کے لب و لہجے سے میں سمجھا تھا کہ آپ بھی لکھنؤ کی  
طرف ہیں۔“ اخبار نویس نے کہا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ کمال نے مسکرا کر جواب دیا۔

”جناب کا اسم شریف تو اب تک پوچھا ہی نہیں۔“

”سید کمال رضا۔“

”آپ دنیا برج کے نواب علی رضا بہادر کے خاندان سے تو تعلق نہیں رکھتے؟“

”جی ہاں۔ انہی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔“

”اوہو..... ہو..... ہو..... بڑی خوشی قسمتی ہے میری کہ جناب سے ملاقات ہو گئی۔“ اخبار نویس نے تیسری بار کمال سے مصافحہ کیا۔ ”کیا لوگ تھے۔ صاحب کیا خاندان تھا۔ لکھنؤ کی کلچر کی آخری یادگار تھے یہ حضرات کلکتے میں۔ واہ..... واہ..... وہ زمانے ہی خواب خیال ہو گئے۔ سنا ہے نواب عباس رضا بہادر کا بھی انتقال ہو گیا۔“

”جی ہاں۔“

اعلیٰ افسر کی بیگم اور سانی گولڈز لگائے آرام کرسیوں پر دھوپ کے رخ بیٹھی تھی سانی فلم فیئر کے مطالعے میں مشغول تھی۔ سرل مقابل کی رینگ پر جھکا کھڑا تھا۔ اس کے سنہرے بال سورج کی کرنوں میں سونے کی طرح جگمگا رہے تھے اور وہ غیر معمولی طور پر حسین نظر آ رہا تھا۔

زینے کے دوسری جانب سیکنڈ کلاس کا عرشتہ تھا۔ ایک سیاہ فام اینگلو انڈین لڑکی جانی سے ٹیک لگائے بیٹھی ٹرو اسٹوری میگزین کے مطالعے میں مصروف تھی۔ اس کے قریب فرش پر اس کا بڑا سا دارجلنگ کا بنا ہوا بیگ رکھا تھا جس میں اس کی

ٹنگ، میک اپ کا سامان اور ایک مانی کا ڈبہ رکھا تھا۔ اسی بیگ میں چند ہالی ووڈ کے فلمی رسالے اور برطانیہ کا زمانہ رسالہ وومن اور ایک رومانی ناول ٹھنسا ہوا تھا۔ ناول کی چمکدار کاغذی سرورق پر ایک سنہرے بالوں والا ہیرو، مائیکلون کے نامٹ گاؤن میں ملبوس، ہیروئن کو گلاب کا پھول پیش کر رہا تھا۔ لڑکی نے کچھ دیر بعد سنہرا رومانی ناول نکالا۔ سرورق کے ہیرو کے دیکھتے دیکھتے ان کی نظر ہینڈسم انگریز تک پہنچی جو چالی کے ادھر ریلنگ کے سہارے کھڑا بالکل مارلن براؤنڈ معلوم دے رہا تھا۔ لڑکی نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر ناول پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

اس سانولی سلونی لڑکی کا پورا نام مس مارگریٹ ازابیل کرسٹینا میئر ڈیل تھا۔ یوں اس کے بوائے فرینڈ اور دفتر کے ساتھی اسے میگی کہتے تھے۔ گو اس کے اتنے لمبے چوڑے نام کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ خاندانی روایت کے مطابق اس کی پردادی مارگریٹ ازابیل، سرسرل ایشلے کی اور ایک نیو غورت کی اولاد تھی۔ سرسرل ایشلے پچھلی صدی کے بنگال کے بہت نامور آدمی تھے قحط کے زمانے میں اس کی ماں ڈھاکے سے کلکتہ آ کر نواب ایشلے کے حرم میں داخل ہوئی۔ مارگریٹ ازابیل نے بڑے ہو کر کانپور چھاؤنی کے سارجنٹ جارج میئر ڈیل سے شادی کر لی تھی جو اصل نسل گورا تھا اور بوجہ کثرت شراب نوشی جوانی ہی میں خدا کو پیارا ہوا۔ چنانچہ مارگریٹ ازابیل اپنے بچوں کو لے کر پھر کلکتہ واپس آ گئی اور اس کا خاندان کلکتے کے نچلے طبقے کی اینگلو انڈین سوسائٹی میں رل مل گیا۔

میگی میئر ڈیل کے ماں باپ دونوں مر چکے تھے، وہ گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں نیلی فون آپریٹر تھی اور چھٹی لے کر اپنی بیمار خالہ کو دیکھنے آتی ہوئی تھی جو کسی میں

رہتی تھی اب وہ کسی سے کلکتے واپس جا رہی تھی۔

وہ ناول کے کلائمیکس تک پہنچی ہی تھی کہ جس میں ہیرو اسپین جا کر ہیروئن کو ایک بدمعاش کاؤنٹ کے چنگل سے چھڑانے والا ہے کہ اسٹیمر کی سیٹی نے اسے چونکا دیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گھاٹ قریب آ رہا تھا۔ مسافر اپنا اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ فرسٹ کلاس کے عرشے پر کھڑا ہوا ہیرو بھی ہجوم میں غائب ہو چکا تھا۔ اس کا دل ڈوب سا گیا، اس نے جھک کر اپنی سینڈل کے تسمے باندھے۔ اپنے رنگین پھولدار سکرٹ کی سلوٹس ٹھیک کیں آئینے میں اپنے بالوں کے کرل سنوارے اور بیگ اور رسالے سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

سرل اور مال جہاز سے اتر کر کنارے پہنچے۔ مسافروں اور قلیوں کا جم غفیر ٹرین کی طرف بڑھا جو گھاٹ سے کافی فاصلے پر کھڑی تھی۔ گھاٹ پر ہندو عورتیں اشنان میں مشغول تھیں۔ چاروں طرف اہل ہندو کی ریل پیل تھی۔ متوسط طبقے کے خوشحال ہندو مرد اور عورتیں۔ غریب طبقے کے بد حال ہندو مرد اور عورتیں۔ کمال اٹیچی کیس اٹھائے سرل کے ساتھ ساتھ پٹری پر چلتا رہا۔ ”ان اصناف میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے۔“ سرل نے کہا۔

”یہاں کس قدر سکون ہے۔“ کمال نے دوبارہ کہا۔ ”دراصل میری سائنکولوجی اتنی خراب ہو گئی ہے۔ میرے ذہن اور اعصاب پر ہندو مسلم پرالہم اس تکلیف دہ شدت سے مسلط ہے۔ جب میں ان دونوں فرقوں کو کہیں پر سکون انداز اکٹھے زندگی گزارتے دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہاں فساد کیوں نہیں ہو رہا۔“

چڑھائی پر کالی ایگلو انڈین لڑکی سر جھکائے اس کے آگے آگے جا رہی تھی۔  
 ٹرین کے نزدیک پہنچ کر اس نے اپنا اٹیچی کیس زمین پر رکھا اور رومال سے چہرہ  
 پونچھنے لگی۔ قریب سے گزرتے ہوئے سرل نے اچھلتی سی نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے  
 کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ڈھاکے پہنچ کر مال اور سرل اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ روز شام  
 کو وہ کلب میں ملتے اور اکٹھے اپنی جائے قیام واپس لوٹتے۔ کام ختم کرنے کے  
 بعد سرل ڈھاکے کی گلیاں اور کوٹے کھدے سوگھٹتا پھرتا۔ تنگ و تاریک گلیوں میں  
 سے گزرتی ہوئی جھلملیوں والی بند گھوڑا گاڑیوں کو دیکھ کر فوراً ٹیگور اور سیٹا دیوی کے  
 ٹاولوں کا حوالہ دیتا۔ پیچ در پیچ قدیم محلوں میں سے نکلتے ہوئے ارمنی ٹولہ کے چار سو  
 سال پرانے قبرستان میں جا کر اس نے سارا دن ارمنی تاجروں کی قبروں کے کتبے  
 پڑھنے میں گزارا۔

اسٹیٹ بینک کی عمارت کے جغادری پیل پائے دکھا کر اس سے کمال کو بتایا کہ  
 یہ ڈیج ایسٹ انڈیا کمپنی کا اولین گورنمنٹ ہاؤس تھا۔

ایک روزہ ویز گھاٹ گئے جہاں دریا کے کنارے ایک شکستہ، کھنڈراہیسی دو منزلہ  
 کوٹھی میں بیل اکیڈمی قائم کی گئی تھی۔ ہال کے دروازے کے اوپر بیل کی تصویر  
 آویزاں تھی جس پر پھولوں کا ہار پڑا تھا، ہال میں اندھیرا تھا۔ اندر اور اوپر کی منزل  
 میں بڑے بڑے ڈھنڈا رلق وودق شکستہ کمرے پڑے بھائیں بھائیں کر رہے  
 تھے۔ زینے کی لکڑی پر برما کا انتہائی خوبصورت نقش و نگار کا کام بنا تھا، وہ سارے  
 کمروں میں گھومتے پھرے۔ نیچے ایک کمرے سے تھننگھروؤں کی آواز آئی، وہ

دونوں اندر گئے جہاں ایک اور خستہ حال کمرے میں، جس کی دیواروں سے پلاسٹر گر رہا تھا اور جس کا اینٹوں کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑ ہوا تھا، ایک چھوٹی سی دری بچھی تھی اور چند موسیقار ناچ کی گت بجا رہے تھے۔ چار پانچ لڑکیاں بنگالی مسلمان وائلن بجا رہا تھا۔ دہلے پتلے شری موئل مارمیترا اچک اچک کر لڑکیوں کو ناچ سکھانے میں مصروف تھے۔ مال دروازے کی چوکھٹ میں مسخوڑ کھڑا یہ منظر دیکھا کیا۔ اس شکستہ کمرے میں، اس ویران جگہ پر، یہ چند لوگ، جوان بوڑھے، باہر کی دنیا کے سارے دکھ اور کمینے پن اور ظلم و ستم اور مجبوریوں اور پریشانیوں کو فراموش کر کے تھوڑے سے لمحات کے لیے تال اور سر میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان میں کسی نے نوواردوں پر توجہ نہیں دی اور ناچنے اور ساز بجانے میں مصروف رہے۔ مال دہلے پاؤں وہاں سے لوٹا اور وسطی ہال عبور کر کے پچھلے پورٹیکو کی طرف گیا۔ دو لڑکیاں ماتھے پر کم کم کے بڑے بڑے ٹیکے لگائے دریا کے رخ، شکستہ سیڑھیوں پر خاموش کھڑی تھیں۔ سامنے ایک گائے گھاس چر رہی تھی۔ احاطے کی دیوار کے نیچے کشتیاں بندھی تھیں۔ اوپر کی منز میں برآمدے کے جنگلے پر دھوتیاں دھوپ میں سکھانے کے لیے پھیلی تھیں اور پیتل کی گڈوایاں چم چما رہی تھیں۔ یہاں کتنی بے پناہ، اتھاہ اداسی تھی۔ ان سب لوگوں کے چہروں پر کیا الم برس رہا تھا یا ممکن ہے وہ سب بے حد ہشاش ہوں۔ مال ہی کو ہر شے میں غم نظر آتا تھا، وہ سرل کو آواز دیتا ہوا باہر نکل آیا، وہ نواب پور روڈ کی رکشاؤں، چمکڑا ایسی بسوں، فقیروں کی ٹولیوں اور یونیورسٹی کے طلباء کے ایک احتجاجی جلوس میں گزرتے رہنا کی طرف واپس لوٹے۔

رئیس کورس کی سڑک پر ڈھا کہ کلب جگمگا رہا تھا۔ آج وہاں گیسٹ مائٹ تھی۔  
 اعلیٰ طبقے کی موٹریں باہر کھڑی تھیں اور بال روم میں بیگمات رقاصاں تھیں جو کلکتے  
 سے ساریاں خرید کر لاتی تھیں اور جن میں سے اکثر کے بچے دارجلنگ اور شیالنگ  
 کے انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لاؤنج میں بڑے بڑے تاجر  
 اور مل اونز بیٹھے تھے۔

ذرا آگے بڑھ کر نیا شاہ باغ ہوٹل تھا جس میں امریکنوں کی فراوانی تھی۔  
 دوسرے رومہ سرل کے ہمراہ لانچ کے ذریعے بوڑھی گنگا پر سرکاری کام سے  
 ایک اور ضلع کی سمت جا رہا تھا۔ سرل کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھتا رہا پھر معاً اس نے  
 مڑ کر سال کو مخاطب کیا:

”وہ سامنے درختوں کے جھنڈ دیکھتے ہو؟“

”ہاں“

”یہ بکرم پور ہے۔ یہاں سروجنی مانیڈو اور بی سی رائے وغیرہ کے بے حد  
 خوبصورت گارڈن ہاؤس ہیں اور بے حد خوبصورت مناظر ہیں۔ یہ گاؤں اب  
 سنسان پڑے ہیں۔ ان کے باسی مغربی بنگال ہجرت کر گئے۔ چلتے ہو دیکھئے؟“  
 ”میں قبرستانوں کی زیارت کرتے کرتے عاجز آ گیا ہوں۔ کیا تم مجھے جینے  
 نہیں دو گے۔“

”نہیں۔“ سرل نے جواب دیا۔

”مہاراجہ وکرم سین کی مانند، جو ایش کو کندھے پر اٹھائے مرگھٹ سے آتا تھا  
 اور ایش کا عفریت راستے میں وقت کاٹنے کے لیے روزانہ کو ایک قصہ سناتا تھا، تم

مجھے قہقہے سناتے ہو میں نہیں سنوں گا تمہارے قہقہے۔“ کمال نے ضد سے کہا۔

”وہ دو منزلہ گارڈن ہاؤس نظر آیا تمہیں؟“ سرل نے اسی طرح ساعل کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس میں رہنا تھا یوگور رہا کرتے تھے۔“

”چلو میں تم کو آج کا منظر دکھاؤں۔“ لانچ پانی پر چکر کاٹ کر نارائن گنج کی سمت مڑ گئی اور کمال نے ریلنگ پر جھک کر سرل کو مخاطب کیا:

”ہم آدم جی جوٹ مل جا رہے ہیں۔“ اس نے فاتحانہ انداز میں سرل سے کہا۔

”اور وہاں پہنچ کر تم مینجر کے ساتھ لانچ کھانے کے بجائے مزدوروں کی اجرت کے متعلق اعداد و شمار جمع کرنا شروع کر دینا، مفید کہیں کے!!“ سرل نے جواب دیا۔

کمال مسکراتا رہا۔ وہ ملز پہنچ گئے عظیم الشان کارخانے جن میں بہاری عورتیں اور بنگالی مزدور کام کر رہے تھے بھاری مشینیں شور مچا رہی تھیں۔ کمال مبہوت بنا مشینوں کو دیکھا کیا۔

پھر وہ لانچ میں سوار ہو کر واپس مڑے۔

ساحلوں پر بیل گاڑیاں پٹ سن کے گٹھے لادے آ رہی تھیں کسان تنکوں والی ٹوپیاں اوڑھے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ دریا کی سطح پر چاروں طرف چھوٹے بڑے اسٹیر اور لانچ رواں تھے جن کے انگریزی نام تھے: میری اینڈرسن، اینی لاری، لیڈی فلورا، روز ماؤنٹ۔ انگریزوں کے عہد کی یادگاریں۔ دریائی جہاز رانی آج بھی ایک برطانوی کمپنی کے ہاتھ میں تھی۔



لانچ دریا کے چوڑے دھارے پر چلتی رہی۔ آسمان کے اووے بادلوں میں سے سورج سرخ تلک کی طرح چمک رہا تھا۔ لہریں سورج کی کرنوں میں سونے کی ایسی جھلملانے لگیں۔ ہزاروں کشتیاں سطح پر حد نظر تک تیر رہی تھیں ایک بوڑھی عورت تیزی سے اپنا نوکا کھیتی ہوئی لانچ کے قریب سے نکل گئی۔ دریا پر ایک عظیم الشان، طاقت ور دنیا آباد تھی۔

مغرب کا وقت ہوا۔ کشتیوں میں چراغ جلے۔ پانی پر دیوالی منائی گئی۔ مانجھیوں نے اپنی اپنی کشتیوں میں نماز پڑھنا شروع کر دی۔ ہوا اٹھی اور روشنی کی مخالف سمت میں جاتے ہوئے کشتیوں کے بادبان سفید بگلوں کے پروں کی طرح پھٹھنٹھانے لگے۔

یہ سارا منظر ایک عظیم سمفنی تھا۔ بڑا گبیھر راگ تھا۔ سارا بنگال راگ میں ڈوبا تھا۔ دکھ کا راگ، موت کا راگ، زندگی کا راگ۔

رات کو رہنا کی سڑکوں پر مدھم روشنیاں ٹٹمار ہی تھیں۔ دور ایک مندر سے ایک ویشنو بھجن کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ سرل اور مال برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ساون کی گھٹائیں امنڈ کر اٹھی تھیں۔

سرل نے دوبارہ کتاب کھولی: ”ممالاب کے چاروں اور چمپا کے پھول کھلے ہیں۔ آسمان پر کالے بادل گرجتے ہیں۔ میرے جی میں جذبات کا دھارا موجیں مارتا ہے جیسے اگست کے مہینے میں ندی میں بہیا آ جاتی ہے۔ ندی تو تو نہیں جانتی کہ کدھر کو جا رہی ہے، پھر اتنی تیزی سے کیوں بہتی ہے؟ اوگھڑے! پانی میں بوند کی طرح ڈوب جا۔ میں بھی تیری طرح اٹھا سمندر میں ڈوب چکی ہوں۔“

سرل قرون وسطیٰ کے بنگال لوک گیتوں کے صفحات پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ باہر اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا جو صرف بنگال کی بھیگی فضاؤں میں رات کے وقت گھنے باغوں پر چھاتا ہے۔ لیمپ کی مضحکہ خیز زرد روشنی برآمدے میں پھیلی ہوئی تھی۔ دفعتاً بجلی کی چمک کے ساتھ زور کی گھٹا اٹھی اور ہوا چلنی شروع ہو گئی۔

”میں کل صبح انڈیا کے راستے کراچی کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔“ کمال کہہ رہا تھا۔ سرل چونکا۔

”معلوم ہے۔“

”تم سے تو اکثر ملاقات ہوتی رہے گی۔“

”ہاں۔“

ہوا کا جھکڑ تیز ہو گیا۔ برآمدے کے نیچے اسوک کی شاخیں سرسراہٹ لگیں۔

”اسوک کا درخت!“ سرل نے گوجا سے مخاطب کیا۔ ”جسے کوئی حسین لڑکی چھولے تو اس میں فوراً پھول کھل جاتے ہیں!“

کمال نے بارش کی پھوار سے بچنے کے لیے کرسی اندر کو گھسیٹ لی۔

”کوا کالا ہے۔“ سرل نے پڑھا۔ ”کول اس سے زیادہ کالی ہے اور خبا کھالی ندی کا پانی اس سے بھی زیادہ کالا ہے۔ پر اس کے بال سیاہ ترین تھے۔“

بارش کی بوندوں نے باہر تالاب میں جل ترنگ بجانا شروع کر دی۔ بجلی چمکی تو باغ کا ایک ایک پتہ ایک پل کے لیے اس میں جگمگا اٹھا۔

”چمپک کے درختوں کے پار، بوڑھی گنگا کی موجیں بیکار شور کر رہی ہیں۔“

سرل نے کہا۔ ”ان سے کہہ دو کہ میں نے تمہاری آواز کی طرف سے کان بند کر

لیے ہیں میں اپنی کشتی کنارے سے باندھ چکا ہوں۔“

”اچھا میں کہہ دوں گا۔“ کمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

دوسری صبح کمال نے سرل ایشلے کو ڈھاکے میں چھوڑا اور فلاننگ کلب کا طیارہ لے کر کلکتے پہنچا۔ اس نے سوچا اپنے مرحوم ماموں نواب عباس رضا بہادر کے گھر والوں سے ملنے دت ہاؤس جائے مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور ٹرین میں بیٹھ کر لکھنؤ روانہ ہو گیا۔

وہ ہوڑہ اسٹیشن پر ایک پولیس افسر کو اپنی اور آتے دیکھ کر ہڑبڑا گیا اور اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ویزا اور پاسپورٹ کے کاغذات کو چھوا اور مطمئن ہوا کہ وہ غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل نہیں ہو رہا ہے۔ ٹرین چلا گئی۔ بردوان، آسنسول، پٹنہ، مغل سرائے، الہ آباد، لکھنؤ، ٹرین ایک اجنبی سرزمین میں چل رہی تھی۔ سال بھر قبل یہ اس کا اپنا ملک تھا، اب اس میں وہ ایک غیر ملکی کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا۔ اسے لگا لوگ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ سب کی آنکھیں اسی کی طرف ہیں۔ تم پاکستانی ہو۔ تھانے چلو۔ تم پاکستانی ہو۔ مسلمان۔ جاسوس۔ مسلمان جاسوس۔ ٹرین کے پہیوں میں سے یہی آواز نکل رہی تھی۔ غدار۔ جاسوس۔ غدار جاسوس۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ ٹرین حسب معمول بڑی شان و شوکت کے ساتھ چارباغ جنکشن میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

چارباغ۔ لکھنؤ۔ لکھنؤ۔

دو دن وہ عزیزوں کے پاس ٹھہرا۔ اب اسے خیابان کے کلیم کی خانہ پری کے

سلسلے میں ضروری کاغذات لینے دہرہ دون جانا تھا۔ تیسرے دن وہ لکھنؤ سے چلا۔  
 (یہاں اب کیا رکھا تھا، وہ کس کے لیے یہاں ٹھہرتا، وہ بدل چکا تھا لہذا لکھنؤ بھی  
 بدل گیا تھا) جب ٹرین مراد آباد کے قریب پہنچی تو اسے معایا دیا کہ لکھنؤ میں سینتا  
 ڈکشت نے اسے بتایا تھا کہ چمپا ولایت سے لوٹ آئی ہیں اور اپنے چچا کے پاس  
 مراد آباد میں مقیم ہیں۔ اس اطلاع پر مال نے ویزا پر مراد آباد کا اضافہ کروالیا تھا۔  
 ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچی تو وہ اپنا سامان اٹھا کر گاڑی سے اتر آیا۔ اسٹیشن سے  
 باہر آ کر اس نے ایک تانگہ لیا اور سینتا ڈکشت کا بتایا ہوا پتہ دیکھنے کے لیے جیب  
 سے نوٹ بک نکالی۔ پھر اس نے تانگے والے سے کہا: ”کچھ گھر چلو۔“

تانگہ روشن بازاروں اور کالجوں اور ہسپتالوں کی بلند عمارتوں کے سامنے سے  
 گزرتا ایک سمت کو چلا۔ سڑک پر خیلے چل رہے تھے اور پردے دار ریڑوے اور  
 ڈولیاں اور یکے۔ لڑکے بالے۔ برقعہ پوش عورتیں سلیم گھسیٹتی گلیوں میں گھس رہی  
 تھیں۔ تانگہ اب ایک محلے میں داخل ہوا جو شاید مال کی منزل مقصود تھی۔  
 دروازوں کے آگے ٹوٹے پھوٹے چبوترے تھے اور مسجد کی منڈیر پر ایک چیل بیٹھی  
 اونگھتی تھی، یہ چمپا باجی کا محلہ تھا؟

وہ تانگے سے اتر اسامنے بڑا سا پرانے وقتوں کا پھاٹک تھا جس کے دروازے  
 میں ایک چھوٹی کھڑکی کھلتی تھی۔ اندر سلین تھی اور بھوسے کا ڈھیر۔ دو تین کھٹیاں  
 پڑی تھیں۔ اندر ایک اور بے حد تنگ و تاریک زینہ تھا جو شاید اٹھارہویں صدی  
 میں بنا ہو گا پھاٹک میں وہ چاروں طرف آوازیں دیتا پھرا، جب کسی نے اس کو  
 جواب نہ دیا تو وہ ہمت کر کے خود ہی اس زینے پر چڑھ گیا۔ دوسری منزل پر چھوٹا

سا آنگن تھا جس میں چینی کے گئے رکھے تھے۔ سامنے برآمدہ تھا اور ایک بڑا کمرہ  
 جو شاید اس گھر کی بیٹھک کا کام دیتا ہوگا۔ اس میں صرف ایک کرسی پڑی تھی اور  
 ایک مسہری۔ ایک الماری میں خدائی فوجدار اور اودھ شیخ کی جلدیں رکھی تھیں۔  
 دروازوں میں ان گنت اودے، مارنجی، سبز اور سرخ شیشے لگے تھے۔ باہر کے رخ  
 چھبھا تھا جو پھاٹک کے عین اوپر شہ نشین کی طرح نظر آتا۔ چھبے میں کھڑے ہو کر  
 اس نے پچھم کی اور نظر ڈالی۔ گلی بے حد صاف تھی، اس نے غور سے دیکھا۔ نیچے  
 مسجد میں پیش امام نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی جاء نماز کے سامنے سجدہ گاہ کے قریب  
 تام چینی کی رکابی میں کچھ رکھا تھا اور محلے کے تین چار لڑکے بالے ”بٹ کلبی، بٹ  
 کلبی“ کہہ کر ان کو چڑا رہے تھے۔ امام صاحب سلام پھیر کر جلدی سے اٹھے۔  
 لڑکوں کو ڈھیلے سے مار بھگانے کے بعد پھر جاء نماز پر واپس چلے گئے، ناقابل بیان  
 سنا سارے میں طاری تھا۔ اسی مکان کے دائیں ہاتھ ایک سرسبز ڈھلان پر  
 قبرستان تھا۔ اسے ایک جھمر جھری سی آتی۔ زندہ روحیں، مری ہوئی روحیں، یہاں  
 کتنی محسوس تھی۔ مردوں کا شہر۔ چمپا باجی تم یہاں کہاں ہو؟ قبرستان کے سرے پر  
 چھپر تھا اور نیم کا درخت جس کے نیچے بکری بندھی تھی۔ چھپر کے اوپر کھڑی میں  
 سے کوئی لڑکی جھانک رہی تھی۔ مال کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے جھٹ کھڑکی  
 بند کر دی۔ وہ زینے سے نیچے اتر کر دوسرے پھاٹک کے سامنے آیا۔ اس کی بھی  
 وہی وضع تھی۔ رنگ برنگے شیشوں والا شہ نشین۔ نیچے دربان کے کھڑے ہونے  
 کے لیے طائفے، شکستہ چبوترہ۔ اس نے پھاٹک کی کنڈی کھٹکائی۔

”کون ہے؟“ اندر سے آواز آئی۔

مایوسی اور ڈپریشن کی وجہ سے مال کے حلق سے آواز بھی نہ نکلی۔  
”کون ہے؟“ دھاری دار گہروں کا سیاہ تنگ پانجامہ پہنے ایک بڑھیا نے اندر  
سے جھانکا۔

”میں ہوں۔“

”گے کیا بات ہوئی۔ اے نام تو بتاؤ بھئیے۔“

”میں ہوں مال رضا۔ پاکستان سے آیا ہوں۔“

بڑھیا نے کچھ دیر بعد واپس آ کر کھڑی کھولی۔

”آؤ۔ آ جاؤ میاں۔“ اس نے کہا

وہ اندر آ گیا۔ انگلتانی میں اینٹوں کا فرش تھا۔ دیوار کے ساتھ کیاری میں کسی  
زمانے میں پودے رہے ہوں گے، اب وہ ویران پڑی تھی۔ باورچی خانے کے  
سامنے مرغیوں کا ڈربہ تھا۔ مرغیوں کے پر ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ سامنے بڑا  
والان تھا۔ والان میں تخت، اس پر چمپا بیٹھی تھی۔

”ارے ہلو۔ مال، بھئی حد ہوگئی!“

”چمپا باجی!“

”تم! گڈ گاؤ!!“ وہ آہستہ سے اٹھی اور معذرت طلب انداز میں جلدی جلدی  
تخت پوش ٹھیک کرنے لگی۔

”میں سامنے والے مکان میں گھس گیا تھا۔“ مال نے کہنا شروع کیا۔

”میرے گھر والے سب چچا میاں کے یہاں گئے ہوئے ہیں، وہیں چلو،

وہاں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

اس نے الگنی پر سے دلائی اتاری اور اسے بڑے سلیقے سے اوڑھاتا کہ سر سے پاؤں تک دلائی اسے ڈھانپ لے اور گھونگھٹ سا نکال کر مال کے ساتھ گلی میں آ گئی۔ ”ہمارے یہاں برقعے کا رواج نہیں ہے اب تک چادریں اور دالائیاں ہی اوڑھی جاتی ہیں۔“ اس نے گویا تشریح کی، وہ قدیم مسجد کے پاس پہنچ کر دوسری گلی میں مڑ گئی جو قبرستان کی ڈھالان کے برابر سے گزرتی تھی، یہ بھی بے حد صاف ستھری تھی۔ دیواروں میں گھاس اور پتیل کے درخت اک آئے تھے۔

”یہ؟“ مال نے قبرستان کی طرف اشارہ کیا۔

”ہم ہی لوگ ہیں۔“ چپا نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جواب دیا۔  
”یہیں جیتے ہیں اور یہیں مریں گے۔“ اس نے کچھ توقف کے بعد اضافہ کیا۔

چند قدم چل کر ”دیوان خانہ“ آ گیا۔

”چچا میاں کا مکان؟“

”ہاں۔“

وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ آنگن میں بہت سے تخت بچے تھے۔ ویرانی کی شدت سے جگہ سنسنار ہی تھی۔

”یہاں تو کوئی بھی نہیں رہتا؟“ مال نے ذرا دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔

”نہیں“ چپا نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”یہ امام باڑہ ہے، یہ جو تخت پرے ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے اس میں ہمارے یہاں کی مشہور تختوں کی مجلس ہوا کرتی تھی۔“

اب انہوں نے پھر ماضی کی گردان شروع کر دی، مال نے بولکلا کر سوچا۔

”اصل مکان اندر ہے۔“ چمپا نے بات جاری رکھی۔ ”چلے آؤ۔ تم سے پردہ کوئی نہیں کرے گا۔“

وہ ڈیوڑھی میں سے گزرتا اندر چلا گیا۔ صحن میں کرسیاں اور چار پائیاں بچھی تھیں، ایک چار پائی پر کڑھا ہوا پلنگ پوش پڑا تھا۔ باورچی خانے میں بگھار کی تیز مہک آ رہی تھی، دو تین غیر واضح، غیر اہم سے لوگ ادھر ادھر بیٹھے تھے۔ بادل گھرے ہوئے تھے مگر ہوا بند ہونے کی وجہ سے شدید جس ہو گیا تھا، برساتی کیڑے چرغوں کے چکر کاٹ رہے تھے۔

”چا ابا..... یہ مال ہیں.....“ نیم تاریکی میں چمپا کی آواز آئی۔  
”آؤ..... آؤ..... بیٹھو میاں..... بڑی عزت افزائی کی تم نے ہماری۔“ چا ابا نے، جو پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے، اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

الٹین اٹھا کر ایک لڑکی باورچی خانے کی اور لپکی۔ ایک اور لڑکی دالان میں میز پر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ یا اللہ! مڈل کلاس اس قدر ڈیپر اینگ ہوتا ہے؟ کمال نے لرز کر سوچا۔ آنکھیں میں آنے والوں کی آہٹ سن کر دالان والی لڑکی نے نظریں اٹھا کر مال کو دیکھا۔ مال نے جلدی سے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے مسلمان مڈل کلاس لڑکیوں کے فرسٹریشن اور رومان پرتی کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا اور وہ ہرگز نہ چاہتا تھا کہ یہ لڑکی یا وہ لڑکی جو باورچی خانے میں اس کے لیے چاء بنا رہی تھی اس کے ساتھ وقتی رومان شروع کر دیں اور بعد میں اسے لمبے لمبے کھرے لکھا کریں۔ محبت نامے۔

اس کی کوفت میں اضافہ ہوتا گیا۔



”یہ میری کزنز ہیں دونوں۔“ چمپا اسی آواز میں پانہنتی بیٹھی اُسے بتا رہی تھی۔  
”وہ والی زیب النساء ہیں انہوں نے دلی سے لائبریری سائنس میں ایم۔ اے کیا  
ہے۔ چھوٹی والی مریم زمانی ہیں، یہ اگر یکل پڑھیں ایم۔ ایس۔ سی کر رہی ہیں۔ جب  
میں انٹر کے بعد لکھنؤ پڑھنے گئی تھی یہ دونوں کی دونوں بالکل ذرا ذرا سی تھیں۔ کس  
قدر تیزی سے گزرتا ہے، تم کو چپ کیوں لگ گئی؟“  
”کچھ بھی تو نہیں چمپا باجی۔“

پھر چچا میاں اس سے آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ وہی پرانے قصے۔  
پاکستان، ہندوستان ہماری تو میاں بدھیا بیٹھ گئی۔ انہوں نے کہا۔  
”یہاں اتنا سنا کیوں ہے؟“ کمال نے گھبرا کر پوچھا۔ پھر اسے اپنی بیوقوفی  
کا احساس ہوا۔

”ساری آبادی کہاں چلی گئی۔“

”وہیں جہاں تم چلے گئے۔“ چچا میاں نے جواب دیا۔ ”کھوکھرا پار کے  
راستے سے سب نکل لیے، روئیل کھنڈ خالی ہو گیا۔ بس ہم چند بڈھے ٹھڈے باقی  
رہ گئے ہیں۔ دو تین سال کی بات اور ہے، جب ہم مرجا کیلے تو یہاں ہمارے بعد  
گدھے لوٹیں گے۔“

کمال اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ مریم زمانی نہایت بے تعلقی سے چاء بنا کر لارہی تھی۔  
اس کا رومان شروع کرنے کا ارادہ معلوم نہیں ہوتا۔ کمال نے ذرا اطمینان اور ذرا  
مایوسی سے سوچا۔

”پاکستان کے کیا حال ہیں؟“ چا لبا پوچھتے رہے۔ ”سنا ہے یہاں سے دہکنے

جولا ہے جا کروہاں لکھ پتی ہو گئے، اپنے کو سید کہویں ہیں اور کوٹھیوں میں رہیں ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے میاں؟ میرے بھانجے نے لکھا ہے کہ وہاں ہر جگہ پنجابیوں نے یو۔ پی۔ والوں کا نا طقہ بند کر رکھا ہے اندھیر گردی مچی ہے۔ میاں ہم تو تباہ ہو گئے تباہ اور وہاں بھی کون سے لڈو مل جائیں گے۔ میرے بھانجے کا خط کل ہی آیا ہے، جہلم سے، اس نے شعر لکھا ہے، وہ کیا شعر ہے زیبا بیٹی؟“

غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا  
 ہنسی..... ہنسی۔ انہوں نے کرسی پر پہلو بدلا۔ ”مریم سکت بھی تو لاؤ بھئیے کے لیے۔ کمال میاں اسی ڈیوڑھی پر چار چار ملازم موجود تھے، اب یہاں سارے میں الو بول رہا ہے۔“

کمال چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس نے مسلمان قوم کے متعلق پھر اپنی محبوب تھیوری دل میں دہرانا شروع کر دی۔ یہی بڑے میاں ۴۶ء میں سٹی مسلم لیگ صدر رہے ہوں گے۔ سن اڑتالیس تک سوچتے ہوں گے کہ لشکر اسلام سری نگر فتح کرنے کے بعد لال قلعہ، دلی پر فتح کر پرچم اتراتا یہاں کے مسلمانوں کو لبریت کرنے کے لیے بس اب آیا ہی چاہتا ہے، کمال کا دم گھبرانے لگا۔

”یہاں بجلی کی روشنی اب تک نہیں آئی۔“ چمپا غیر شخصی آواز میں بتلا رہی تھی۔ محلے میں تو کب کی آچکی ہے جہاں پھوا ماں کی کوٹھی تھی، وہ چلی گئیں حیدر آباد سندھ مع اپنے گھر والوں کے لہذا کوٹھی کسٹوڈین نے لے لی۔ اس میں سکھوں نے اسکول کھول کر بجلی منگالی ہے ہمارے مکانوں میں نہیں آسکی۔ چمپا کی آواز نیم تاریکی میں ڈرون کرتی رہی۔

”بجلی کے لیے میاں پیسے چاہئیں۔“ چاہا نے چاء کی سینی زور سے اسٹول پر رکھتے ہوئے کہا۔ سینی کا توازن قائم نہ رہ سکا، جگ ٹوٹنے سے سارا دودھ انگنائی کے فرش پر بہہ گیا۔ چمپا اسے افسوس سے دیکھتی رہیں۔ ”اب اتنی رات گئے دودھ کہاں سے آئے گا۔“ انہوں نے کہا۔

”اس پر افسوس نہ کرو چمپا باجی۔“ کمال نے گہری آواز میں آہستہ سے کہا۔  
چمپا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

کمال نے چمپا کو آج ان کی زں دگی کی ایک اور سیڑھی پر ایک پس منظر میں دیکھا جو ان کا حقیقی پس منظر تھا۔ اس نے لمبے بھر کے لیے آنکھ بند کر لی۔ لکھنؤ، پیرس، کیمبرج، لندن، روم اور میڈرڈ والی چمپا، مراد آباد کے محلے کٹھ گھر کے اس نیم تاریک مکان والی چمپا، مڈل کلاس چمپا، بہادر چمپا عرف نئے ہندوستان کی عاقل اور ذرا اور حسینہ۔ واہ بچیا۔ تمہارا جو ب نہیں۔ مانتا ہوں۔

کمال مراد آباد میں دو دن رکا۔ رات کو اسے اسی اودے اور نارنجی شیشوں والے کوٹھے کے کمرے پر پہنچایا گیا۔ جہاں وہ سب سے پہلے جا پہنچا تھا۔ آدھی رات تک وہ جھجے میں کھڑا سامنے کا منظر دیکھتا رہا جہاں چاند نے اپنی میانی روشنی مکانوں کی چھتوں، مسجدوں کے میناروں اور نیم کے درختوں پر پھیلا رکھی تھی۔

دوپہر میں قبیلے کے لیے اس کا کھولہ زینے کی آخری سیڑھی پر بچھا دیا گیا جہاں رام انگا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی تھی۔

”سنا ہے تمہارے یہاں ہندوستان کی ساریوں کی بڑی مانگ ہے۔“ چمپا باجی نے آکر دہلیز پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بٹاشت سے بات شروع کی۔

”تمہاری ہم وطن اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین یہاں آتے ہی کپڑے کی دکانوں پر  
یاغار کرتی ہیں۔ سنا ہے تمہارے یہاں کی اعلیٰ سوسائٹی۔“

”کیا اعلیٰ سوسائٹی کی گردان کر رہی ہو۔“ کمال نے جھنجھلا کر اس کی بات  
کاٹی۔ ”یہ نہ بھولو چمپا باجی کہ خود تم کو طبقاتی شعور حاصل کرنے میں پورے پندرہ  
سال لگے۔“

چمپا زور سے ہنسی۔ ”طبقاتی شعور کی بات کرنا ہے تو میری کزنز سے گفتگو کرو۔  
زیبا اور مریم، بڑی بھاری اسٹوڈنٹ ورکرز ہیں دونوں۔ دلی کے سالانہ انٹر  
یونیورسٹی یوتھ فیسٹول میں ہمیشہ یہ لوگ جانے کیا کیا کرامات کرتی ہیں۔ جھانکیاں  
عوامی ناچ، موسیقی کے مقابلے۔ زیبا نے پچھلے سال کے فیسٹول میں سنگتراشی میں  
پہلا انعام حاصل کیا۔“

کمال کی سمجھ میں آ گیا۔ اس کا خدشہ بے کار تھا، یہ ٹڈل کلاس لڑکیاں اپنے  
فرسٹریشن اور اپنی رومانیت پر فتح حاصل کر چکی تھیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے اگر  
وہ چمپا کی جگہ ہوتیں تو شاید اسی کی طرح رومان پرست ہوتیں، یہ نئی لڑکیاں تھیں۔  
چمپا عبوری دور کی لڑکی تھی اس لیے الاحوالہ اس نے تجربے کیے اور ٹھوکریں کھائیں۔  
زیبا اور مریم، ہمت والی لڑکیاں۔ ان کے دماغوں میں کوئی الجھن نہیں۔

پھر اسے خیال آیا کہ اس کے دلیس میں ایسی لڑکیاں نہیں، وہاں ابھی عبوری  
دور بھی پوری طرح شروع نہیں ہوا۔

”کاش میں ۴۱ء میں ان دونوں کی ایسی بن گئی ہوتی۔“ چمپا نے گویا کمال کے  
دل کی بات پڑھ لی۔ ”اب ہم لوگوں کے اختیار میں تو واقعات نہیں ہوتے۔“

کمال نے جواب دیا۔ اس نے محسوس کیا وہ کس قدر بوڑھا ہو چکا ہے۔ چمپا، جو اس کے سامنے چوکھٹ پر بیٹھی ہے، کتنی بوڑھی عورت ہے۔ ہم دونوں نے من کی دنیاؤں کی کتنی لمبی سیاحت کی۔ اس نے حیرت سے سوچا۔

وہ اس وقت ایک اجنبی شہر میں ایک نیم تاریک زینے پر بیٹھا تھا۔ دریا پر سے آتی ہوئی برساتی ہوا اس کے بال پریشان کر رہی تھی۔ وطن کی برسات، مگر یہ وطن نہیں تھا۔ اس کے ویزے کی معیاد ختم ہونے والی تھی، کل سویرے وہ یہاں سے اپنے ملک روانہ ہو جائے گا۔ مراد آباد، کٹھ گھر، یہ زینہ، چمپا احمد، زیبا، مریم، چاچا۔ سب یہیں رہ جائیں گے۔ کیا اس حقیقت پر اسے آنسو بہانا چاہیے؟ لیکن اب اسے محسوس ہوا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس میں ضبط آ گیا ہے۔ ضبط، توازن اور سکون، گریک آئیڈیلز..... اسے ہری شنکر کے الفاظ یاد آئے۔

چمپا نے پھر اس کے دل کی بات پڑھ لی اور اس نے پرانی عادت کے مطابق دہرایا: ”کہاں ہے تمہارا ہمزاد ہری شنکر؟“

”چمپا باجی“ اس نے ذرا غصے سے کہا: ”ہری شنکر اب میرا ہمزاد نہیں رہا، مجھے کیا معلوم وہ اس وقت کہاں ہے۔“

”کیوں اسے خط نہیں لکھتے؟“

”چمپا باجی“ اس نے پہلو بدل کر کہا، ”تم کو یہ اب تک معلوم نہیں ہوا کہ میں دوستوں کو خط نہیں لکھا کرتا۔ میں ہری شنکر سر یواسنوا کو کیا لکھوں اور کیوں لکھوں؟“

”اب تک جذباتی ہوا!“

”نہیں۔“ اس نے بل کھایا۔ چپا نے اسے پھر چوری کرتے پکڑ لیا تھا۔  
 ”ہٹائیے چمپا باجی۔“ اس نے جھنجھاکر جواب دیا۔ ”میں اس سارے انڈیا پاکستان  
 میلو ڈراما سے، جو چاروں طرف کھلیا جا رہا ہے، قسم خدا کی عاجز آ چکا ہوں۔ ہری  
 شکر آج کل شاید بنگلور میں ہے، اب میں کیا جا کر روتے ہوئے اس سے لپٹ  
 جاؤں؟ لاجول ولاقوہ۔“

”تم اب تک مضبوط نہیں ہوئے۔“ چمپا نے آہستہ سے کہا ”تم ہری شکر سے  
 ملنا نہیں چاہتے کیونکہ تم کو ڈر ہے کہ واقعی جا کر روتے ہوئے اس سے لپٹ جاؤ  
 گے۔ اچھا پھر مجھ سے ملنے کیوں آئے؟ یہ بھی بڑی سخت میلو ڈریٹک بات تھی۔“  
 ”آخر انسان ملتا ملتا ہی رہتا ہے پرانے دوستوں سے۔“ مال سے کوئی اور  
 معقول جواب نہ بن پڑا۔ ”اور پھر مراد آباد راستے میں ہی پڑتا تھا۔“ اس نے منہ  
 لٹکا کر کہا۔

بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ کے چھجے پر برسے لگیں۔ گلی کی مٹی کی سوندھی  
 خوشبو اڑ کر مال تک پہنچی۔ ایک عورت تنگ پانسجامہ پہنے، آم کی کھانچی سر پر  
 اٹھائے، آواز لگاتی نیچے سے گزری۔ چمپا دہلیز پر بیٹھی موکھے سے باہر دیکھتی رہی۔  
 بہت دیر سے مال ایک سوال دل میں لیے بیٹھا تھا مگر پوچھنے کی ہمت نہ پاتا  
 تھا۔ آخر اس نے دہلی زبان سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے پوچھ ہی لیا:

”چمپا باجی اب تم کیا کرنے والی ہو؟“

یہ بڑا بے رحم سوال تھا۔ ہم کسی سے اس کے مستقبل کے بارے میں کس طرح  
 پوچھ سکتے ہیں!

”میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں بلاآخر بنارس واپس جا رہی ہوں۔ تم کو یاد ہے میں نے کیم کے کنارے بوٹ ہاؤس میں تم سے کہا تھا: میں واپس جانا چاہتی ہوں، کوئی ساتھ لے جانے والا نہیں ملتا۔ اب میں نے دیکھا کہ کسی دوسرے کا سہارا ڈھونڈنا کس قدر زبردست حماقت تھی۔ میں خود ہی بنارس لوٹی ہوں، جانتے ہو میرے آبائی شہر کا نام کیا ہے؟“

”ہاں۔ مسرت کا شہر، وہ بھی ایک نہ ایک دن واقعاً مسرت کا شہر بنے گا۔ سارے شہروں کی طرح اس ملک کو دکھ کا گڑھ یا مسرت کا گھر بنانا میرے اپنے ہاتھ میں ہے مجھے دوسروں سے کیا مطلب؟“ اس نے اپنے ہاتھ کھول کر غور سے انہیں دیکھا۔ ”رقاصہ کے ہاتھ، آرٹسٹ یا لیکھک کے ہاتھ؟ نہیں..... یہ صرف ایک عام، اوسط درجے کی ذہین لڑکی کے ہاتھ ہیں جو اب کام کرنا چاہتی ہے۔“

وہ خاموش ہو گئی، کچھ دیر بعد مسجد سے ظہر کی اذان کی صدا بلند ہوئی۔ اس نے غیر ارادی طور پر دوپٹے سے سر ڈھانپ لیا۔

”سہیل!“ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”مسلمانوں کو یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔ تم کیوں نہیں دیکھتے کہ یہ تمہارا وطن ہے۔“ اس نے بے بسی سے انگلیاں مروڑیں۔ ”اور تم کیوں چلے گئے؟ کیا میں تمہارے یہاں آ جاؤں تو مجھے ایک سے ایک عمدہ عمدہ مل جائے گا! دیکھو میں پیرس اور کیمبرج اور لندن سے کتنی ڈگریاں لاتی ہوں۔“

ہر سنگھار میں رنگے دوپٹے اور پتھری ساڑیاں پہنے چپا کے رشتے دار لڑکیاں

نیچے والے میں پکوان چڑھا رہی تھیں۔ ”بھئی کچھ یہاں بھی بھجواؤ۔“ چپا نے کھڑکی میں سر نکال کر آواز دی۔

”اچھا بچیا۔ ابھی تھمے۔“ پھر انہوں نے ایک گیت شروع کر دیا۔ جھولا کن نے ڈالوری امریاں۔

سمال نے کھولے پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بچپن سے یہ گنت سنتا چلا آ رہا تھا۔ آتے ہی اس کے خاندان کی لڑکیاں بھی کڑھائی چڑھا کر یہ گیت اپنا شروع کر دیتی تھیں۔

زینے پر پانچے کی جھونک دکھائی دی۔ زیبا پھلکیوں کی پلیٹ لے کر اوپر آ رہی تھی۔ سچ سچ وہ اندرائی اور پلیٹ فرش پر رکھ کر گنگنائی ہوئی پھر نیچے اتر گئی۔

چمپا چوکھٹ پر بیٹھی رہی۔ ”تم سوچ رہے ہو۔“ اس نے آہستہ سے کہا، ”کہ اب میرے دو ارکون آئے گا۔ لیکن سمال میں سمجھتی ہوں، جہاں تک ذاتی کامیابی کا سوال ہے، میں تم سے کہیں زیادہ خوش قسمت ہوں۔ میں نے سراغ پالیا ہے۔“ ”تم ٹھیک کہتی ہو چمپا باجی۔“

نیچے حوض میں برکھا کی پھوہار کا جھالانج رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے سارے میں ہریالی اور تروتازگی چھا گئی تھی۔ گلیوں میں ننھی ننھی ندیاں بہہ رہی تھیں، چمچوں اور پرنا لوں سے پانی کے آبشار گر رہے تھے، نیچے آنگن میں پانی کی چھوٹی سی شفاف جھیل بن گئی تھی، اوپر چینی کے گملوں میں لگے ہوئے پودے پانی میں اہلہا رہے تھے۔ ”یہ میرا جل محل ہے۔“ چپا نے آہستہ سے کہا۔ ”یہاں میرے آنسوؤں کا پانی بہتا ہے۔“



والان میں لڑکیوں کے دوپٹے لہرائے، ہلکی کاسنی، زرد اور سبز رنگ کی چھری  
اوڑھے ایک لڑکی نے، جو شاید مریم تھی، میرا کا گیت شروع کر دیا۔

”میں ایک عام اوسط درجے کی لڑکی ہوں۔“ چمپا کہتی رہی۔ ”اگر میں خدا کا  
خاص الخاص بندہ ہوتی۔ میرا، ملکہا بانی، سینٹ صوفیہ۔ تو میرے جسم پر زخموں کے  
نشان نظر آتے، میرا لبادہ میرے مقدس خون سے سرخ ہوتا، میرے ہاتھوں میں  
میخیں گڑی ہوتیں، میرے سر کے گرد نور کا ہالہ ہوتا، مجھے وحش کے پیالے اور سانپ  
کے پتارے بھجوائے گئے ہوتے، لیکن میں محض چمپا احمد ہوں۔ میرے زخم کسی کو نظر  
نہیں آ سکتے کیونکہ میرے تماشائی بھی میری طرح زخمی ہیں، وہ کمزور اور فانی انسان  
ہیں۔ چشم بینا نہیں رکھتے۔ لوگ ممکن ہے مجھ پر ہنستے بھی ہوں جبکہ سینٹ صوفیہ کی  
پرستش کی جاتی ہے۔“

ہوا کے زور سے بہت سی جامنیں ٹپ ٹپ کرتی میڑھیوں پر آن گریں۔ چمپا  
نے اپنے بالوں میں سے ایک زرو پٹا نکالا۔

”سمال“ اس نے سوچتے ہوئے کہا، ”تمہیں وہ لنکا کی آرٹسٹ لڑکی یاد ہے؟  
برسوں تک وہ کینوس پر کینوس رنگتی چلی گئی۔ دنیا کے نگار خانوں کی اس نے خاک  
چھانی، لندن اور پیرس میں اس کی نمائشیں ہوئیں جن میں بیویاں نئی نئی ساریاں  
اور فراک پہن کر آتیں، معزز مہمان تقریریں کرتے، تصویریں لی جاتیں، پریس  
کے نمائندے اس کا انٹرویو کرتے، وہ ایک کونے میں کھڑی مسکرا مسکرا کر سب سے  
باتیں کرتی، آخر میں سب چلے جاتے، اس کا ہال خالی ہو جاتا، اپنی منگلو کی معیت  
میں وہ تنہا رہ جاتی اور چپ چاپ باہر نکل کر بس میں بیٹھتی اور گھر کی راہ لیتی۔ تین

مرتبہ میں نے یہی منظر دیکھا۔“

”میں نے طرح طرح کے چینس قسم کے لوگوں کے ساتھ وقت بتایا۔ ان میں سے ہر ایک کبھی اپنی جگہ خوش ہوتا کبھی رنجیدہ۔ تم خوش کیوں ہو؟ میں ہر ایک سے پوچھتی۔ اتنے ذہین ہوتے ہوئے بھی ہشاش ہو، حد ہے۔ میں برا مان کر کہتی، مگر آخر میں میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں اپنے غم کو جنہوں نے دنیا کے غم میں سمودیا تھا۔ کس قدر آسان بات تھی۔ پہاڑ کے نیچے پہنچے تو معلوم ہوا ہم خود اور ہمارا ذاتی الم کس قدر حقیر شے ہے۔“

”آٹھ سال بعد تمہاری طرح میں اپنے وطن واپس لوٹی اور میں نے یہاں کے حالات دیکھے۔ ایسی باتیں دیکھیں جن سے میرا سرندامت سے جھک گیا اور میرا دل دکھی ہو گیا۔ میرے سامنے مسائل کا بہت اونچا پہاڑ کھڑا تھا۔ تب جانتے ہو کیا ہوا؟ چیونٹی نے کیا کیا۔ اس نے کانوں میں ہاتھی لٹکا کر پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔“

”اب بھی معلوم کرنا چاہتے ہو کہ میں کیا کرنے والی ہوں؟“

دوسرے روز شام کو وہ وہاں سے چلا۔ اس کے لیے تانگہ منگوا لیا گیا۔ چپا اور مریم اور زیبا اسے ڈیوڑھی تک چھوڑنے آئیں۔ ”ہم اب تک اس محلے میں زبردست پردہ کرتے ہیں ورنہ چالبا کو خواہ مخواہ صدمہ ہو گا اس لیے ہم بوجہ پردے کے تم کو اسٹیشن تک چھوڑنے نہیں جاسکتے۔“ چپا نے ہنس کر کہا۔

کمال تانگے پر بیٹھا۔ تانگہ گلی سے نکل کر اسٹیشن کی طرف چل دیا اور کمال نے دیکھا: چپا باجی ایک بار پھر دور کھڑی رہ گئیں، ٹوٹے ہوئے مکان کی دہلیز پر۔ اسی

طرح اس نے ان کو اکسفرڈ اسٹریٹ پر چوزے کی سرائے کے شیشوں والے دروازے کے پیچھے تنہا کھڑا چھوڑ دیا تھا۔ اسی طرح وہ ایک مرتبہ گل فشاں کے پھاٹک کے سامنے اندھیری سڑک پر کھڑی رہ گئی تھیں جب بھیا صاحب ان کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تھے۔

لیکن اس وقت وہ اکیلی نہیں تھیں، اب وہ ہجوم کا حصہ تھیں۔ انہوں نے بالآخر غیر مشروط طور پر ہجوم کی دوسرا تھ قبول کر لی تھی۔ چند سال پہلے مال سوچا کرتا تھا، وہ آگے جا رہا ہے۔ چمپا پیچھے رہ گئی ہیں، وہ دور نکل جائے گا..... نئی دنیا کیں، نئے خواب، عزائم، آئیڈیلز۔

مگر آج، اس سے، اس نے دیکھا کہ وہ آگے نہیں جا رہا، وہ مع اپنی دنیا کے مسلسل، مستقل مراجعت میں ہے اور تنہا ہے۔ چمپا، جواب تنہا نہیں، جلوس میں شامل ہیں، آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے محلے کی گلیاں، مسجد کے مینار، زیبا اور مریم، سڑک پر گولیاں کھیلتے ہوئے لڑکے، خیلے والے، برقعہ پوش عورتیں، سب ہیں۔ چمپا باجی ان سب کی ساتھن بن گئی ہیں۔ یہ لوگ آگے بڑھنے کے لئے تیار ہیں۔ آج نہیں، کل سہی۔ ایک نہ ایک روز بہت جلد یہ لوگ ترقی یافتہ ہو چکے ہوں گے۔ اس نکتے پر پہنچ کر سرل کے فلسفے کے سارے غیر مرئی تار جھن جھنا کر ٹوٹ گئے۔

تاناگہ اب قاضی کے بازار سے گزر رہا تھا، دکانیں بڑھائی جا رہی تھیں۔ چاء خانوں میں ریڈیو بج رہے تھے، سینما گھروں کے آگے ہجوم تھا، مغرب کے آسمان پر ایک آدھ کنکوا اڑتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا۔

کیا کروں پارٹنر..... ٹرین میں بیٹھتے ہوئے اس نے دل میں کہا، میرا بڑا  
افسوسناک خاتمہ ہوا ہے۔

ٹرین شوالک کی پیارٹیوں سے گزرتی ہمالیہ کے ہرے بھرے دامن میں  
پہنچی۔ ہر دوار، رشی کیش، ہر کی پوڑی، دیودار کے جنگل، بانسوں کے جھنڈ،  
جھرنے، پیارٹی ندیاں، مندر، سادھو، چٹانیں، پھولوں سے لدے ہوئے  
درخت، دہرہ دون کے اسٹیشن پر اتر کر وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گیا۔  
کلیم اور منقولہ اور غیر منقولہ کے کاغذات اور مکان کے قبائے نکالے گئے۔ سرکاری  
قسم کی گفتگو ہوئی۔ پھر اس نے ڈالمن والا کی خوبصورت سڑکوں پر گھومنا شروع کیا۔  
اس نے آخری بار مکانوں کے ناموں کی تختیاں پڑھیں۔

سامنے رسپنا بہہ رہی تھی۔

”یار ہری شکر۔“ مال نے کہا۔

”ہاں یار۔“

”یار یہ پروفیسر ٹھیک تو کہتا تھا۔ ہم لوگ کس جنجال میں گرفتار ہیں خدا کی  
قسم۔“

اس روز انہوں نے تیاگ کے مسئلے پر کافی غور و خوض کیا اور سخت فلسفیانہ موڈ  
ان پر طاری رہی۔ آؤ کوٹھیوں کے نام پڑھیں۔ ناموں کے انتخاب سے لیکنوں کی  
سائیکولوجی آشکار ہوتی ہے۔ چلتے چلتے رک کر ایک پھاٹک کے قریب جاتے  
ہوئے ہری شکر نے کہا۔

”ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے کہ شاہیں بنانا نہیں آشیانہ۔“ مال نے

کہا۔

”ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھو پورٹو وازی کس قدر افسوسناک طور پر جذبات زدہ

ہے۔ ذرا یہ نام پڑھنا۔“

”خوابستان۔ لاجول والاقوة۔“

”مگر تم خود گل فشاں میں رہتے ہو۔“

”جانتا ہوں۔“

”یار کمال۔“

”ہاں یار۔“

”ذرا سوچو لوگوں نے مکان بنارکھے ہیں، یہاں سے وہاں تک، ایک سے

ایک خوبصورت ساری دنیا میں مکان بنے ہوئے ہیں۔“

”ہاں یار بڑی عجیب بات ہے۔“

وہ دونوں ایک پھاٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور پھر اس مسئلے پر غور و خوص کرنے

لگے۔ دراصل ان کو پروفیسر کے دنیا تجوینے نے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔ ”ایک

صحیح الدماغ انسان، سائنس دان اور لے کر چل دیا جنگل کو وحد ہے۔“

”اس کا مطلب کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ معنی کے معنی.....“

اندھیرا پڑے تک وہ ڈالین والا کی خاموش معطر سڑکوں پر مکانوں کے نام

پڑھتے پھرے ”نسترن“ ”دولت“ ”شیم روک“ ”ران محل“

ان مکانوں کے باغوں میں لگے ہوئے پھاڑی پھلوں کی مہلک سارے میں

اڑ رہی تھی اور دنیا بڑی حسین جگہ تھی۔

وہ دونوں منہ لٹکا کر پھر ایک پھاٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور زہر کے پانی کو دیکھتے رہے جو سڑک کے کنارے کنارے بہہ رہی تھی۔ پانی میں ایک ٹونا پھوٹا جوتا دھارے کے زور سے اچھلتا کودتا چلا جا رہا تھا۔ ایک لمبی سی کار آ کر اس کے قریب رکی، وہ چونک پڑا۔ آنکھیں مل کر اس نے چاروں اور دیکھا ہری شکر غائب ہو چکا تھا۔ یہ ۴۲ نہیں تھا، وہ ۵۶ء کے دہرہ دون میں موجود تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں ملیں، وہ تو اپنے ہی مکان کے پھاٹک پر بیٹھا تھا۔ کار میں سے ایک خوش پوش سردار جی اتر کر اس کی طرف بڑھے۔

”آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں جی؟“

”میں..... میں.....“ وہ گڑبڑا گیا، اس کا دل دھڑکنے لگا۔ سردار جی شاید اسے ٹھگ سمجھ رہے تھے جو ان کے ڈرائنگ روم سے ریڈیو چرانے کے ارادے سے آیا تھا۔ اس نے دوبارہ پھاٹک میں لگی ہوئی سنگ مرمر کی تختی پر بھی: نواب قتی رضا بہادر آف کلیان پور۔

یہ اس کا مکان تھا، وہ پلیا پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا حلق سوکھ گیا۔ اس نے ثبوت کے طور پر قبائے کے کاغذات نکال کر سردار جی کو پیش کیے اور کھیسانی ہنسی ہنسا۔

”اوہ..... آپ مووہیل پر اپرٹی کے سلسلے میں آہے ہو۔ تشریف لاؤ جی“

وہ سردار جی کے ساتھ باغ کی سڑک پر داخل ہوا۔

”آپ کا اسٹور روم حفاظت سے بند ہے جی۔ کنجی لائے ہو آپ؟“

”جی ہاں۔“

ڈرائنگ روم میں لے جا کر سردار جی نے اسے چاہ پلائی اور کھانا کھلانے پر  
مصر رہے۔

سردار جی راولپنڈی کے رہنے والے تھے اور یہاں بہت بڑے ٹھیکیدار تھے۔  
دیر تک وہ اپنے وطن کی یاد میں رویا گیا کیے۔ مال گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔  
”باکس روم کھولنے میں کل صبح آ سکتا ہوں؟“

”ضرور جی اپنا ہی گھر سمجھو۔“ سردار جی نے کہا اور اپنی کار میں بٹھال کر اس کی  
قیام گاہ تک پہنچایا۔ صبح کو وہ پھر ”خیابان“ پہنچا۔ اب دھوپ نکل آئی تھی۔ باغ میں  
دونو جوان لڑکیاں ننگے پیر بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں۔ سردار جی نوکروں پر چیختی  
چلاتی پھر رہی تھیں اور بھینسوں کی سانی کروا رہی تھیں۔ اندر ریڈیو بج رہا تھا، بڑا  
پر سکون منظر تھا، وہ پہلو کے راستے سے گزرتا اسٹور روم پہنچا اور تالہ کھولنے سے  
پہلے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

وہاں ان سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا وہ بیسویں صدی کے ہندوستان کی ”گم شدہ  
نسل“ کا ایک فرد تھا۔ اس نے محسوس کیا اس کے خاندان والوں کی دنیا خزاں زدہ  
جنگلوں، گلاب کے پھولوں، پہاڑی کانچوں اور تیسرے پہر کی چائے میں چاندی کی  
جھلملاتی ہوئی چاءوانی کی دنیا تھی۔ سامنے دیوداروں کے درمیان سے جو پگڈنڈی  
گزرتی تھی اس کے خاندان کی خواتین رنگین چھتریاں سنبھالے اس پر چلتی ہوئی  
کسی پرانی ترکی یا یورپین افسانے کی خوابناک فضاؤں میں تیرتی معلوم ہوا کرتی  
تھیں۔

”خیابان“ میں چھ بڑے بڑے کمرے تھے جن کے چاروں اور مزید کمرے اور برآمدے اور گیلریاں۔ جاڑوں میں جب کبھی وہ یہاں آتے وسط کے کمرے میں فرش پر گدے بچھا دیے جاتے۔ پہاڑی خانساہاں فقیرا چاء کی کشتی لا کر آتشدان کے سامنے رکھ دیتا۔ آنگن میں چمپا کا ایک درخت کھڑا تھا۔ اس کے تین طرف برآمدے تھے جن میں سے ایک کے سرے پر یہ اسٹور روم تھا۔ آنگن میں اس طرح کا گھریلو ماحول رہتا جس کا ذکر سرت چندر کے ناولوں میں عموماً پایا جاتا ہے۔ جاڑوں کی راتوں میں کمال اور طلعت کے سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا ہوتا۔ رنگ بھرنے کی کتابیں، پریوں کی کہانیاں، گڑیاں اور مینوسیٹ، جب کبھی یہ گودام کھلتا تو سب بچوں کی طرح شدید تجسس اور اشتیاق سے وہ بھی اماں نیگم کے پیچھے پیچھے اس میں جا گھستا۔ کیسی کیسی پراسرار چیزیں اس میں بند رہتی تھیں۔ صندوق، نوکریاں، برتن، جھاڑ فائوس، بڑے بڑے لیمپ، پرانے رسائل، خطوں سے بھرے ہوئے اٹیچی کیس، نواڑوں کے بندل، دریاں۔

سردیوں میں کرسیاں بھری پر ڈالے بابا بیٹھے حقہ لڑ گڑایا کرتے۔ بچپوں کے درختوں پر سے کمرہ رفتہ رفتہ چھٹتا۔ شاگرد پیشے میں ترلوچن مانی نے کمرے کی دیوار پر ایک بڑی سی رنگین تصویر لئی سے چپکارکھی تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ جو منش دنیا میں برے کام کرتے ہیں نرک میں ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔ (مثلاً ایک تصویر تھی کہ ایک آدمی نرک میں ایک گاڑی میں جتا تھا اور لمبی لمبی زبانیں نکالے بندر نما فرشتے گرز مار مار کر اس کو ہانک رہے تھے) اور روزی جعدارنی جس کی لڑکی انگریزوں کے یہاں آیا گیری کرتی تھی، جب چاندانی کوڑے کی بالٹی میں



انڈیلی جاتی تو وہ چاء کی پیتیاں اس میں سے نکال کر گھاس پر سکھاتی اور ان کی چاء بنا کر بیچتی۔

لکھنؤ سے سارا عملہ ساتھ آیا۔ قدیر جوہرے رنگ کی لوٹی اوڑھے ٹھاٹھ سے بے ٹانگ کی کرسی پر اپنے کمرے کے آگے بیٹھے رہتے۔ باورچی خانے کے سامنے کٹھن کا درخت تھا۔ حسینی کی بی بی روز کھڑی ہو کر اس کے پھل گنتیں۔

فرنیچر پر سرخ رنگ کا کپڑا منڈھا تھا۔ مونج کے فرش، سرخ اور عنابی قالین۔ سامنے برآمدے میں دیوار پر ایک رنگین تصویر فریم میں لگی تھی جس میں شکاری کتے ایک بارہ سنگھے کا تعاقب کر رہے تھے۔ ڈرائنگ روم کا آتش دان بانات کی کار چوبلی جھالر سے آراستہ تھا۔ اس پر چاندی کے فریموں میں اہل خاندان کی تصویریں دھری تھیں۔ کونوں میں پینٹل کے بول اسٹینڈز پر رکھے تھے جن میں پام کے گملے رکھے جاتے۔ ڈرائنگ روم کی چلمچی میں روز تازہ پتے بھرے جاتے جن کی بڑی اچھی سی مہک آتی۔ ڈنرز کے موئے پر میز خالص انگریزی اسٹائل سے سجائی جاتی۔ چھری کاٹنے، فنگر بول جن میں گلاب کی پیتیاں تیرتیں۔ بیرہ ہمیشہ ضابطہ چکن پہنتا اور صاف پر چاندی کا بلا لگاتا اور کمر میں پٹا باندھتا۔

گرمیوں کی دوپہروں میں جب سارا گھر سو جاتا تو سماں چپکے سے باہر نکل کر لپچیوں کے خنک جھنڈ میں جا بیٹھتا۔ ایک عظیم آفاقی کاہلی سارے میں چھائی ہوتی۔ بڑے پرسکون خیالات دماغ میں آتے۔ دور دیو داروں میں ایک پرندہ متواتر بے تکان چلائے جاتا: میں سوتا تھا..... میں سوتا تھا..... کہا جاتا ہے کہ یہ پرند شوالک کی وادیوں کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا اور اسے کبھی کسی نے دیکھا

بھی نہیں۔ پھاڑی نوکر کہا کرتے تھے کہ جب پر جا پتی دنیا بنا رہے تھے اور سارے جائداروں کو ان کی قسمتیں اور اوصاف بانٹے جا رہے تھے (مور کو پر ملے، کوئل کو آواز، وغیرہ) اس وقت یہ یہیں پڑا سو رہا تھا۔ لہذا یہ اس کا جنم جنم کا رونا ہے۔ اس کی آواز پر کان لگا کر سنو تو صاف سنائی دیتا تھا: میں سوتا تھا۔

سردانی جی ننگے پیر سٹر پڑ کرتی ایک کمرے سے دوسرے میں جا رہی تھیں۔ انہوں نے زور سے چنری کا دروازہ بند کیا۔

کمال چوکنک کر ۳۵ء کے دہرہ دون سے بھی واپس آ گیا۔

سیڑھیوں پر سے اٹھ کر اس نے جیب سے کنجی نکالی اور گودام کا دروازہ کھولا۔ اندر جا کر وہ الماریوں کو بے دھیانی سے کھولتا بند کرتا رہا۔ صندوقوں میں جھانکا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ملکیت کا کیا مصرف ہے۔ اس نے اس انبار پر نظر ڈالی جسے انسان اپنی ذاتی ملکیت کہہ کر خوش ہوتا ہے اور اس طرح کے سامان کے پشتارے ابھی گلفشاں اور کلیان پور کی حویلی کے کمروں میں منتقل تھے۔ کمرے کے وسط میں چھوڑی سی خالی جگہ کا جو جزیرہ سا بن گیا تھا اس میں کھڑے ہو کر وہ سوچتا رہا: اس ملکیت کے لیے دنیا مری جاتی ہے! ان سب کے بدلے میں ایک مرگ چھالا، ایک مرگ چھالا!

اب جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ لوگ دنیا تاج کر جنگلوں میں کیوں جا بیٹھتے تھے۔ پھر اس نے اکڑوں بیٹھ کر کاغذات کی صندوقچیاں کھولیں۔ چاروں طرف رسالوں اور کتابوں اور پرانی تصاویر کے انبار لگے تھے۔ اس نے ”خط و کتابت“ کا ایک ٹونا پھونکا، اٹیچی کیس اٹھایا۔ لفافے جن پر عجیب و غریب مہریں تھیں۔ پٹنہ

۱۹۳۳ء۔ بلا سپور ۱۹۲۸ء۔ جھالا وار ۱۹۳۷ء۔ جانے ان خطوں میں کیا تھا اور کن لوگوں نے یہ خط لکھے تھے اور اب وہ کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ مثلاً اس بہاری لال کا خط جو ۱۹۳۴ء میں پبلی بھیت سے آیا تھا اور شکست میں لکھا تھا، یہ صاحب کون تھے اور کیوں تھے؟ اور وشوانندن پانڈے، رانی کھیت اور محمد احمد عباسی منصف ضلع گوئدہ، فرہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے ”خط و کتابت“ کے صندوقچے واپس ایک الماری میں ٹھونس دیے۔ قالینوں کے انبار کے نیچے فائلیں دبی تھیں۔ مقدمات، زمینیں، مکانات، مان و نفقہ، خالی چنی بیگم کا چھٹم چھٹا جب میر مرغی سے ہوا تھا اس کے سارے کاغذات اور ایک تاریخ اودھ با تصویر جس کا کاغذ اتنا پیلا ہو چکا تھا کہ ہاتھ لگنے سے گلڑے گلڑے ہوا جا رہا تھا۔ جس کے اولین صفحے پر ہربائی نس دی آزیل سر مہاراجہ ڈگچے سنگھ بہادر کے سی۔ ایس۔ آئی بلرام پور و تلسی پور، صوبہ اودھ کی نہایت مسخرے پن کی قلمی تصویر چھپی تھی اور ان کے قلم سے لکھا ہوا نہایت متفجع و مسجع عبارت کا دیباچہ تھا: ”القصہ ایسی بے انتہائی کی باتوں سے مضطر ہو کر ایک دن عالی جاہ بسبب تحریک مصاحبان سفاہت شعار بغور تامل و فکر و مال اندیشی لباس گیر و افترا کا پہن کر بعد یے پ رہیٹھے رفتائے خاص بھی اسی صورت سے بنے انگشت نمائے خاص و عام ہوئے۔ جناب عالی نے اپنی رفیع بدنامی سمجھ کر علی ابراہیم خان کو نواب عالیہ کی طرف سے کہا! بھیجا کہ میں نے بادشاہ کے حکم سے.....“

کمال نے دوسرا صفحہ پلٹا:

”پس صاحبان عالی شان نے سمجھا تنخیر بلاد ہندوستان تو اسی دن ہو چکا تھا۔

شرق سے غرب تک حقیقت کھل چکی تھی لہذا اس زینہ وزارت پر مستقل رہنا چاہیے پھر مدارج سلطنت پر جانا آسان ہو جاوے گا اور یکا یک کسی کے گھر میں چلے جانا چاہیے اگرچہ اس میں ایک مدت گزر جائے۔ اب یہ سب حقیقت حال اس زمانے کی کھل گئی۔ اتفاق قوم سب کا جاتا رہا۔ گویا سب چراغ ہندوستان بجھ گئے۔“

”انتقال مرزا وزیر علی خان..... بابت ماہ جون ۱۸۱۶ء کلکتہ کے کاسی باغ میں، جہاں ٹیپو سلطان کا بیٹا بھی دفن ہے، مدفون ہوئے۔ چند غربائے شہر وزیر ہند سمجھ کر ساتھ تھے۔ کچھ شہر کی کسیاں ان کی سخاوت و نیکی یاد کر کے اپنے اپنے دروازوں پر کھڑی روتی تھیں۔ صاحب نے حکم دیا گورے قنات کے باہر کھڑے رہیں۔ تابلوت پر گوروں کا پیرہ تھا۔ اوس عہد میں صاحب ریڈیلنٹ لکھنؤ جان لمسڈن صاحب۔ بنارس میں جان چیری صاحب مقتول نائب تفصل حسین خان تھے۔“

”مرزا مظفر بخت شاہزادے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ ایک دفعہ اپنی اولوالعزمی و طمع دنیا سمجھ کر لکھنؤ سے باہر نکلے۔ لکھنؤ کے جو لوگ پریشان حال و معطل تھے ساتھ ہوئے، جب ناکام لکھنؤ پھرے سیلی بیگم منجملہ بی بی ہائے جرنل مارٹن سے نکاح کیا اونہیں کی پنشن میں بسر اوقات رہی۔ بعد گوری بی بی کے مرنے کے انہیں کے مکان میں رہتے تھے۔“

”جانا کرنل ڈبوا صاحب و فریل صاحب و مولوی محمد اسماعیل کالندن کو سفارت مع ہدایائے شاہ جم جاہ جارج چہارم.....“

کتاب اس نے نوکری میں واپس پھینک دی۔ اس کے ہاتھ جو گرد لگ گئی تھی

چند لمحوں تک وہ اسے افسردگی سے دیکھا کیا۔ بہت دیر تک اس نے اپنے ہاتھ نہیں پونچھے۔

یہ سامان کہیں نہیں جائے گا۔ ان سب چیزوں کو ضبط ہو لینے دو۔ اس نے دل میں کہا گو دام سے نکلنے ہوئے اس نے ایک بیس سال پرانا گروپ فوٹو فرش پر سے اٹھالیا۔ اس میں بڑے ابا مرحوم ہار پھول پہنے درمیان میں بیٹھے تھے، یہ کسی ضلع کا الوداعی گروپ تھا جس میں بہت سے ڈپٹی کلکٹر ان اور وکلاء قطار میں بیٹھے تھے۔ پیچھے بڑے بڑے دروازوں والا برآمدہ تھا۔ سکیٹ صاحب، رضوی صاحب، ٹھاکر رام نرائن صاحب، مسعود الحسن صاحب، یہ کیسے عجیب لوگ تھے۔ سیدھے سادے۔ شریف۔ بھولے بھالے جعل سازی غالبان میں سے کسی کو نہ آتی ہوگی۔ ریکٹ چالانا ان کا مشغلہ نہ رہا ہوگا۔ فراڈ اور چار سو بیس سے یہ حضرات ناواقف تھے۔ کس قدر بے وقوف لوگ تھے۔ ان کے مخصوص طرح کے مذاق ہوتے تھے۔ مخصوص مشغلے۔ مشاعرے۔ مقدمے بازیاں۔ شکار کچے گانے کی محفلیں۔ کیسی پر امن زندگیاں یہ لوگ گزار گئے۔ اسے ان لوگوں کے مذاق یاد آئے۔ رضوی صاحب کی چڑگلاب جامن تھی۔ ان کے سامنے گلاب جامن کا دو ناؤھرا ہے اور وہ ہائے توبہ کر رہے ہیں۔ ٹھاکر صاحب کی تو نڈ پر پھبتیاں کسی جاری ہیں۔ میرٹھ کی نوچندی جانے کے پروگرام بن رہے ہیں، چھڑیوں کے سیلے کا تذکرہ ہے، سالے بہنوئیوں کی چوٹیں چل رہی ہیں، کیسا پرسکون ان کا معاشرہ تھا۔ سال اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ ہم نے کس طرح ان کی نسل سے خود کو بہتر ثابت کیا؟ بے چارے بوڑھو۔ میں تمہارے آگے شرمندہ ہوں۔ میں تم کو اپنا منہ نہیں دکھانا چاہتا۔ میں اپنا

منہ چھپا کر دور بھاگ رہا ہوں۔ خدا حافظ۔ اس نے گروپ کو آہستہ سے پھر گودام کے فرش پر گرا دیا اور تالہ لگا کر باہر آ گیا۔

دیو داروں میں پرندہ بدستور چلائے جا رہا تھا: میں سوتا تھا..... میں سوتا تھا۔

ارے سوتا بھی تھا تو کیا حرج تھا؟ کمال نے جھنجھا کر دل میں کہا۔ جگ رہا ہوتا تب بھی پر جاپتی تھے کون بڑا سکھ عطا کر دیتے مگر پچھتاوے کے احساس اور توبہ تلا سے بھی تو اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ ارے میں پوچھتا ہوں آپ ہیں کون چیز، کمال رضا اور سرل بیشلے اور گوتم نیلمبر؟ جو طرح طرح کی ٹرٹا لگا رکھی ہے۔

دلی کے انٹیشن پر جی جاجی اس کے منتظر تھے۔ ان کے ہمراہ وہ جمناروڈ آیا۔

اج برآمدے میں کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے پٹ کر رونے لگی: ”مت جاؤ کمسن۔ نزل سورگباشی ہو گئی۔ شکر سدا باہر رہتا ہے۔ تم پاکستان چلے گئے۔“ روتے روتے لاج وٹی کی ہچکی بندھ گئی۔

وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ”کا ہے روتی ہو؟“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”روؤ متی۔“

اس کی ٹرین شام کو امرتسر جاتی تھی مگر وہ جلد از جلد لاج وٹی کے گھر سے بھاگنا چاہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ جی جاجی کے ساتھ نئی دلی جانے کے لیے تیار ہوا۔

”ارے گوتم کو تو فون کر لو، وہ چند ہی گڑھ گیا ہوا تھا، شاید لوٹ آیا ہو۔“ جی جاجی نے کہا۔

کمال نے بے دلی سے میلینون ڈائریکٹری اٹھائی اور اوراق پلٹنے لگا۔ بہت

سے جانے پہچانے نام صفحات پر اسے نظر آ رہا ہے۔ مس صولت رحمن، فلمر ڈویژن،  
مس کملا ہسپال، منسٹری آف ایکسٹرنل افیئرز۔

اس نے صفحے پلٹے تروا، ہریش چند، نرائن ایم جے، منیلمبر، گوتم..... اس نے  
نمبر ڈائل کیا۔

”ہلو..... ارے تم یہیں موجود ہو۔ الو کے.....“ پٹھے“ اس نے بے حد کوشش کر  
کے مارل بٹاش آواز میں بات شروع کی۔ ”اے یار..... ہاں ہاں۔ آج ہی  
صبح دہرہ دوں سے..... ہیں؟ ہاں ڈھاکہ سے آ رہا ہوں بذریعہ ریل گاڑی۔  
لکھنؤ میں؟ ہاں۔ اپنی نے تم کو دعا کہلوائی ہے۔ ہاں..... ہاں مزے میں ہیں۔  
سب مزے میں ہیں الامیرے۔ کیا کہا میں نے؟ کچھ نہیں میں کہہ رہا تھا میں بھی  
بہت ٹھاٹھ کر رہا ہوں آج کل۔ نام بنام سب کی خیریت بتاؤں؟ پوچھو..... قدیر  
اور قمرن؟ بھئی واہ۔ تم کو خوب یاد رہے۔ تم کو کون چیز یاد نہیں ہے؟ سب یاد ہے؟  
تمہارا حافظہ بہت تیز ہے ماشاء اللہ قدیر تو زمانہ ہوا مرزا پورا واپس چلے گئے۔ موٹر  
کب کی بک گئی۔ کیوں بک گئی؟ اجی یہاں زندگیاں ہی بک گئیں۔ تم ایک موٹر  
لیے پھرتے ہو۔ تم نہیں جگے؟ ہاں ہاں میں کب کہتا ہوں میں تو اپنی بات کر رہا  
تھا۔ قیمت اچھی مل رہی تھی۔ بوسنی کا وقت تھا۔“

”اور پوچھو۔ کس کس کی خیریت دریافت کرنا ہے۔ چھٹکی۔ رم دیا؟ غضب خدا  
کا، تم کو چھٹکی اب تک یاد ہے؟ اس غریب کا انتقال ہو گیا۔ ہاں بڑا افسوس ہوا۔  
کیسے؟ برسات میں گلفشاں مرحومہ کے باغ کی گھاس کھود رہی تھی، سانپ نے  
کاٹ لیا۔ ہاں کئی سال ہو گئے اسے مرے۔ گنگا دین تو آج کل کہیں مدھیہ

پروڈیشن میں ٹریکٹر چلا رہا ہے۔ اس نے اپنی بتا رہی تھیں ایف۔ اے۔ پاس کر لیا ہے ہاں۔ اسے اصل ترقی کہتے ہیں۔ میں گنگا دین کے کیریئر کا احوال سن کر بہت خوش ہوا اور باتیں کروں؟ نہیں میں تم سے مل نہیں سکتا۔ مجھے فرصت نہیں۔ ہیں؟ تمہاری کانفرنس تین بجے ختم ہوگی، اس کے بعد تم میرا انتظار کرو گے، الپس میں؟ کیا کرو گے انتظار کر کے۔ نہیں۔ میں کسٹوڈین سے ملنے جا رہا ہوں پی بلاک۔ اس کے بعد۔ اچھا دیکھو پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ مگر میرا زیادہ انتظار نہ کرنا۔ اچھا سولونک۔“

سمال نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ راج ورتی دروازے میں کھڑی تھی۔ ”اچھا اب میں چلا۔“

”جلدی آنا۔“

”ہاں ہاں۔“

”تمہارے ناشتے کے لیے کیا کیا بنا دوں۔“

”وہی سب جو ہمیشہ بناتی ہو۔“ وہ ذرا جھنجھلا کر بولا۔ تم یہ اپنا بہنوں کی محبت والا جال پھیلاتی رہو۔ میرا دل اس سے تھوڑا ہی پلیج سکے گا۔ نہ میرے قدم ڈلگائیں گے، میں مضبوط ہوں، میں بوڑھا ہوں مجھ میں ضبط اور توازن اور سکون ہے۔ اس نے دل میں کہا۔

وہ جمناروڈ سے نکلا۔ علی پور روڈ، کشمیری گیٹ۔ سینما کے بڑے بڑے اشتہار، ال قلعہ کا میدان، دکانیں، نئے نئے بازار، کنٹ پلےس پہنچ کر وہ دکانوں میں رکھی ہوئی نئے ہندوستانی مصوروں کی پینٹنگز دیکھتا پھرا۔ برآمدے میں سے



گزرتی ہوئی ایک لڑکی میں اسے سریکھا کی جھلک نظر آئی، وہ ذرا آگے بڑھا، وہ کوئی اور لڑکی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی تین بجنے میں بہت دیر تھی۔ سارا دن باقی پڑا تھا۔ سریکھا ہی سے چل کر مل لوں۔ اس نے کاہنی سے سوچا۔ ”یہاں ڈانس اکیڈمی کا پتا بتا سکتے ہیں۔“ اس نے ایک آدمی سے پوچھا۔

”کون سی ڈانس اکیڈمی؟ یہاں بے شمار ڈانس کالج ہیں۔ آپ سنگیت اکادمی تشریف لے جائیے، وہاں سے آپ کو شریعتی سریکھا دیوی کا پتا معلوم ہو جائے گا۔“ اس نے یہ ارادہ بھی ترک کیا۔ اپنے جانے پہچانے کنٹا پلیس میں وہ اجنبیوں کی طرح گھومتا رہا۔ موٹر کاروں، خوشحال، مطمئن انسانوں، مصروف کارباریوں، عظیم الشان دکانوں کے وسط میں کھڑے ہوئے اسے بے حد ڈر لگا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ جانے سے پلے اسے سول لانز کے تھانے میں جا کر اطلاع کرنی ہے کہ وہ ہندوستان سے جا رہا ہے۔

بھادوں کے مہینے کی دھوپ بڑی سخت تھی، وہ بہت مضطرب، بہت تھکا ہوا تھا، وہ چاہتا تھا کہ پر لگا کر کراچی واپس پہنچ جائے۔ اس نے طے کر لیا اب وہ ہندوستان کبھی نہیں آئے گا۔

”وہ دیکھو سامنے سے کون آتا ہے؟“ اس نے ڈاکٹر مینس کریمر کو دیکھ کر مصنوعی بشارت سے کہا۔ دل میں خوش بھی ہوا کہ پیارسی دوپہران کی سنگت میں کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گی۔

”ہلو۔ ہلو۔ مائی ڈئیر بوائے۔“ ڈاکٹر مینس کریمر نے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”کیا عجیب اتفاق ہے۔“

ان کے ساتھ انفرمیشن ڈویژن کی ایک لڑکی تھی۔ اس نے متانت سے کمال کے سلام کا جواب دیا اور ایک پمفلٹ سے پنکھیا جھلاتی رہی۔

”بڑی شدید گرمی ہے۔“ ڈاکٹر ہینس کریمر نے خوشی سے باغ باغ ہوتے ہوئے کہا۔

”بالکل خالص مشرقی موسم!!“

کمال بھی تھکلا ہنسا۔

”میں ڈاکٹر کو قومی میوزیم لیے جا رہی ہوں۔ آپ بھی چلے آکر آپ کو اور کوئی کام نہ ہو۔“ لڑکی نے، جس کا نام شاید ماری ارونا باجپئی تھا، کمال کو مخاطب کیا۔ کمال نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگر نماز زندہ ہوتی تو آج وہ بھی اسی طرح کام میں مصروف ہوتی۔

”جی ہاں۔ ضرور۔“ اس نے جواب دیا۔

براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے دو اور یورپین دانشوروں کو ہمراہ لیتے ہوئے وہ راشٹر پتی بھون روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر ہینس کریمر اور ان کے ساتھی اسی دنیا کے باسی تھے جس میں کمال کچھ عرصہ قبل خود شامل تھا۔ ان کا بھی زندگی سے وسیع تر آؤٹ لک تھا۔ انہیں بھی چیزوں میں رمزیت نظر آتی تھی۔ ان کے پاس بھی علم کے علاوہ اور اک تھا، یہ بدھ جینتی کے لیے ہندوستان آئے ہوئے تھے اور سر ینگرے کے ایک ہاؤس بوٹ میں رہ کر ہندوستانی فن سنگتراشی پر ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ ان سے ملنے کے لیے ان ہی کی طرح دوسرے ملکی اور غیر ملکی دانشوران کے یہاں جاتے، یہ ہاتھ ملتے جاتے اور فرش پر کشن اور چٹائیاں بچھاتے اور سبز چاء تیار

کرتے اور کیل کا تذکرہ ہوتا۔ ”ابھی میں رائیل سکرائٹن سے ملنے الموڑے گیا تھا۔“ ڈاکٹر کریمر نے مال سے کہا۔

”خوب۔“

”مارگ میں میرا نیا مضمون ضرور پڑھنا۔“

”ضرور۔“

”تم ملک راج سے واقف ہو۔“

”جی ہاں۔“

پھر انہوں نے دوسرے ناموں کا ذکر شروع کیا: ہمایوں کبیر۔ تارا علی بیگ۔ ڈاکٹر حسین۔ کارل کھنڈالا والا۔ مال موڑ کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

راشٹرپتی بھون کی سیڑھیوں پر پہنچ کر ڈاکٹر ہینس کریمر نے ہاتھ ملتے ہوئے نظریں اوپر اٹھائیں اور سونے کے شیروں کے نیچے لکھا ہوا ”سیئہ میو جیتے“ بآواز بلند پڑھا۔ ”سچ جیتے گا۔“ انہوں نے مال کی خاطر اس کا ترجمہ کیا اور ذرا کی ذرا آنکھیں بند کر لیں پھر وہ سب ماری ارونا کی قیادت میں اندر داخل ہوئے۔ سابق وائس ریگل لاج کے عظیم الشان مرمری ایوانوں میں بے اندازہ خنکی تھی جو باہر کی کڑی دھوپ کے مقابلے میں بہت آرام دہ معلوم ہوئی۔ عہد عتیق اور قرون وسطیٰ کے مجسموں نے مال کو اپنی بے نور آنکھوں سے گھورنا شروع کیا۔ ڈاکٹر ایک ایک مجسمے کے سامنے ٹھٹھک کر فرانسیسی یا جرمن میں تبادلہ خیالات کرتے۔ دربار ہال میں وائس رے ہند کے تخت کی جگہ مہاتما بدھ کا شاندار قدیم مجسمہ ایستادہ تھا۔ اس کے پس منظر میں عنابی رنگ کے مخملیں پردوں کا آبشار سا گر رہا تھا۔ مال

تخت کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف برٹش میوزیم کا سا ماحول طاری تھا۔

”یہ تو عارضی میوزیم ہے۔“ اس کے قریب آ کر ماری ارونا نے معذرت خواہ انداز میں کہا۔ ”ہمارا زیر تعمیر قومی عجائب خانہ ہمارے ورثے کے نمایان شان ہو گا۔“

”جی..... یقیناً.....“ کمال نے جواب دیا۔ سال بھر قبل وہ خود اسی دلی میں نام سے اسی لہجے میں باتیں کرتا رہا تھا۔ آپ نے ہماری تازہ ترین عمارات دیکھیں؟ ریزرو بنک آف انڈیا..... اور..... اخباروں کے دفاتر کی فلیٹ اسٹریٹ جو بننے والی ہے اور اسوکا ہوٹل..... ماری ارونا نے بحیثیت ایک فرض شناس انفارمیشن آفیسر اس سے پوچھا۔

”جی۔“ کمال نے اسے یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ خود بھی یہیں کا رہنے والا تھا

”آئیے ادھر چلیں۔ آپ نے ہمارے موہن جوڈارو کی قدیم تہذیب کی ”ڈاننگ گرل“ دیکھی؟“

ماری ارونا اسے سنگ مرمر کی گیلریوں میں گھماتی پھری چن ہو دارو۔ موہن جوڈارو وادی سوات۔ ہڑپہ۔ تکشلا۔ روپڑ۔ اب ہم موجودہ زمانے کے قریب آتے جا رہے ہیں۔ اس نے ایک جگہ رک کر کہا۔ ”یہ پتھر دیکھیے، یہ اشومیدھ تیسری صدی قبل مسیح میں دہرہ دون کے علاقے میں منعقد کیا گیا، یہ ابی چھتر کے مجسمے ہیں۔ ابی چھتر کو اب ضلع بریلی کہتے ہیں۔“ اس نے مڑ کر ہینس کریمر سے کہا

جو اس دوران ان کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

چلتے چلتے وہ ایک عورت کے مجسمے کے سامنے آئے۔ archaic وضع کا تھا۔  
”یہ شروعاتی کی کھدائی سے اسی سال اکا ہے۔“ ایک لڑکی کدم کی ٹہنی جھکائے  
درخت کے تنے سے لگی کھڑی تھی۔ ”سرخ مٹی کی اس مورتی کا منہ غالباً چوتھی  
صدی قبل مسیح ہے۔“ ڈاکٹر ہینس کریمر نے اپنا مسودہ نکال کر پروفیشنل  
آرکیالوجسٹوں کے انداز میں اپنے فرنیچر ساتھی سے کہا۔

وہ ٹھنڈے فرش پر مورتی کے آگے بیٹھ گئے۔ مورتی کے نقوش میں قوت تھی،  
زندگی کی سرخی اور تپش۔ ماورائے حیات کے بجائے حیات۔ زمین کی اپنی تخلیق۔  
اس کی بانہیں بہت گداز تھیں۔ آنکھیں بہت بڑی بڑی، جسم مضبوط اور سڈول،  
خطوط اور حجم اور توازن شانت اور لوح اور حرکت کے احساس کا مکمل امتزاج، ایک  
لرزہ خیز حسن پتھروں سے تشکیل ہوا ہے: بھاری، منجمد، خوفناک، موسیڈورال نے  
ایٹس کی مانند کہا۔

”فن سنگتراشی کے آئندہ نظریوں کی داغ بیل یہیں سے پڑی۔“ ڈاکٹر کریمر  
نے کہا۔ ”یہ تھرا سے پہلے کا نمونہ ہے۔ اب ہمیں اس فن کی تاریخ کے متعلق بہت  
سی تھیوریز کو بدلنا پڑے گا۔“

”اس عہد کے فن کاروں کے سامنے یہ مسئلہ رہا ہوگا کہ خیال محض علامت کے  
ذریعے دیکھنے والے تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ اسی نظریے نے ویدوں کے عہد کے  
بعد اصنام پرستی کی ترویج کی۔“ ارونا نے اظہار خیال کیا۔

روپ اور اروپ اور بھاؤ اور ابھاؤ کے متعلق وہ جو کچھ جانتا تھا اب وہ کس سے

کہنے جائے گا۔ اس سارے علم کا اسے اب کوئی فائدہ نہیں۔ کمال نے سوچا۔ اس حیرت انگیز مورتی کے پاس اس کے لیے کوئی پیغام نہیں۔

”ویدانت کے نزدیک خالق جمالیاتی تجربہ غیر متعلق آئندہ ہے۔“ ڈاکٹر راول نے کہا۔ ”بکلی کی طرح اکھنڈ ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ خود ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی سو پرکاش ہے۔ جس طرح فن کار کا تصور و شواکرمین کے تصور میں شامل ہے اسی طرح دیکھنے والا آتما یا خود میں موجود ہے جو ہمہ وقت دیکھتا ہے اور جس کا سروپ ساری کائنات کا مظہر ہے۔ و شواکرمین روپم روپم پر تپتی روپ۔ تمہارا کیا خیال ہے ویدانت کے اس نظریے کے متعلق؟ تمہیں یہ مجسمہ اچھا لگایا تم متھرا کے اسٹائل کو ترجیح دو گے؟“ ڈاکٹر موصوف نے مزید کمال سے پوچھا۔

”بھوکشتم نا پرتی بھاتی کم چت۔ (بھوکے کو کوئی شے اچھی نہیں لگتی) میں جمالیات اور ما عبد الطبیعیات کی موٹا گافیاں کرنے سے قاصر ہوں۔“ اس کی آواز کی بے پناہ تلخی اور اداسی نے سب کو چونکا دیا۔

”یہ کمیونسٹ ہے۔“ ڈاکٹر آئیورٹ نے طے کیا۔

اس کے فرسٹریشن کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کماری ارونا نے سوچا جو امریکہ سے نفسیات میں ڈاکٹریٹ کر کے آئی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر کمال کو دیکھا اور سوچا۔

پڑھا لکھا لڑکا ہے اور کتنا خوش شکل۔ ”آپ سنسکرت بھی پڑھ چکے ہیں۔“ اس نے توسیفنا پوچھا۔

”پڑھی تھی ایک زمانے میں۔“ کمال نے مختصر جواب دیا۔

پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ کسٹوڈین سے ملنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔

وہ مورتی کے چہرے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مورتی کا پتھر خنک تھا۔ پتھر

جو timeless become کی علامت ہے۔ حال کا بہاؤ اس قدر تیز ہے

کہ جو پتے پچھلے لپٹوں سے بہتے ہوئے آ رہے ہیں، وہ اب ان کی دلدل میں

پھنس گئے ہیں اس نے دل میں سوچا۔ جیہی سے تو میں کہتا ہوں، ایک کدال لے

کر ان پتوں، اس کوڑے کرکٹ کی صفائی کر دو۔ آج کل میں صفائی میں لگا ہوں:

دماغ کی، دل کی، ذہن کی، عقل کی صفائی، اسپرنگ کلینگ۔ اس ماضی سے میں

ناطہ توڑ چکا ہوں۔ اس نے ان یورپین ماہرین کو بتانا چاہا، پھر وہ مورتی کی طرف

مڑا۔ اسی لیے ہٹرواسٹی کی سدرشن یکشنی! جو کوئی بھی تیرا بنانے والا تھا وہ اپنا پیغام

مجھ تک نہیں پہنچا سکتا۔ تیرا خالق اب مجھ سے کمیونی کیٹ نہیں کرے گا۔ میں روپ

اور اروپ کی بحث میں حصہ لینے سے انکار کرتا ہوں، یہ قومی عجائب خانہ مع

سارے ماضی، سارے ہندوستان کے میں نے کماری ارونا کو سونپا، وہ وہاں سے

آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ آگے چلتا ہوا گیلری عبور کرنے میں مصروف ہو گیا۔

اس کے کانوں میں یورپین دانشوروں کی آواز آتی رہی۔

”کاش ہم جان سکتے کہ سنگتراش کا نام کیا تھا جس نے یہ مورتی بنائی۔ مگر اس

عجیب و غریب ملک میں تاریخ کی کوئی حیثیت نہیں۔“ ڈاکٹر کریمر کہہ رہے تھے۔

”واقعات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ حقیقت روایت ہے۔ وقت کا فاصلہ کوئی معنی

نہیں رکھتا۔ لمحہ افانی ہے۔ انسان گمنام ہے، اس کی تخلیقات، فن پاروں،

تصنیفات کی بھی ابدیت کے اس سمندر میں کوئی علیحدہ حیثیت نہیں سمجھی جاتی۔“

”ہاں۔“ موسیو راول نے کہا۔ ”انسان مر جاتا ہے تو اس کو جلا دیا جاتا ہے  
کیونکہ اس کی تاریخی معنویت کچھ نہیں۔“

”کوئی کرائس ہندوستانی ذہن پر اثر انداز نہیں ہو سکتی کرائس بھی وقت بھی  
شامل ہے، تاریخ نہیں ہے۔ ماضی، مستقبل، فنا، بقا..... کسی شے کا وجود نہیں لہذا  
اب اس جسم کو جلا دو کیونکہ یہ اب حال میں شامل نہیں رہا۔“ ڈاکٹر اسٹیوارٹ نے  
کہا۔

”اسی لیے مشرق کے فن کار نے اپنا نام ثبت کرنے کی ضرورت کبھی نہ سمجھی۔  
کاش ہم ان سنگتراشوں کے متعلق بھی کچھ جان سکتے۔“ ڈاکٹر کریمر نے چاروں  
طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہاں کتنے مائیکل“ ”نجلو اطمینان سے ہنسی خوشی گمنام مر گئے!“  
سمال گیلری سے باہر نکل آیا۔

”یہ احساس کہ ہم خود وقت ہیں۔“ موسیو راول کہہ رہے تھے۔  
”وہ مت کو محسوس کیا جاتا ہے۔ وقت کو صرف سوچا جاسکتا ہے۔“ ڈاکٹر کریمر  
کہہ رہے تھے۔

سمال سیڑھیاں اتر کر باہر سرخ بجری کی چوڑی سڑک پر آ گیا اور پی بلاک کی  
طرف روانہ ہو گیا۔

کسٹوڈین سے دماغ کھپانے کے بعد وہ گوتم نیلمبر سے ملنے واپس نہیں گیا، وہ  
سیدھا لاج کے گھر پہنچا اور اس نے لاج سے کہا، اگر میرا فون آئے تو کہہ دینا  
میں ابھی واپس نہیں آیا ہوں، پھر وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے اسٹیشن جانے کے  
وقت تک پڑا سوتا رہا۔



گوتم ایک گھنٹے تک ریٹوران میں مالم کا منتظر رہا۔ اس نے کئی جگہ ٹیلیفون کیے، جب مالم کی طرف سے بالکل ناامید ہو گیا تو پھر اپنے دفتر لوٹا۔ بدھ جینی کے سلسلے میں حکومت بڑے زوروں کی پبلیٹی کر رہی تھی اور اسے چراغ جلے تک دفتر میں مصروف رہنا پڑتا تھا۔ ایک انتہائی ضروری اور فوری فائل کے سلسلے میں اس نے اپنی نمبر نو ماری ارونا باجپئی کو فون کیا۔

مگر معلوم ہوا کہ ماری ارونا باجپئی ڈاکٹر کریمر کو لے کر نیشنل میوزیم گئی ہوئی ہیں۔

لاحول والاقوة! اس نے غصے سے کہا۔ مالم سے نمل سکے کی وجہ سے وہ بے حد مضطرب تھا۔ اسے اس ملک پر اپنے آپ پر، مالم پر، دنیا کی ہر چیز پر غصہ آ رہا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو ڈاکٹر کریمر اور ڈاکٹر اسٹیوارٹ اور ماری ارونا باجپئی..... ان سب کو کچا جھاڑا۔

فائل بے حد ضروری تھی اور اسی جلد از جلد محکمے کے جوائنٹ سیکرٹری کو پہنچانا تھا، وہ کاریں بیٹھ کر راشٹر پتی بھون پہنچا۔ میوزیم کے اندر جا کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر وہ لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔ بے دھیانی سے وہ کمروں میں گھومتا رہا۔

ایک مورتی کے سامنے انفرمیشن ڈویژن کے پمفلٹ پڑے تھے جو شاید ڈاکٹر کریمر یہاں بھول گئے تھے۔ گوتم نے جھک کر وہ اٹھائے، پھر اس نے بے دھیانی سے مورتی کو دیکھا۔ شراوتی کی سدرشن پکشنی۔

اس کی شکل بھی! کیسی تھی؟ اس نے دفعتاً سوچنا شروع کیا، پھر اس نے غصے

سے چلتے چلتے مرمریں فرش پر ذرا زور سے پیر پٹنے۔ تم سمجھتی کیا ہوا اپنے آپ کو  
میں نے تمہیں کبھی کچھ بھی نہیں سمجھا۔ میں تو تمہاری شکل بھی بھولتا جا رہا ہوں۔ شکل  
تو محض ہیولی ہوتا ہے۔ میرے دل کے اندر جو روپ محفوظ ہے اسے صرف  
وشوا کرمن ہی پہچان سکتا ہے۔

مورتی، جو شراوتی کی کھدائی میں برآمد ہوئی تھی، کدم کی ٹہنی جھکائے اپنی بڑی  
بڑی آنکھوں سے اسے دیکھا کی۔ گوتم نے اس کے قریب جا کر اس کے چہرے کو  
چھوا۔ archaic سنگتراشی کا اچھا نمونہ ہے، اس نے دل میں کہا۔ کلچرل پبلیسی  
کے رسائل میں اس تازہ دریافت کے متعلق ایک مضمون ہو جانا چاہیے۔ اس نے  
ایک مستعد اور فرض شناس پبلیسی ایکسپرٹ کی طرح سوچا، پھر باہر نکل آیا۔

شام پڑے مال لانج کے گھر سے اسٹیشن کے لیے روانہ ہوا۔

”ابھی ٹرین میں دیر ہے۔ آؤ تمہیں گھملا لائیں۔“ جیجائی نے تجویز کیا۔ ”تم  
دن بھر گھام میں مارے مارے پھرے ہو اب تازہ ہوا کھاؤ گے طبیعت ٹھیک ہو  
جائے گی۔“ وہ پھاڑی پر گئے۔ حد نظر تک نہیں بستیاں کی روشنیاں تیزی سے جگمگا  
رہی تھیں۔ ٹیلنگر آزاؤنگر مٹر ولباغ، راج کے علاقے میں کالجوں کی دنیا میں چہل  
پہل تھی۔ یونیورسٹی، میرانڈا ہاؤس، سینٹ اسٹیونز، بے شمار نئے کالج بن گئے  
تھے۔ سپروہال میں بڑے غلام علی خاں کا کونسرٹ ہو رہا تھا۔ ایک تھیٹر میں ہیر  
رانجھا کا اوپیرا دکھایا جا رہا تھا۔ آرٹ گیلریوں میں نمائشیں منعقد ہو رہی تھیں۔  
بڑی بڑی دکانوں پر ساریاں پہنے، جوڑے باندھے سیلز گرل باوقار انداز میں  
سامان فروخت کر رہی تھیں۔ برلا مندر کے سامنے ہجوم تھا۔ اوپر سنگ مرمر کے

فرش پر جگہ جگہ لوگ منہ کے بل پڑے ہوئے تھے۔

لکشمی نرائن کی بھدی، بد ذوق، خالص مڈل کلاس بنیا مورتیاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجمعے کو دیکھ رہی تھیں۔ اوپر گیتا بھون میں ہارمونیم پر کیرتین ہو رہا تھا، چاندنی کے فرش پر مڈل کلاس عورتوں اور مردوں کی بھیڑ تھی۔ جامع مسجد کے سامنے شکستہ حال مسلمان اپنی دکانیں لیے بیٹھے تھے۔

”دلی دنیا کے خوبصورت ترین دارالسلطنتوں میں سے ہے۔“ کار میں اس کے پاس بیٹھی ہوئی راج خوشی سے کہہ رہی تھی۔ ”کل امریکن فیئر کی بیوی روشن آراء کلب میں مجھ سے کہہ رہی تھی کہ یہ تو واشنگٹن کی طرح خوبصورت ہے اور ٹوکیو کی طرح ترقی یافتہ..... اور پرانی دلی کو دیکھ کر لندن کی گلیاں یاد آتی ہیں۔ تم تو دنیا گھوم آئے ہو، ٹھیک ہے یہ بات؟“

راج گھاٹ میں لوگوں کے غول ہوا خوری کر رہے تھے۔ فوارے چل رہے تھے ایک بوڑھی عورت گاندھی جی کی سادھی کے سامنے سجدے میں پڑی تھی۔

ٹرین کا وقت ہو گیا، وہ راج اور جیجی جی کو خدا حافظ کہہ کر کمپارٹمنٹ میں بیٹھا۔ ٹرین آہستہ آہستہ اسٹیشن سے باہر نکلی۔ جمنہ کا پل۔ ال قلعے کی دیواریں۔ بازار۔ سڑکیں۔ مکانات۔ وہ کھڑکی میں سے دیکھتا رہا۔ وہ جا رہا ہے۔

براؤ کا سٹنگ ہاؤس کے زینے پر رکھا ہوا نٹ راج کا عظیم الشان مجسمہ۔ جامعہ نگر۔ نظام الدین اولیاء۔ متھرا روڈ۔ سب یہیں رہ جائے گا۔ زندگی جاری رہے گی۔ ایک آدمی کے نکل جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ لوگ اب مختلف تھے۔ دوسرے راستے پر جا رہے تھے، ان کے اور ممال کے پاس اب کوئی موضوع

مشرک نہیں۔ اسے اب ان سے کوئی غرض نہیں، وہ بھی اب مال کی غیر موجودگی کو محسوس نہیں کریں گے۔

پریس کلب میں دنیا بھر کے اخباروں کے نمائندے جمع تھے۔ لوک سبائیں پنڈت نہرو تقریر کر رہے تھے۔ جامعہ نگر میں اردو ڈرامے پر ریسرچ کی جارہی تھی۔ لٹ کلامندریں سریکھا دیوی رقصاں تھیں۔

موسیقی۔ تھیٹر۔ موویز۔ ڈوکومنٹری فلمز۔ بچوں کے تھیٹر اور ہسپتال۔ عورتوں کی یونیورسٹیاں۔ فیشن شوز۔ ہیلے یونیورسٹیوں کی انٹر کنڈیشنڈ لائبریریاں۔ دوسرے پانچ سالہ پلائل کے بلیو پ رنٹ۔ بھاری انڈسٹری۔ افلاس۔ سوشلسٹ اسٹیٹ۔ نئی دلی کے انتہائی پوش ریسٹوران۔ امپریل دلی۔ سوشلسٹ دلی۔ ضلعوں کی کلکٹر اور رڈسٹرکٹ مجسٹریٹ خواتین۔ سادھو اور بھکاری۔ بجلی کی روشنی سے جگمگاتے ہوئے قصبے اور گاؤں۔ بھودان کی تحریک۔

قدسیہ باغ، روشن آراء باغ اور بیٹا روڈ پر ٹھنڈی ہوائیں چلی رہی تھیں۔ اولڈ سول لائنز کی کوٹھیوں میں پھول کھلے تھے۔ ان کے گھاس کے قطعوں پر پرانے زمانے کے کاستھ خاندانوں کے چند افراد بیٹھے طباطبائی کی شاعری پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔

نیشنل فزیکل لیبارٹریز کی عظیم الشان انٹر کنڈیشنڈ گیلریوں میں سے سائنس دان لڑکیاں سرعت کے ساتھ نکل کر انٹر اماڈرن سیلف سروس کیفے ٹیریا میں داخل ہو رہی تھیں۔ نئی دلی میں آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ روشن آراء کلب کے وسیع لان پر پنکھوں کے نیچے چند اعلیٰ عہدے داروں اور سٹیٹھوں کی بیبیاں تاش کھیلنے

میں مصروف تھیں۔

ٹرین اب کھیتوں میں آگئی ہر سفر میں بڑی معنویت ہے۔ ہمارا ادھر سے ادھر جانا۔ ایک مرتبہ گوتم نے کہا تھا جب وہ بقول طلعت خلیل جبران کے المصطفیٰ کی طرح مکالے ادا کیا کرتا تھا۔

ہندوستان کا سارا سہل سفر ہے۔ چلتے رہنے، تلاش کرنے کی عادت.....  
شاید ایشپنگلو نے لکھا تھا۔ اس نے راویا کرشنن کی کتاب اٹھائی:  
”ہندوستانی فلسفے میں کوئی کسی کو حکم نہیں دیتا: یہ ضرور کرو یا یوں تم کو کرنا پڑے گا۔“

یہاں انسان اپنے فعل کو خود مختار ہے۔“

اس نے کتاب کھڑکی سے باہر پھینک دی اور سیٹ پر لیٹ گیا۔

پنجاب کے اسٹیشن گزر رہے۔ انبالہ، لدھیانہ، امرتسر، دیواروں پر اردو میں فلموں کے اشتہار لگے تھے۔ پلیٹ فارم کے دھلے ہوئے فرش پر سکھ عورتوں کی رنگیں شلواریں رات کی روشنی میں جھلما رہی تھیں۔

صبح ہوئی۔ ٹرین امرتسر پہنچ رہی تھی۔ جگہ جگہ مسلمان پیروں کی زیارات تھیں جو سنسان پڑی تھیں۔ سکھ عورتوں کے غول پگڈنڈیوں پر سے گزر رہے تھے۔ سکھ ہوا ہے کھیتوں میں پہنچ چکے تھے۔ جگہ جگہ اب بھی مکان جلے ہوئے پڑے تھے۔  
امرتسر کے پلیٹ فارم پر شکستہ حال برقعہ پوش عورتیں اور بوڑھے سالاخوں کے ادھر ویزا پر دستخط ہونے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ایک مونا سکھ افسر ایک غریب مسلمان عورت سے درشتی سے پوچھ رہا تھا: ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ایمنہ، یہ میری بیٹی سکیئنہ ہے، یہ پاکستانی ہے۔ میں خورجے سے اسے لینے آئی ہوں۔ اس کا باپ مر رہا ہے۔“ پاکستانی سکیئنہ اپنی بھارتی ماں ایمنہ سے علیحدہ، ساخنوں کے اس پار کھڑی، سبھی نظروں سے افسر کو دیکھ رہی تھی۔ ”اس کا وی جا ٹھیک ہے نا۔“ ماں پر امید آواز سے پوچھ رہی تھی۔

ٹرین چلی۔ دونوں طرف کے سپاہی ڈبوں میں چڑھے۔

ایک دوسرا ملک شروع ہو گیا۔ دوسرا راجی گھاس پر کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔

میں اب پاکستان میں ہوں۔ ہندوستان سے آیا ہوں۔ مہاجر۔ یو۔ پی۔ کا مسلمان۔

مہاجر..... پناہ گزین..... بے خانماں۔

جب ٹرین نے بارڈر کراس کیا تو وہ، جوا تنے دنوں سے اپنی ساری ہمت صرف کر کے اپنے آنسو ضبط کر رہا تھا، کھمبے کے پاس ایک سرداجی کو کھپسیں نکالے، بندوق تانے کھڑے دیکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کا ہم سفر، جو پولیس کا افسر تھا اور امرتسر سے واپس جا رہا تھا، اسے غور دیکھ رہا ہے۔

کمال بہت پشیمان ہوا اور اسے لگا جیسے پولیس افسر کہہ رہا ہے: تم اب تک دو متضاد وفا داریوں کے دورا ہے پر کھڑے ہو، اعنت ہو تم پر۔

اسے محسوس ہوا جیسے ساری دنیا کی آنکھیں اس کی طرف لگی ہیں۔ تم ہندوستانی ہو، ہندوستانی جاسوس۔ ٹرین کے پہیوں میں سے بھی یہی آواز نکل رہی ہے:

جاسوس۔ غدار۔ جاسوس غدار۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ ٹرین آہستہ آہستہ لاہور اسٹیشن کے کسٹم کی سلاخوں والے حصے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

لاہور سے وہ ہوائی جہاز میں بیٹھا۔ ہوائی جہاز نے کراچی کی طرف پرواز کرنا شروع کر دیا۔

اب اس کی نئی زندگی اس کے سامنے تھی۔ اس نے ڈائری نکالی۔ کراچی واپس پہنچ کر اسے کتنے ضروری کام کرنے تھے۔ چچا فلاں سے کلیم کے متعلق۔ فارش کرانا تھی۔ کوٹھی کے لیے بلیک سے سیمنٹ اور لوہے کا انتظام کرنا تھا۔ مسٹر ایکس کو جم خانہ میں ایک پارٹی دینا تھی۔ بتاؤ میں کہاں جاؤں، اس نے خود سے سوال کیا۔ خراب، انحطاط پذیر سوسائٹی میں انسان کا شریف رہنا کہاں تک ممکن ہے؟ اس مسئلے پر سوچنے کی ضرورت تھی۔ اس نے انیر ہوٹس سے پھر کافی منگوائی اور ڈان اخبار اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

کابینہ میں کرائس۔ وزیر اعظم کا استعفیٰ۔ نئے وزیر اعظم کا جہانگیر پارک میں ملت سے خطاب۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان پر بادل تیزی سے پھیلنے لگے۔ کوئی دم میں بارش شروع ہو جائے گی۔

اس نے کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔

میں ہی لاش ہوں اور میں ہی گورکن اور میں ہی فوجہ گر۔ اس نے دل میں کہا اور سیٹ کی پشت سے سر کا کر آنکھیں بند کر لیں۔

کچی سڑک پر لڑکا بیل گاڑی ہانکتا ہوا جا رہا تھا۔ ایک اسٹیشن وگن دھواں چھوڑتی، دھول اڑاتی ایک دھچکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ سامنے ایک بیل گاڑی اور آ رہی تھی۔ گاڑی بان نے بیل کی دم مروڑ کر موٹر والوں کو ڈانٹا۔ ”دیکھ کر نہیں چلات ہو موٹریا۔ ابھی جو ہمرا بیل چمک جایت۔“ امریکن اخبار نویس نے فوراً کیمرہ نکال کر اس کی تصویر لے لی۔ پیچھے پیچھے ایک اور موٹر آ رہی تھی۔ اس میں بیٹھی ہوئی مسز راج واڑے نے منڈیا نکال کر جھانکا اور پھر لیڈی مکلیش ورماسے باتوں میں لگ گئیں۔ شرواستی ابھی بہت دور تھا۔ سورج بادلوں میں چھپا جا رہا تھا اور بارش سر پر کھڑی تھی۔ ڈاکٹر راول نے اگلی اسٹیشن وگن میں بیٹھے ہوئے ماری ارونا باجپئی سے پھر کچھ پوچھنا چاہا۔ اس نے فوراً پہلیکیشنز ڈویژن کی کتابوں کا بنڈل ان کی ناک میں ٹھونس دیا اور سوالات سے بچنے کے لیے ننگے میں جھٹ گئی۔ تیسری موٹر میں لڑکا اور جاپان کے چند بھکشو لدے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی فلمز ڈویژن کا کیمرہ مین تھا۔ دو تین کسمان لڑکیاں منڈیر پر کھڑی اس قافلے کو دیکھتی رہیں پھر ارہر کے کھیت میں کود کر کام میں لگ گئیں۔ دوسری طرف ٹریکٹر چل رہے تھے۔ سامنے کی موٹر میں بیٹھے ہوئے چند فوجوانوں نے جن گن من گانا شروع کر دیا پچھلی سیٹ پر زور سے باتیں ہو رہی تھیں۔ اس سارے ہنگامے سے بے نیاز گوتم بیلبر نے، جواب تک موٹر چلا رہا تھا، مڑ کر ماری ارونا باجپئی سے کہا:



”اگر وہیل تم لے لو تو میں یہاں سے اتر کر پیدل اپنے گھر چلا جاؤں۔“

”کیا بہت بوری ہو گئے؟“ ماری ارون نے پوچھا۔ اسے خود سفر کی تکان کی وجہ سے نیند آ رہی تھی۔

”ہاں میں یہیں سے کھیتوں کھیتوں نکل کر چلا جاؤں گا، شارٹ کٹ سے۔“  
ذرا جا کر نہادھو کر آرام کر لوں۔ صبح سے پھر یہ سارا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ موسیو راول اگر آپ اجازت دیں۔“ اس نے فریج معنف کو مخاطب کیا۔

اس نے موٹر روکی اور اتر کر منڈیر پر کھڑا ہو گیا۔ موٹریں ایک ایک کر کے دھول اڑاتی آگے نکل گئیں۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ بارش کا ایک قطرہ ٹپ سے اس کے بالوں پر آن گرا۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر ہوا کو سونگھا اور ارہر کا ایک ڈٹھل توڑ کر پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

میندر سنا شروع ہو گیا۔ اس نے پھوار سے بچنے کے لیے آم کے ایک گھنے جھنڈ میں پناہ لی۔ درخت کی جڑ پر بیٹھ کر وہ دیر تک ہوا اور پتوں کے سنگیت سنا کیا۔ آدھ گھنٹے بعد اس نے پھر اپنا راستہ طے کرنا شروع کیا۔ حد نظر تک کھیت لہلہا رہے تھی۔ شہر ابھی بہت دور تھا۔

گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے ٹھٹھک کر پیچھے دیکھا۔ راستے کی دھول بارش کی وجہ سے کم ہو چکی تھی گواں کے اپنے پاؤں مٹی سے اٹے تھے۔ برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرہ کے رنگ کے دکھائی پڑ رہے تھے۔ اسوک کے مارنجی اور سرخ پھول گہری ہریانی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کی ایسی جگمگاتی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں اور برگد

کے نیچے کسی من چلے ملاح نے زور زور سے ساون الاپنا شروع کر دیا تھا۔ آم کے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا۔ دوسرے کنارے پر دریائی گھاس اور نیلے پھولوں کی گھنی بلیں پانی کی سطح پر جھک آئی تھیں۔ برگد کے سائے تاریک ہو چلے تھے۔ سارس اور مور سمٹے سمٹائے اداس کھڑے تھے۔ چار پانچ آدمی انگوچھے کندھے پر ڈالے جلدی جلدی گاؤں کی اور قدم بڑھتا رہے تھے۔

بہرائچ کے مضافات شروع ہو گئے۔ سول انز کی سایہ دار سڑک پر پہنچ کر وہ اپنے باپ کی زرد رنگ کی دو منزلہ کوٹھی میں داخل ہوا۔

اس کے بابا سردیپ نرائن ان پر ٹہل رہے تھے۔

”ہلو بیٹے۔“ انہوں نے کہا۔ ”میں سمجھتا تھا۔ تم غیر ملکی مہمانوں کو لے کر سیدھے بہت مہت چلے گئے۔“

”جی نہیں بابا۔“ اس نے جھک کر ان کے پیر چھوتے ہوئے کہا۔ ”پہلے راستے میں ان کو ہم فارم دکھانے لے گئے تھے۔ ان لوگوں کو سوائے فارم دیکھنے اور کانفرنسیں اٹینڈ کرنے کے اور کوئی کام نہیں۔ ایک مہینے سے مجھے سر کھجانے کی مہلت نہیں۔“

”تمہاری ڈاکٹر باجپئی تو بڑی قابل لڑکی ہے۔ وہ ان کو سارا ڈوپ دے رہی ہوگی۔“

”جی“

پھر وہ اندر جا کر اپنی ماں سے ملا۔

”دہنتی بوا کہاں ہیں؟“ اس نے غسل خانے میں نہاتے ہوئے آواز دی۔

”شہر میں، ان کے پاس بھی ہو آنا۔“

”جی اچھا۔“

”تم اچھی طرح ہو بیٹے۔“

”جی ہاں، بچن کا بیاہ کب ہو رہا ہے؟“

”اگلے پھاگن میں۔“ ماں نے جواب دیا۔

”پرکاش چاچا کی کوٹھی بن گئی۔“

”نہیں۔ وہ خان بہادر محمد حسن، نہیں تھے، ریٹائرڈ نج۔ وہ پاکستان چلے گئے،

ان کی کوٹھی نیلام ہو رہی تھی۔ وہ پرکاش نے لے لی، بہت سستی مل گئی۔“

غسل خانے سے نکل کر کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اسی طرح کی دو چار اور

گھریلو باتیں لیڈی دیپ زائن سے اس نے کہیں۔ پاکستان کے نام پر اس کے

ذہن کے تار جھنجھنا اٹھے۔ پاکستان کو تو وہ ہمیشہ بھلائے رکھتا تھا حالانکہ ابھی اسے

شراوتی کے ان مغربی زائرین کو کشمیر کا مسئلہ بھی سمجھانا ہوگا۔

اس کا دم بے طور گھبرانے لگا۔ اس پر وہی وحشت طاری ہو گئی جس نے چند

روز قبل اسے نئی دہلی میں آنا دبوچا تھا۔

”میں ذرا ہوا کھانے دریا تک جاتا ہوں۔“ اس نے اپنی ماں سے کہا۔

”ابھی تو اتنا لمبا سفر طے کر کے آرہے ہو، اب پھر چل دیے۔ لیٹ کر آرام

کرو۔“ ماں نے پریشان ہو کر کہا۔

وہ باہر نکل آیا اور اپنے باپ کی کار لے کر دریا کی طرف چل دیا۔ بارش ختم ہو

چکی تھی اور ہوا بند تھی۔ دریا کے کنارے پہنچ کر وہ ایک شکستہ مندر کی سیڑھیوں پر جا

بیٹھا۔ یہاں مکمل تنہائی تھی اور وہ بالکل خالی الذہن ہو جانا چاہتا تھا۔ اس لمحے اسے زندگی میں پہلی بار خیال آیا: کاش نروان ممکن ہوتا۔ خوف، تنہائی کا احساس، رنج، نفرت، فرار کی خواہش، وسعت اور اضافیت کا تصور..... نروان..... جو زندگی سے، موت سے، سونے جا گئے، محبت، رحم اور التعلقی سے ماورا ہے اور پھر بھی حقیقی ہے۔ معدومیت..... صفر..... صفر.....

کیا یہ غیر ملکی مفکرین سمجھ سکتے تھے کہ اس کے، ہندوستان کی روح کے دکھ کیا ہیں؟ اس نے سگریٹ سلگایا اور مندر کے فرش پر نیم دراز ہو گیا۔ برسات کا زمانہ ہے، یہاں سانپ اور کیڑے مکوڑے ضرور ہوں گے۔ اس نے اطمینان سے سوچا۔ اسے لگا گویا جنگل سے اس کی بہت پرانی دوستی ہے۔ آخر وہ انہی فضاؤں، انہی پودوں اور درختوں کی معیت میں پلا بڑھا تھا۔

دفعتاً اسے پیروں کی آہٹ اور کسی کی مدہم ہنسی کی آواز سنائی دی۔

”تم کون ہو بھائی۔“ نیچے سے کسی نے پوچھا۔

”میں ہوں۔“ گوتم نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

دوسرا نوجوان مندر کی منڈیر کو دکر اندر آ گیا۔

”یہ کیا وحشت ہے؟ میں تم کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ تمہارے گھر گیا۔ تمہارے

اماں ابائے بتلایا کہ تم دریا پر براجم رہے ہو۔“

”ہاں یا۔ اس وقت غیر معمولی جیس طاری ہے۔ ایک پتا تک نہیں مل رہا۔

تمہارا دن کیسا بیتا۔“

”بور ہو گئے میاں۔“ ہری شنکر نے قریب کی سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ

بدصا جنینی کچھ دن اور اسی طرح چالو رہی تو استعفیٰ مرا با حسرت ویاس۔ دیکھو اسی  
چکر میں میں لکھنؤ نہ جا سکا۔ بنگلور سے ہے۔ ایس کا تار ملتے ہی پہنچا دلی اور اب  
یہ یا تری لوگ، ارونا با چئی کہہ رہی تھی کہ یہاں سے سیدھے کیل وسنوا اور گیا  
جانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ راستے بھر ڈاکٹر مینس کریم نے مجھے مہایانا اور زین کے  
فری پروہ وہ لیکچر دیے ہیں کہ پڑا ہو گیا میرا تمہاری موٹر میں تو صرف موسیو راول  
ہی تھے۔“

پھر یک بیک وہ چپ ہو گیا۔ ندی پر شفق کی سرخی پھیل گئی تھی۔ وہ دونوں بے  
حد اداس ہو گئے۔

”یار گوتم۔“

”ہاں۔“

”یار مال ہمیں دغا دے گیا۔“ ہری شکر نے چند لمحوں بعد آہستہ سے کہا۔  
”تم کو پتا ہے سالہا دلی ہوتا ہوا گیا۔ اگر مجھے تار دے دیتا تو میں اس سے آ کر  
وہیں مل لیتا۔“

”میں تو دلی میں موجود تھا اس کے باوجود وہ مجھ سے نہیں ملا۔“ گوتم نے آہستہ  
سے جواب دیا۔ وہ دونوں پھر چپ ہو گئے۔

”جانے اس وقت وہ کہاں ہوگا؟“ ہری شکر نے تاسف سے کہا۔

”کراچی میں ہوگا اور کہاں ہوگا۔“ گوتم نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ سیڑھیاں اتر کر وہ ندی کے کنارے آئے اور پانی  
کو دیکھتے رہے۔ شاید وہ دونوں اکٹھے سوچ رہے تھے کہ ابوالمنصور مال الدین کس

طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور کس طرح ہندوستان سے نکل گیا۔

ندی رواں رہی۔ وہ دونوں جھک کر اس میں اپنا عکس دیکھنے لگے۔ گوتم نے ایک کنکر پانی میں پھینکا اور لہروں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا جس میں ان دونوں کے عکس پھیل سے گئے۔

گھاٹ سے کچھ فاصلے پر کمیونٹی پروجیکٹ کے سنٹر میں روشنی ہو رہی تھی۔ لوک گیت منڈلی نے سالانہ یوتھ فیسٹول لیے کے اپنی پریکٹس شروع کر دی تھی۔ ان کی آوازیں تیرتی ہوئی ان دونوں تک آرہی تھیں۔ دور گاؤں کی چوپال میں ٹونگی ہو رہی تھی۔ آم کے جھنڈ کے باہر آہا اول گایا جا رہا تھا۔ کانگریس کمیٹی کے دفتر میں انیکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دور مسلمانوں کے محلے میں پنڈال لگے تھے اور گیس کے ہنڈے نصب تھے اور شاید میاں دشریف پڑھا جا رہا تھا۔ آگے سول انجنز میں ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی میں یورپین مہمان ڈنر کھا رہے تھے۔

گوتم نے ایک انٹی ہوئی ماڈر پیر کا کر آنکھیں بند کر لیں پھر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ ندی کے کنارے اکیلا کھڑا تھا۔ ہری شکر کسی کسان سے باتیں کرتا کمیونٹی پروجیکٹ سنٹر کی طرف جا چکا تھا۔ بادل اب دریا پر بہت نیچے جھک آئے تھے۔

اس نے اپنے تھک ہوئے پاؤں کو دیکھا، بڑھتی ہوئی تاریکی پر نظر ڈالی لیکن ڈرنے کی کیا بات تھی! وہ زمین کے ساتھ تھا۔ زمین اس کی ماں تھی۔ زمین اس کا ساتھ دے گی۔

اس نے آگے چلنا شروع کیا۔

گھاس کی بھینی خوشبو، پتھروں کی خنکی اور مٹی کی قوت اس نے اپنے تلووں کے نیچے محسوس کی۔ اس نے بازو پھیلا کر ہوا کو چھوا اور آہستہ آہستہ دہرانا شروع کیا: زمین، تیری پہاڑیاں، برفانی پہاڑ اور جنگل مسکرا رہے ہیں۔ میں سالم ہوں۔ مجھے کوئی ختم نہ کر سکا۔

طرح طرح کے پودے اور پھولوں کے ٹہنیاں اس کے راستے میں جھک آئیں۔ پرندے اس کے ہمراہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ساون کی بوندیں کنول کے پتوں پر جل ترنگ بجا رہی تھیں۔

وہ ایک منڈیر پر کھڑا ہو گیا اور بھیگی آنکھوں سے اس نے کھیتوں کو دیکھا۔ بڑھتی جاؤ۔ بڑھتی جاش او جو کی بالیو تاکہ ہمارے گھرے بھر جائیں۔ طوفانوں سے محفوظ رہو۔ جو کی الو ہی بالیو..... سمندر کی طرح اٹھا رہو..... وہ سب امر رہیں جو تمہاری خدمت کرتے ہیں تمہارے کھلیان امٹ رہیں۔

وہ منڈیر پر سے اتر کر پگڈنڈی پر آ گیا اور دریا کے کنارے کنارے سڑک پر چلنے لگا۔ افق پر سیاہ بادل گرج رہے تھے اس کے دل میں طوفانی دریا لہریں مار رہے تھے۔ اس کے دماغ میں سریلے آبشار گیت گارہے تھے۔ مور جھنکار رہے تھے۔ پیچھے چلاتے تھے بھنبورے گونج رہے تھے۔ کدم کے بہت سے پھول ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں میں آن گئے۔

گانے والوں کی آوازیں قریب آتی گئیں۔

منڈی نے گایا۔

بجر آج ہرے رے

کھیتیں میں تاج بھرے رے

جیون آج سہل رے

اچھی دھان اچھی فصل رے

وہ ٹہنیاں ہٹاتا اس طرف بڑھنے لگا جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں:

ڈالوں کے چچ پتیوں کے چچ

موتیں کی لائن کی لڑیاں اگلے ہو.....

اونیرے آئے ہو.....

وہ غور سے سنا کیا جب الفاظ اس کی سمجھ میں آئے اور تبسم اس کے ہونٹوں پر  
بکھر گیا۔

چٹانیں، اوالانش، گلشیر، آندھیاں، طوفان، جھکڑ..... ان سب میں سے  
گزرتا، ہر کی لہروں پر بہتا وہ گوری شکر کی اونچی چوٹی پر چڑھ کر بادلوں میں چھپ  
گیا۔ چوٹی پر وہ دو زانوں بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور خلاء ہے اور اس  
میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان۔ تھکا ہوا، شکست  
خور، ہمت پر امید، انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے۔ وہ مسکرا کر نیچے اترا  
اور اس نے آنکھیں کھولیں۔

جاگنے والوں کا جاگنا مبارک ہو

قانون کا پرچار مبارک ہو

سنگھ میں امن مبارک ہو

ان لوگوں کی ریاضت مبارک ہو



منہیں شانتی میسر آ گئی ہے

شاکینہ منی نے کہا.....

وہ منڈیر پر سے اترا، اس نے لمبا سانس لیا اور آہستہ آہستہ قدم رکھتا بستی کی  
طرف واپس چلا گیا۔

ماری پور، کراچی

اگست ۵۶ء..... دسمبر ۵۷ء

ختم شد..... The End